إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ

حفاظتِ قرآن

منتظر عباس نقوی

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

حفاظتِ قرآن

(قرآن مجید کے نزول اور حفاظت کے موضوع پر ۱۹ تحقیقی مباحث)

سید منتظر عباس نقوی

ناشر

باب العلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، اسلام آباد

First Published in Great Britain by
Islamic Media Productions
3 Edward Court, 2 Southpark Hill Road
South Croydon, Surrey UK CR2 7 DU
March 1999

2nd edition published by
Bab-ul-Ilm Educational Trust
56, I-8/4, Islamabad - Pakistan
April 1999

3rd edition published by
Bab-ul-Ilm Educational Trust
56, I-8/4, Islamabad - Pakistan
March 2006

ACIP Catalogue record for this book is
available from National Library, Pakistan
ISBN 969 - 8463 - 00 - 3

Composed by
Ghulam Haider
Maxima Composing Centre Islamabad

Title Designed by
Adeel Murtaza

Printed and bound by
Maxima Printing Press Rawalpindi
Mobile: 0333 - 5169622

تقسیم کنندگان

پاکستان :

(۱) افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ)

اسلام پورہ، لاہور پوسٹ کوڈ 54000

فون 042-7223686

(۲) Secure Soft

آفس 110، فرسٹ فلور، دوبئی پلازہ، 6th روڈ راولپنڈی

مشرق وسطیٰ:

عزاخانہ حسینی (امام بارگاہ محمد شاہ مرحوم)

P.O. Box 6326، دوبئی (متحدہ عرب امارات)

فون 00971 - 50 - 4559876

تعداد اشاعت سوم : 1000

قیمت (پاکستان) : -/150 روپے

مشرق وسطیٰ : 25 درہم

ترتیب

کلام ناشر	۱۰
یہ کتاب	۱۳
حفاظت قرآن اور علمائے امامیہ	۱۵
حصہ اول : حفاظت و نزولِ قرآن	۲۳
۱۔ حفاظتِ قرآن کا مسئلہ	۲۵
تمہید ...... اللہ کا طریق کار۔	۳۴
۲۔ مقدس کتابوں کی تاریخ ...... غیر سامی مذہبی کتابیں	۳۷
زمانہ قبل از تاریخ کی کتابیں	۴۰
۳۔ انبیائے بنی اسرائیل کی کتابیں	۴۹
توراۃ کی کتابوں کی حقیقت پر ایک نظر ...... انبیائے بنی اسرائیل کی دوسری کتابیں ...... انجیل بھی غیر محفوظ ہے۔	
۴۔ قرآن مجید کی امتیازی خصوصیات	۶۴
قرآن مجید کی زبان ...... قرآن مجید کا محفوظ و موجود ہونا ...... کیا قرآن کا اختلافی نسخہ ممکن ہے ...... قرآن مجید عوامی کتاب ہے ...... حفاظت کا منفرد طریقہ۔	

۵۔ نزولِ قرآن ۷۹

قرآن کا تدریجی نزول..... قرآن کا یکبارگی نزول..... پہلا حل: رمضان آغاز نزول ہے..... دوسرا حل: دو نزول بیت معمور اور قلب رسولؐ پر..... سورہ قدر سے استدلال..... قرآن کے دو مرتبہ نزول کا مقصد۔

۶۔ شب قدر میں نازل ہونے والا قرآن ۹۹

قرآن کے دو غیر معمولی مقامات..... سورہ علق کی پانچ آیات..... دوسرا مقام سورۃ الحمد۔

۷۔ قرآن کے لئے ممکنہ خطرہ ۱۱۳

قرآن کے لئے خطرہ..... قرآن کو خطرہ خود مسلمانوں سے تھا۔

۸۔ حفظ قرآن ۱۲۷

حفظ پر انحصار نہ کرنے کا سبب..... قرأت قرآن متواتر ہے..... قرأت حضورؐ کی ذمہ داری کیوں۔

۹۔ قرآن ایک کتاب ہے ۱۴۳

قرآن ایک کتاب ہے..... کفار کا ایک اعتراض..... کتابِ خدا کی تعلیم فریضۂ نبوت ہے..... حدیث ثقلین اور کتاب کا قرآن ہونا..... حدیث قرطاس اور قرآن کا کتاب ہونا۔

۱۰۔ اسلام کا پرچم ۱۵۷

علم اسلامی معنوی تعبیر..... علم کی تاریخ۔

۱۱۔ چند سوالات کا تجزیہ ۱۷۱

حضرت علیؑ اور جمع قرآن...... قرآن مجید کے قدیم نسخے...... عہد رسالتؐ میں جمع قرآن کا فقہی ثبوت...... سورتوں کی ترتیب پر ایک نظر...... موجودہ ترتیب انسانی کارنامہ نہیں ہوسکتی...... ترتیب قرآن پر خود قرآن کا موقف...... قرآن کی ترتیب نزولی نہ ہونے کا سبب۔

حصہ دوم: ترتیب قرآن

۱۲۔ ترتیب قرآن: آیات کا باہمی ربط 195

قرآن کا منفرد اندازِ بیان...... ایک مثال، سورۃ الحمد کا ربط...... بعض مقامات کا ربط واضح نہیں...... ترتیب آیات میں بندوں کا دخل نہیں...... ترتیب آیات کے متعلق معصومینؑ کا طرزِ عمل...... آیات کی موجودہ ترتیب اور ہماری ذمہ داریاں۔

۱۳۔ ترتیب آیات 221

ترتیب آیات توقیفی ہے...... ترتیب آیات کے متعلق قرآنی ارشاد...... ترتیب آیات میں تقدیم و تاخیر کے اسباب۔ زمانۂ عدت کے متعلق دو آیات...... غیر معمولی ترتیب کی دوسری وجہ، حفاظت قرآن...... واقعہ غدیر کو چھپانے کی کوشش...... سنت رسولؐ سے انکار۔

۱۴۔ آیۂ تطہیر کی جداگانہ حیثیت 247

آیۂ تطہیر کا سیاق و سباق...... خصوصی خطاب سے حاصل ہونے والے نتائج...... کیا ارادۂ تطہیر مستقبل کیلئے ہے؟ سورۂ تحریم اور آیۂ تطہیر...... تاریخ اور آیۂ تطہیر...... اہل بیتؑ میں آنحضرتؐ شامل ہیں...... اندازِ بیان کا فرق...... تذکیر و تانیث کا فرق...... اہل بیتؑ اور بیوت کا فرق۔

۱۵۔ آیۂ تطہیر کا ربط ۲۶۷

آیۂ تطہیر کا جداگانہ نزول...... دوسری وجہ اہل بیت کے معنی کا تعین......
اہل البیت کا گھر...... بیوتکن اور اہل البیت کا معنوی فرق...... آیۂ تطہیر کا
اپنے سیاق وسباق سے ربط۔

۱۶۔ اعلانِ تکمیل دین کا سیاق وسباق ۲۸۹

سورۂ مائدہ میں اعلان تکمیل دین کا سیاق وسباق...... ربط کلام کی جستجو......
تکمیل دین کے فرمان سے مربوط آیت...... اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ
کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ...... فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ۔

۱۷۔ تکمیل دین ۳۰۹

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ...... کیا دین میں جبر ہوسکتا ہے؟......
اعمال میں جبر کی توجیہہ...... دین سے مراد اصول دین ہے...... اصول
اور فروع کا فرق...... کلمہ اور ولایت علیؑ کا اقرار...... ختم نبوت کی غلط
اصطلاح...... پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت جاریہ اور عقیدۂ
امامت۔

۱۔ اتمامِ نعمت اور انتخابِ اسلام ۳۲۷

اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ...... اتمام نعمت کا مفہوم...... نعمت سے کیا مراد
ہے...... سب سے بڑی نعمت...... رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا......
اَلْیَوْمَ ...... لاشعوری ٹھوکر کا دلچسپ نتیجہ۔

۱۹۔ تکمیل دین اور تبلیغ رسالت کا فرمان ۳۴۷
آیۂ بلغ کے پیغام پر ایک نظر۔ حکم تبلیغ خاص حکم کے لئے ہے۔ کافرین کون ہیں؟...... کارِ رسالت سرانجام نہ دینے کا مفہوم۔ اللہ کا حکم جس پر عمل درآمد رکا رہا۔ نازل شدہ حکم کیا تھا۔ ربط کلام کی بحث...... موجودہ ترتیب آیات کی پہلی وجہ، حفاظتِ قرآن۔ بعض محدثین کا ناقابل فہم طرزِ عمل...... دوسری توجیہ، ربط موجود ہے۔ ترتیب الٹنے کا سبب...... تیسری توجیہ، تکمیل دین کی اہمیت کو نمایاں کرنا۔

﴿اشاعتِ اوّل﴾

کلام ناشر

قرآن کریم وہ کتاب عظیم ہے جو رہتی دنیا تک تمام خواص وعوام کے لئے سرچشمہ رشد وہدایت ہے۔ جیسا کہ قرآن نے خود دعویٰ کیا ہے۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت:۲) ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت:۱۸۵)۔ ایک ایسی کتاب جو کسی خاص زمانے کے لئے نہیں، بلکہ قیامت تک بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے آئی ہو تو اس کی حفاظت اور اسے ہر قسم کی تحریف، تقصیر اور تغیر سے محفوظ رکھنے کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ اور یہ ذمہ داری بھی صاحب کتاب پر عائد ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ جو جتنی قدرت وطاقت والا ہوتا ہے، اس کی ملکیت اتنی ہی محفوظ ہوتی ہے۔ جب یہ قرآن حکیم اس کی کتاب ہے جو ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (سورۂ آل عمران، آیت:۱۸۹) ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی کتاب کی حفاظت بھی ویسے ہی کی، اور یہ کہہ کر کی کہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (سورۂ حجر، آیت:۹) ہم نے اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس خدائے قدیر وتوانا نے قرآن مجید، فرقان حمید کے مکمل تحفظ وسلامتی کا جن واضح الفاظ میں دعویٰ کیا ہے، ان کی موجودگی میں قرآن حکیم کا محفوظ ہونا تمام مسلمانوں کا متفقہ موقف تھا۔ لیکن افسوس کہ خوفناک نتائج سے بے نیاز بعض مسلمان ہی جب کچھ اور

مسلمانوں کے متعلق یہ کہنے لگے کہ یہ لوگ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور موجودہ قرآن کو کلامِ الٰہی نہیں سمجھتے، تو قرآن حکیم کے ان نادان دوستوں نے غیر مسلمین کو قرآن مجید کی صداقت پر انگلی اٹھانے کا موقع فراہم کر دیا۔

زیرِ نظر کتاب عمدۃ المتکلمین رئیس الذاکرین، فخر المحققین جناب مولانا منتظر عباس نقوی صاحب آف اسلام آباد کی اس موضوع سے متعلق ان علمی و منطقی مجالس کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ادارہ جعفریہ لندن میں عشرۂ محرم کے دوران بیان فرمائیں۔ چونکہ فرقہ وارانہ تعصبات نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور بدنام کرنے کے لئے اس قدر گرد اڑائی ہے کہ بہت سے اذہان کدورت، شبہات اور ابہامات کا شکار ہو گئے ہیں۔ علامہ منتظر عباس نقوی صاحب کی ان تقاریر نے بے بنیاد غلط فہمیوں کو رفع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا اور انصاف پسند ذہنوں کو موقع فراہم کیا ہے کہ حقیقت حال سے آگاہ بھی ہو سکیں اور مسلک جعفریہ کے بارے میں کی گئی بہت سی بے سرو پا غلط بیانیوں سے اپنے دل و دماغ کو پاک کر سکیں۔ بنا بریں مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ان مجالس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے تا کہ دیگر مؤمنین بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ چنانچہ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار علامہ نقوی صاحب سے کیا۔ ابتداً علامہ صاحب اس خیال سے مجھے ٹالتے رہے کہ شاید اشاعت کتاب کی خواہش وقتی جذبات کا نتیجہ ہے۔ لیکن جب میں نے لندن سے اسلام آباد ٹیلیفون کا تانتا باندھ دیا تو علامہ صاحب راضی ہو گئے اور پھر بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے اپنی ان تقاریر کو لباس تحریر سے آراستہ فرما دیا، جس کے لئے میں ذاتی طور پر ان کا نہایت ممنون ہوں اور خدا سے دعا گو ہوں کہ اس ثوابِ جاریہ کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

الحمد للہ اب یہ کتاب اسلامک میڈیا پروڈکشنز، لندن کے تعاون سے مزین ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ اسلامک میڈیا پروڈکشنز کی تعلیم نماز پر مشتمل ویڈیو "Teach Yourself Namaz" کے بعد یہ دوسری پیشکش بھی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ خود اپنے مطالعہ کے لئے خریدیے، دوستوں کو تحفہ پیش کیجیے۔ سچ ہے۔ اچھی کتاب سے بہتر کوئی دوست نہیں۔

والسلام۔ خیر اندیش

صفدر رضوی

یہ کتاب

اولاً ایک کتاب نہیں ہے، بلکہ تقاریر کا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۹۹۷ء کے ایام محرم میں ادارہ جعفریہ لندن میں کی گئیں۔ تقاریر کے متن کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف اجزاء کو ذیلی عنوانات دے دیئے گئے ہیں یا کہیں کسی کہی ہوئی بات کی سند کی ضرورت محسوس ہوئی تو حوالہ بریکٹ میں درج کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ تحریر، تقریر کی بجائے حقیقتاً تحریر ہوتی تو مواد اور طرزِ بیان، دونوں ہی مختلف ہوتے۔ لیکن اسے اپنی کوتاہیوں پر معذرت کی پیش بندی نہ سمجھا جائے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ہمیشہ بڑی باشعور سماعتوں کا سامنا ہوتا رہا ہے اور سامعین کی اس بلند نظری کا لازمی تقاضا تو یہ تھا کہ میرا اندازِ فکر و گفتگو سطحیت اور عامیانہ پن سے محفوظ رہے اور اس کا اعتراف یہ تھا کہ میں محض رسمأ نہیں، حقیقتاً خود کو ہمہ وقت احتساب اور پھر اصلاح کے عمل سے گزارتا ہوں، سو یہ رویہ آج بھی قائم و دائم ہے اور میں بلا استثناء ہر تبصرے اور تنقید کو، صرف سن لینے کی حد تک نہیں، بلکہ اصلاح احوال کے لئے، خوش آمدید کہوں گا۔

ان تقاریر کا مقصد، عصبیتوں کی پھیلائی ہوئی دھند کو صاف کرنا، جان بوجھ کر پیدا کی گئی، یا لاعلمی سے پیدا ہو جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنا، اور اس حقیقت کو تقویت پہنچانا ہے کہ قرآن حکیم اللہ کی نازل کردہ اور ہر تحریف، ترمیم، اضافے اور کمی سے محفوظ کتاب ہے۔ ان سطور کا کوئی قاری اپنے کسی ذہنی تحفظ، کسی سیاسی مصلحت، کسی روایتی یا

درائتی دلیل کی بنیاد پر ان گزارشات کو تسلیم کرے یا رد کردے، اسے مکمل اختیار ہے۔ لیکن اس بات کی اجازت دینا بہت مشکل ہوگا کہ ان معروضات سے مطابقت نہ رکھنے والی کوئی بات ہمارا عقیدہ کہہ کر بیان کی جائے۔

ہاں ایک اور بات۔ ان تقاریر کے شائع کرنے کے جواز سے لے کر اس کی اشاعت کے اہتمام تک ہر بات کے ذمہ دار، اسلامک میڈیا پروڈکشنز، لندن کے جناب صفدر رضوی ہیں، میں تو ان کے اس اخلاص پر شکر گزار ہوں، آپ اپنے ردِ عمل میں اختیار رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کلامِ ناشر کے عنوان سے اپنی تحریر میں انہوں نے میرے نام کے ساتھ جتنے سابقے اور لاحقے استعمال کیئے ہیں، مولانا سے لے کر علامہ تک، ان کی تمام تر ذمہ داری اُنہیں پر ہے، مجھے نہ متفق سمجھا جائے، نہ جواب دہ۔

اپنی بری بھلی تقاریر پر اپنے سامعین کے ہمت افزاء رویہ سے تو پوری طرح آ گاہ ہوں، لیکن ان تقاریر کی اشاعت کو کس ردِ عمل کا سامنا ہوگا؟ نہیں معلوم۔ اس لئے اس تحریر کے منظرِ عام تک لانے میں جن دوستوں کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے، ان کی کرم فرمائیوں کا کم سے کم اعتراف یہ ہے کہ میں فرداً فرداً ان کا نام نہ لے کر انہیں ہر امکانی شماتت سے محفوظ رکھوں۔ البتہ صفدر رضوی صاحب کا نام اس لئے لے لیا ہے کہ ان میں ماشاء اللہ اس قدر توانائی ہے کہ وہ سب کچھ جھیل لیں گے۔ یا پھر اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور کتابت سے تعلق رکھنے والی تمام تکنیکی الجھنوں سے نبرد آزما ہونے کا کام میرے دونوں بیٹے عظیم عباس اور ظفر عباس سرانجام دیتے رہے ہیں، انہیں اپنی دعاؤں کے ساتھ ساتھ، آپ کی دعاؤں کا بھی حقدار سمجھتا ہوں۔

والسلام

منتظر عباس نقوی

حفاظت قرآن اور علمائے امامیہ

شیخ صدوق محمد بن علی ابن بابویہ قمی

(وفات ۳۸۱ھ، ۹۹۱ء)

قرآن مجید کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اسی کی وحی ہے، اسی کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اسی کا قول ہے۔ یہ اللہ ہی کی کتاب ہے۔ باطل اس میں نہ آگے سے داخل ہوسکتا ہے، نہ پیچھے سے۔ اس کے قصے، سچے، اور اس کا قول فیصل ہے۔ یہ گھڑی ہوئی اور فضول باتوں کا مجموعہ نہیں۔ اللہ تعالی اس کو خلق کرنے والا، اس کو نازل کرنے والا، اس کا محافظ اور اس کے ذریعہ کلام کرنے والا ہے۔

(اعتقادیہ شیخ صدوق مع شرح، باب حادی عشر، صفحہ ۹۲)

شیخ مفید محمد بن محمد ابن نعمان بغدادی

(وفات ۴۱۳ھ، ۱۰۲۳ء)

موجودہ قرآن میں نہ کوئی جملہ ناقص ہے، نہ کسی آیت میں کوئی عیب ہے اور نہ کسی سورہ میں کسی قسم کا نقص ہے۔

(تفسیر آلاء الرحمان، صفحہ ۱۷۔ بحوالہ کتاب المقالات، شیخ مفید)

شریف رضی محمد بن الحسن الموسوی، جامع نہج البلاغہ

(وفات ۴۰۶ھ، ۱۰۱۵ء)

ایک ایسی عظیم کتاب ہے کہ جس میں باطل نہ آگے سے شامل ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ اور یہ حکیم و حمید کی نازل کردہ ہے۔

(حقائق التاویل، صفحہ ۴۰)

شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ علی بن الحسین الموسوی

(وفات ۴۳۶ھ، ۱۰۴۴ء)

بہ تحقیق قرآن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے دور میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح تھا جس طرح کہ اب موجود ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں قرآن کا باقاعدہ درس ہوتا تھا اور پڑھا جاتا تھا۔ اور صحابہؓ کی ایک جماعت کے ذمہ قرآن کے حفظ کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا اور وہ اپنی کارگزاری حضورؐ کے سامنے پیش کرتے اور باقاعدہ حفظ کردہ قرآن سناتے تھے۔ حضرات عبداللہ ابن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہ صحابی تو کئی مرتبہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکمل قرآن حفظ کر کے سنا چکے تھے۔ اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو یہ سب باتیں ثابت کرتی ہیں کہ قرآن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے زمانے میں ترتیب پا چکا تھا۔

(تفسیر صافی از محسن فیض الکاشانی، صفحہ ۳۶)

شیخ الطائفہ طوسی ابوجعفر محمد بن حسن

(وفات ۴۶۰ھ، ۱۰۶۸ء)

قرآن میں کمی یا زیادتی کا الزام لگانا مناسب نہیں۔ کیونکہ زیادتی کے کسی تصور کے صریحاً غلط ہونے پر اجماع ہے، اور کمی کے متعلق عام مسلمانوں کا مذہب ظاہر یہی ہے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور ہم شیعوں کا مذہب بھی یہی ہے اور اس کی تائید علامہ مرتضٰی نے بھی کی ہے، اور یہی بات روایات سے بھی ظاہر ہے۔ اگر کسی سنی یا شیعہ سے ایسی کوئی روایت نقل ہوئی ہے کہ قرآن مجید کی کچھ آیات ضائع ہو چکی ہیں، یا ایک آیت اپنے مقام سے ہٹا کر دوسرے مقام پر رکھ دی گئی ہے، تو ایسی روایات خبر احاد سے ہیں جو یقین کا درجہ نہیں رکھتیں اور ان سے پہلوتہی کرنا اور ان کا چھوڑ دینا ہی درست ہوگا۔

(تفسیر صافی، صفحہ ۳۶، بحوالہ التبیان
از شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسیؒ)

امین الاسلام طبرسی ابو علی فضل بن حسن

(وفات ۵۴۸ھ، ۱۱۵۳ء)

قرآن مجید میں زیادتی کا ہونا تو بالاجماع غلط ہے، اور ہم شیعوں کا عقیدہ فرقہ حشویہ کے بعض اصحاب کی اس رائے کے خلاف ہے کہ قرآن میں تغیر اور نقصان ہوا ہے۔ یعنی ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوئی۔ علم الہدیٰ سید مرتضٰی نے بھی یہی فرمایا ہے۔

(مجمع البیان جلد ۱)

ابن شہر آشوب محمد بن علی بن شہر آشوب مازندرانی

(وفات ۵۸۸ھ،۱۱۹۲ء)

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسی کتاب ملی جو محفوظ ہے۔ اس میں نہ تبدیلی ہوئی، نہ کسی قسم کا تغیر ہوا۔

(مناقب آل ابی طالب، جلد ا، صفحہ ۱۹)

فتح اللہ کاشانی

(وفات ۹۹۷ھ،۱۵۸۹ء)

قرآن مجید کمی اور زیادتی سے قطعاً محفوظ ہے اور یہی عقیدہ ہمارے جمہور کا ہے۔

(تفسیر منہج الصادقین، صفحہ ۵)

شیخ حر عاملی محمد بن حسن

(وفات ۱۱۰۴ھ،۱۶۹۳ء)

جو شخص روایات اور تاریخ کے ابواب میں غور وفکر کرے تو یقیناً جان لے گا کہ قرآن تواتر کے اعلیٰ درجے پر فائز ہے اور ہزاروں صحابہ کرام حافظ اور قاری قرآن تھے۔ نیز یہ قرآن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جمع ہو چکا تھا۔

(الفصول المہمۃ فی تالیف الامۃ، صفحہ ۱۶۶)

شیخ محسن فیض الکاشانی

(وفات ۱۰۱۹ھ، ۱۶۱۰ء)

اگر قرآن مجید میں کمی یا زیادتی تسلیم کر لی جائے تو کئی مسائل پیدا ہوں گے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب قرآن تحریف شدہ یا تبدیل شدہ ہے تو پھر اس کی کسی بھی بات پر اعتماد باقی نہیں رہے گا۔ اگر قرآن میں کمی یا زیادتی مان لیں تو پھر اس کے موجود ہونے کا فائدہ، اس کے احکام پر عمل کرنے کا فائدہ، اس سے تمسک رکھنے کا فائدہ غرض تمام فوائد ختم ہو جائیں گے۔ یہ ارشادِ الٰہی ہے کہ یہ کتاب عزیز ہے، باطل اس میں نہ آگے سے داخل ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ اور یہ بھی ارشادِ خالق ہے کہ ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ ان آیات کے بعد قرآن مجید میں کسی قسم کی تحریف یا تغیر کا کوئی امکان کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ معتبر حدیث ہے کہ مجھ سے منسوب کوئی قول درست سمجھو اگر اسے قرآن کے مطابق پاؤ اور اسے غلط سمجھو جو قرآن کے خلاف ہو، تو اگر قرآن میں تحریف مان لی جائے تو پھر اس ارشاد پر عمل کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔

(تفسیر صافی، صفحات ۳۳ و ۳۴)

قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث

(شہادت ۱۰۱۹ھ، ۱۶۱۰ء)

قرآن اتنا ہی ہے جتنا موجود ہے۔ جو اس سے زیادہ کہے وہ جھوٹا ہے۔ قرآن عہد رسالتؐ میں ترتیب کے ساتھ جمع ہو چکا تھا اور ہزاروں صحابہؓ سے حفظ اور نقل کرتے

تھے۔ جمہور امامیہ عدم تغیر کے قائل ہیں۔ زیادتی کی روایات احاد میں سے ہیں جو ناقابل اعتبار ہیں۔ چند غیر موثق آدمیوں نے انہیں روایت کیا ہے۔ ایسی تمام روایات ناقابل قبول ہیں کیونکہ اکثر احادیث میں ہے کہ روایات کو قرآن کے مقابل رکھو، اگر روایاتِ قرآن کے مطابق نہ ہوں تو انہیں دیوار پر مارو۔ چنانچہ زیادتی یا کمی کی روایات کو جب قرآن کے سامنے لایا گیا تو انہیں فرمان قرآن ﴿اِنَّا لَـهُ لَـحٰفِظُوْنَ ﴾ کے خلاف پایا، جس کی تفسیر میں مفسرین شیعہ نے لکھا ہے کہ اللہ قرآن کی ہر تغیر، تبدیلی، تحریف، اضافہ اور نقصان سے حفاظت کرنے والا ہے۔ اگر قرآن میں تحریف ہو تو یہ کلام بشر ہو گیا، تو پھر اہل زمانہ کے لئے اس کا جواب لانا کیوں ناممکن ہے، کیوں نہیں اس کی مثال بنا لاتے۔

(مصائب النوائب، صفحہ ۱۰۵)

محمد حسین طباطبائی

(وفات ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء)

قرآن مجید اللہ کی حفاظت میں ہے اور ہر کمی و زیادتی سے محفوظ ہے آج نبوت کے صحیح ہونے کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ قرآن ہر تحریف سے محفوظ ہو معصومین علیہم السلام نے روایات کے پرکھنے کا معیار قرآن کو قرار دیا ہے، اگر قرآن خود ہی محرف اور تبدیل شدہ ہو تو روایات کی درست یا غلط ہونے کا پتہ کیسے چلے گا؟

(تفسیر المیزان، صفحات ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱)

ابوالقاسم الخوئی

(وفات ۱۴۱۲ھ، ۱۹۹۲ء)

مسلمانوں میں یہی معروف ہے کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی ہے ...

قرآن جو ہمارے پاس ہے یہ تمام کا تمام وہی قرآن ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور علماء کی بہت بڑی تعداد نے اس کی تصریح کی ہے۔ ان علماء میں رئیس المحدثین جناب شیخ صدوق محمد بن بابویہ ہیں۔ انہوں نے عدم تحریف کو معتقداتِ امامیہ سے شمار کیا ہے اور ان میں شیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر التبیان کے شروع میں اس کی وضاحت فرمائی ہے اور اس بارے میں علم الہدیٰ سید مرتضیٰ کے دلائل نقل کیئے ہیں۔ اور طبرسی نے اپنی تفسیر مجمع البیان کے مقدمہ میں اور شیخ جعفر نے اپنی کتاب کشف الغطاء کے باب بحث القرآن میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ عدم تحریف پر اجماع ہے۔ اور علامہ شبشہانی نے اپنی کتاب عروۃ الوثقیٰ کے باب بحث القرآن میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ جمہور مجتہدین عدم تحریف کے قائل ہیں۔ اور محدث الکاشانی نے اپنی دونوں کتابوں (الوافی اور علم الیقین) میں اور شیخ محمد جواد البلاغی نے اپنی تفسیر آلاالرحمان میں بھی اس کی تائید فرمائی ہے۔ (البیان، صفحہ ۲۰۰)

سید العلماء سید علی نقی النقوی

(وفات ۱۴۰۸ھ، ۱۹۸۸ء)

قرآن مجید وحی سماوی اور کتاب ربانی، منزل من اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعجاز ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان واعتقاد کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جزو اعظم ہے۔

(تحریف قرآن کی حقیقت، صفحہ ۵)

حصہ اوّل

حفاظت ونزولِ قرآن

حفاظتِ قرآن : ۱

حفاظتِ قرآن کا مسئلہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

(سورۃ الحجر، ۱۵، آیت ۹)

سلسلۂ کلام کا سرنامہ قرآنِ مجید کی سورۃ الحجر کی نویں آیت کا یہ اعلان الٰہی ہے کہ ہم ہی نے ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یوں تو قرآن مجید میں لفظ ذکر کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں اس لفظ سے مراد اللہ کی کتاب قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ اب اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ قرآن مجید کے بارے میں دو اہم حقائق کی سند عطا کر رہا ہے۔ اولاً یہ کتاب اللہ ہی نے نازل کی ہے اور ثانیاً یہ کہ اس کی حفاظت بھی اللہ ہی کی ذمہ داری ہے۔

قرآن مجید کے یہ دونوں اعلانات اس قدر صاف ہیں، اتنے واضح اور دوٹوک ہیں کہ بظاہر نہ تو نزول قرآن پر کسی تشریح وتوضیح کی ضرورت ہے نہ حفاظت قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے کسی بحث مباحثے کی گنجائش ہے، لیکن نزول قرآن ہو یا اس کی

حفاظت ان دونوں پہلوؤں کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ پھر ان دونوں امور کے متعلق قرآن کے ماننے والوں کی خود اپنی کہی ہوئی بہت سی باتیں ہیں۔ ان باتوں میں اتنا کچھ اور ایسا کچھ کہا گیا ہے کہ اب سیدھی بات سیدھی نہ رہی اور ضرورت ہے کہ ان دونوں ارشادات پر نئے سرے سے غور کر کے اور اس کے ساتھ ساتھ ارشاد الٰہی کی تکمیل کے تاریخی شواہد جمع کر کے ذہن کی الجھنوں کو دور کیا جائے۔ شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جائے۔ حقائق کو جانا جائے۔ واقعات کو سمجھا جائے اور پھر اپنے اس علم اور اقرار میں یقین پیدا کیا جائے کہ اللہ کا ہر قول سچا ہے۔ اس کا ہر ارشاد شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اور مفکرین، مفسرین اور مؤرخین کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں میں کوئی بات مستند ہے تو وہ اللہ کا ارشاد ہے۔ اور اختلافات اور تضادات کے ماحول میں کوئی قول، قول فیصل ہے تو وہ اللہ کا قول ہے۔

یہاں میری گفتگو کے تمہیدی مرحلے پر یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ میری آئندہ ہونے والی تمام گزارشات کا تعلق صرف اس بات سے ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ قرآن مجید کے نزول اور اس کی حفاظت کے بارے میں ہمارا موقف کیا ہے۔ اس تمام گفتگو کا مقصد نہ کسی کی مخالفت کرنا ہے اور نہ کسی کو غلط ثابت کرنا ہے۔ بلکہ مقصد بیان محض یہ ہے کہ صرف یہ واضح کر دیا جائے کہ قرآن مجید کے متعلق ہمارا موقف، ہمارا نقطۂ نظر کیا ہے۔ میں کسی میدان مناظرہ میں اپنے مخالفین کا جواب نہیں دے رہا۔ البتہ اگر ہمارے عقائد ونظریات کے متعلق کسی کا ناقص علم ہے، یا کوئی ہمارے بارے میں ایسی باتوں کا قائل ہے جو درحقیقت ہمارا نظریہ نہیں ہیں، تو ظاہر ہے کہ میری گفتگو اس کے تصورات کی تردید ہوگی اور اس تردید سے اگر کسی کے جذبات کو ٹھیس لگے گی تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں قصور ہمارا نہیں ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے مکمل تعارف کے بعد، اس کو قیامت تک ہماری دنیوی زندگی گزارنے کا طریقہ قرار دینے اور آخرت میں اسی دین کو ہماری نجات کا ذریعہ کہہ دینے کے بعد، جب سفرِ آخرت اختیار کیا، تو نوعِ انسان کے لئے ہدایت اور راہنمائی کے دو وسیلے قرار دیئے۔ یہ دو وسیلے دو معیار تھے۔ دو اسٹینڈرڈ تھے۔ یہ دو کسوٹیاں تھیں جن پر دنیا کا ہر انسان اپنے عقائد اور اعمال کو پرکھ سکتا تھا۔ یہ دو پیمانے تھے جن پر ہر شخص اپنے اسلام کو ناپ سکتا تھا۔ ان میں سے ایک معیار الفاظ پر مبنی تھا، دوسرا نمونۂ کردار تھا۔ ان میں سے الفاظ پر مشتمل ماڈل کا نام قرآن ہے اور کردار کے ماڈل کا نام اہل بیتؑ ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں ماڈلوں کو ایک دوسرے سے منسلک قرار دے دیا کہ حوض کوثر کی منزل تک نہ قرآن اہل بیتؑ سے الگ ہو سکتا تھا، نہ اہل بیتؑ قرآن سے جدا ہو سکتے تھے۔

لیکن ابتدائے اسلام ہی میں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے ایک جزوِ اعظم سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ ان کے نزدیک اہل بیتؑ تاریخ کے کردار تو تھے۔ احترام و تعظیم کے تو مستحق تھے لیکن اسلام کے جاننے اور سمجھنے کے لئے ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اب اگر اہل بیتؑ کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کو کہاں سے حاصل کیا جائے۔ اس سوال کا جواب قرآن تھا۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کیا کہ ہمارے لئے دین کے ماخذ کے طور پر، صرف قرآن کافی ہے۔

اب صرف قرآن کو کافی قرار دینے کے بعد اس مکتبۂ فکر کے لوگوں کے لئے ضروری ہو گیا کہ قرآن کو خود سے وابستہ کریں۔ یہ ثابت کریں کہ قرآن ان کے پاس ہے اور صرف انہی کے پاس ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے دو طریقے، دو راستے اختیار کئے گئے۔ ایک تو صورت یہ تھی کہ کہا جائے کہ قرآن سے ہم وابستہ ہیں۔ دوسری طرف یہ

دعویٰ بھی کیا جائے کہ ہمارے علاوہ کسی دوسرے کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اپنے آپ کو قرآن سے وابستہ قرار دینے کے لئے قرآن کے حفظ پر زور دیا جانے لگا، تلاوت اور قرأت پر زور دیا گیا۔ ایسی نمازیں ایجاد کی گئیں جن میں پورا قرآن پڑھا جا سکے۔ پھر بات اور آگے بڑھی اور باقاعدہ طور پر ایک مہم شروع کی گئی جس کے تحت یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن پہنچایا تو لیکن ہر آیت کو، ہر سورۃ کو لوگوں کے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے اس طرح چھوڑ گئے کہ آیت ادھر ادھر بکھری ہوئی، ہر سورۃ ترتیب سے آزاد...... اور پھر اللہ نے بعض شخصیتوں کو توفیق دی کہ وہ بڑی محنت سے، بڑی جدوجہد سے اس بکھرے ہوئے قرآن کو حاصل کریں۔ پھر اس کو ترتیب دے کر، اس کی کتابت کرا کے قرآن کو ایک کتاب کی صورت دیں۔

دوسری طرف یہ بتانے یا تأثر دینے کے لئے کہ قرآن کا ہمارے علاوہ کسی اور سے تعلق نہیں، طرح طرح کے مفروضوں کو حقیقت قرار دے کر رائج کیا گیا۔ کبھی یہ کہا گیا کہ قرآن شیعوں کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ شیعہ قرآن حفظ نہیں کر سکتے۔ شیعہ قرآن میں کمی یا زیادتی کے قائل ہیں۔ شیعوں کا قرآن چالیس پاروں پر مشتمل ہے۔ شیعہ موجودہ قرآن پر یقین نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ اصل قرآن تو صرف ان کے امام مہدیؑ کے پاس ہے۔ جب امام مہدیؑ آئیں گے تو وہی چالیس پاروں والا قرآن لے کر آئیں گے۔

نادان دوستی کے اس رویہ نے کبھی اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ قرآن مجید سے متعلق اس قسم کی باتیں کر کے کسی کا قرآن سے تعلق ہونا ثابت ہو سکے یا نہ ہو سکے، ان باتوں سے خود قرآن مجید ایسے اعتراضات کی زد میں آجاتا ہے کہ اس کے بعد اس کتاب سے منسلک رہنا یا نہ رہنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اندازِ فکر کے دونوں رویوں کا مطلب

قرآن کو خود مسلمانوں میں متنازعہ بنا دیتا ہے۔ جب یہ کہا گیا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کو یونہی سینکڑوں لوگوں کے حافظے میں، بغیر کسی ترتیب کے، ادھر ادھر بکھرا ہوا چھوڑ گئے تھے۔ اور بعد میں بعض شخصیتوں نے لوگوں کے حافظے سے، ہڈیوں کے ٹکڑوں سے، کھال کے پارچوں سے، درخت کی چھال سے، کاغذ کے صفحوں سے، دو دو گواہیاں لے کر جمع کیا۔ اسے ترتیب دی تب جا کر یہ موجودہ قرآن وجود میں آیا۔ تو اس قسم کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ بالکل نہ سوچا گیا کہ اس طرح جو کتاب تیار ہوئی وہ تمام کی تمام ان ذریعوں سے حاصل ہوئی جو غیر معصوم تھے۔ جن سے غلطی کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب یہ کیسے ثابت کیا جائے کہ اس طرح قرآن کو جمع کرنے والوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ کہیں کوئی لفظ کوئی آیت غلط طور پر بیان نہیں کی۔ . اور اگر ان کا غلطی سے پاک ہونا ثابت نہ ہو سکے تو قرآن مشکوک ہو جائے گا۔ یہ امکان موجود رہے گا کہ اپنی تمام تر دیانت اور خلوص کے باوجود ہو سکتا ہے کہ غلطی ہوگئی ہو اور جب تک غلطی کا امکان رہے گا قرآن مجید مشکوک رہے گا۔ ادھر قرآن صاف لفظوں میں کہہ رہا ہے کہ ﴿لا رَیْبَ فِیْہِ﴾ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب قرآن کے دعوے کو غلط کہیے یا پھر غیر معصوم کے ہاتھوں سے قرآن کے جمع کیے جانے والی کہانی سے دستبردار ہو جائیے۔ ایک دوسری صورت ممکن تھی کہ آپ قرآن کو جمع کرنے والوں کی عصمت کے قائل ہو جائیے۔ لیکن ملت اسلامیہ کے کسی گروہ نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جن کے سر جمع قرآن کا سہرا باندھا جاتا ہے وہ معصوم تھے۔ تو اب غیروں کو قرآن کے محفوظ ہونے کا قائل کرنا تو بہت دور کی بات ہے اپنے بھی مطمئن نہیں ہو سکتے کہ غیر معصوم لوگوں کا جمع کردہ قرآن خود محفوظ ہے۔

اور پھر جمع قرآن کی ان کہانیوں کی موجودگی میں یہ کیسے ثابت کیا جائے کہ موجودہ قرآن پورا قرآن ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت کرنا ممکن نہیں رہتا

کہ موجودہ قرآن تمام تر اصل قرآن ہے...... آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کسی کی تحریر یا تقریر کے محفوظ کرنے کے لاتعداد ذرائع ہیں، اس زمانے میں صورتحال یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے فوراً بعد یعنی ابتدائی دس پندرہ سال میں یہ کوشش ہوئی کہ علامہ اقبالؒ کا وہ کلام جو ان کی ابتدائی زندگی میں کسی کتاب میں جمع نہیں ہو سکا اسے جمع کر لیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں تین کتابیں باقیاتِ اقبال، سرودِ رفتہ اور رخت سفر ترتیب دی گئیں۔ یہ کتابیں بڑی محنت، بڑی تلاش، بڑی کوشش سے لکھی گئیں۔ لیکن ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کتاب کا لکھا جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ پہلی کتاب میں اقبالؒ کا سارا کلام جمع نہیں ہو سکا تھا۔ اچھا! تین ضخیم کتابوں کے بعد یہ سمجھا جائے کہ اب اقبالؒ کا کوئی کلام باقی نہیں رہا جو شائع نہ ہو گیا ہو۔ تو چلیے میں عرض کر دیتا ہوں۔ دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء کا مزار ہے۔ ان کی پائنتی کی طرف ایک پرانا درخت ہے۔ اس درخت پر ایک ٹین کا بورڈ آویزاں ہے۔ اس بورڈ پر علامہ اقبالؒ کی ایک نظم درج ہے جو خواجہ حسن نظامی کی مدح میں ہے۔ یہ نظم نہ باقیاتِ اقبالؒ میں ہے، نہ سرود رفتہ میں ہے اور نہ رخت سفر میں۔ گویا کلام اقبالؒ کی باقیات پر مشتمل تین کتابیں لکھی جانے کے باوجود اب بھی کچھ نہ کچھ کلام ایسا ہے جو شائع نہ ہو سکا۔

دوسری طرف علامہ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال کا کہنا ہے کہ میرے والد کی طرف نسبت دے کر جو کلام ان کے بعد شائع کیا گیا ہے اس میں بہت سے اشعار علامہ کے نہیں ہیں ...... آج بھی بہت سے اشعار ہیں جو علامہ کی طرف نسبت دیئے جاتے ہیں، لیکن وہ کلام اقبالؒ نہیں ہے۔ ایک مشہور شعر ہے۔

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

یہ ثابت شدہ بات ہے کہ یہ شعر علامہ اقبالؒ کا نہیں بلکہ سیالکوٹ کی تحصیل شکر گڑھ کے ایک وکیل صادق حسین شاہ کا ہے.....اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

اسلام کے دامن میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں
اک ضرب ید اللہی ؓ، ایک سجدۂ شبیریؒ

یہ شعر بھی علامہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت کسی اور شاعر[1] کا ہے۔

تو جب آج کے دور میں، ترقی اور ذرائع ابلاغ کے فروغ کے زمانے میں ایک نامور شاعر کا کلام جمع کرنے والے تین تین مجموعے چھاپ کر جو کچھ جمع کر سکے وہ نہ اقبالؒ کا سارا کلام ہے اور نہ وہ مکمل طور پر اقبالؒ کا کلام ہے۔تو خود فیصلہ کیجیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے بعد، اور وہ بھی بیس بائیس سال بعد قرآن لوگوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کیا جائے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح نازل ہونے والا پورا کلام جمع ہو گیا۔ یا جو کچھ جمع ہوا وہ اللہ ہی کا کلام ہے۔ اس طریقہ جمع قرآن کو تسلیم کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ یہ مانا جائے کہ ممکن ہے کچھ قرآن ایسا رہ گیا ہو جو شامل کتاب نہ ہوا ہو اور کچھ ایسے جملے شامل کئے گئے ہوں جو حقیقتاً قرآن نہ ہوں۔اور جواب دوسری لائن اختیار کی گئی وہ پہلی صورت سے زیادہ ہولناک تھی۔صرف یہ کہنے کے لئے کہ قرآن سے ہم وابستہ ہیں۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ یہ کہا جائے کہ ہمارے علاوہ دوسرے تو قرآن کو مانتے ہی نہیں۔ یہ شیعہ تو موجودہ قرآن پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ یہ تو قرآن کو تحریف شدہ سمجھتے ہیں۔ یہ تو اسے نامکمل مانتے ہیں۔اب جہاں جھوٹ ارادتاً اور

---

[1] بعد کی معلومات کے مطابق یہ شعر وقار انبالوی کا ہے اور لاہور سے کچھ عرصہ تک جاری رہنے والے ایک ہفت روزہ ''ضربِ ید اللہی'' کی پیشانی پر انبالوی صاحب کے نام کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔

جان بوجھ کر بولا جائے وہاں تلاش حقیقت کون کرے۔ چنانچہ چودہ سو سال سے یہی راگ الاپا جارہا ہے کہ شیعہ قرآن کو نہیں مانتے۔ اب اس الزام کی حقیقت پر گفتگو بعد میں ہوگی لیکن اس الزام کا نتیجہ سن لیجیے کہ جب غیر مسلموں سے کہا گیا کہ تمہاری مقدس کتابیں تحریف شدہ ہیں۔ اپنی اصل صورت میں باقی نہیں رہی ہیں اور اس سلسلے میں یہودی اور عیسائی محققین کے حوالے دیئے گئے تو انہوں نے فوراً جواب دیا ہم پر اعتراض بعد میں کرنا تمہارے یہاں تو ایک پورا فرقہ ۔ ایک بہت بڑا فرقہ یہ کہتا ہے کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اب جب خود اپنا کہا ہوا سامنے آیا تو اس کا جواب کیا دیتے۔ بیچارے شیعوں کے خلاف لب و لہجے کی تلخی اور بڑھ گئی اور یہ کہا جانے لگا کہ یہ شیعہ تو ہمیشہ اسلام کے دشمن رہے ہیں۔ آج ان کی وجہ سے ہمیں اغیار کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑی لطف یہ کہ اس سارے جھگڑے میں کسی نے غریب شیعوں سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارانہ کی کہ آخر تمہارا عقیدہ کیا ہے۔ تم قرآن حکیم کو کیا مانتے ہو۔

مجھے پوری طرح احساس ہے کہ گزشتہ چودہ سو سال سے ہم اپنے متعلق کہی جانے والی بہت سی غلط باتوں کی تردید کرتے رہے ہیں۔ وضاحتیں کرتے رہے ہیں۔ اپنا عقیدہ اور عمل بتاتے رہے ہیں لیکن دلوں کی سرزمین پر نفرتوں کی آبیاری سے جہالت کا جو پوداصدیوں میں کاشت کیا گیا ہو اس کا قدرتی پھل یہی ہے کہ ہماری کہی ہوئی ہر بات سنی ان سنی کر دی جائے۔ اور ہمارے متعلق کہی ہوئی بے سروپا بات کو علم قرار دے کر عوام الناس کو ہم سے اور حقیقت سے دور رکھا جائے۔ چنانچہ اب تک کی تمام وضاحتیں رائیگاں گئیں۔ بظاہر آئندہ بھی ہماری ہر بات صدا بہ صحرا ہوگی لیکن اسے اتمام حجت سمجھیے یا فریضہ حق گوئی کی ادائیگی سمجھیے۔ یا نقار خانے میں طوطی کی آواز سمجھیے جو صرف اس امید پر بلند ہوتی ہے کہ شاید کسی کی سماعت تک پہنچ جائے ۔ میں نے یہ سلسلہ گفتگو اس لئے

شروع کیا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق ہمارا نقطہ نظر واضح ہو جائے۔ ایک مرتبہ پھر ہم اپنے موقف کا اعادہ کر دیں۔ ایک مرتبہ پھر بتا دیں کہ قرآن مجید کے نزول اور حفاظت کے سلسلے میں ہمارا عقیدہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک حقائق کیا ہیں۔

البتہ کچھ کہنے سے پہلے ایک معذرت ضروری ہے۔ مجھے آپ کی خدمت میں بہت کچھ عرض کرنا ہے۔ لیکن میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ چنانچہ تیز رفتاری کے سوا کوئی اور صورت نہیں کہ بیان کو مکمل کیا جا سکے۔ اور جب کوئی تیز چلے تو ہانپنے لگتا ہے۔ سانس چڑھ جاتی ہے اور جب پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی جائے تو بعض اوقات الفاظ واضح نہیں ہوتے۔ جملے الجھ جاتے ہیں اور مفہوم غیر واضح ہو جاتا ہے۔ ایسے کسی مرحلے پر اگر میری کہی ہوئی بات میرے سامعین کے لئے کسی الجھن کا باعث بن جائے تو میں ہر وقت حاضر ہوں۔ اگر ضرورت محسوس کریں تو ضرور سوال فرمائیں۔ اگر سلسلۂ گفتگو میں ممکن ہوا تو جواب تقریر کے دوران دوں گا۔ ورنہ انفرادی طور پر بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے اور مجھ سے وضاحت کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا عقیدہ

اور اب مختصراً اپنے عقیدے کا اعلان کر دوں جو قرآن کے متعلق ہماری تمام تر فکر کا محور ہے۔ ہم قرآن مجید کے متعلق بالکل وہی عقیدہ رکھتے ہیں جس کا واضح اعلان قرآن مجید کی زیر بحث آیت میں کیا گیا ہے۔ کہ ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں دو باتوں کو ایک ہی جملے میں جمع کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں باتیں ہم پلہ ہیں۔ یعنی جن معنوں میں اللہ نے قرآن کو نازل کیا ہے ان ہی معنوں میں اللہ قرآن کا محافظ ہے۔ اللہ کی طرف سے قرآن کے نازل ہونے کا مطلب یہ ہے

کہ قرآن کی ہر سورۃ، ہر سورۃ کی ہر آیت، ہر آیت کا ہر لفظ اللہ کا کلام ہے۔ اس میں کسی بشر کا کوئی لفظ شامل نہیں ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ یہ کہے گا کہ اس کی حفاظت بھی ہمارا کام ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ قرآن کی حفاظت کی جتنی صورتیں ہیں، خواہ اس کا جمع کرنا ہو، خواہ اس کو ترتیب دینا ہو، خواہ مختلف سورتوں میں تقسیم کرنا ہو، یہ سب اللہ ہی کا کام ہے۔ اس میں کسی بشر کا دخل نہیں ہے۔ جس طرح نزول قرآن کا اللہ کی طرف سے ہونے کا مطلب یہ کہ اس کے نزول میں کسی بشر کو جزوی یا کلی طور پر شریک نہیں قرار دیا جا سکتا اسی طرح اس کی حفاظت کا اللہ کی طرف سے ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی حفاظت میں بھی کسی خود ساختہ محافظ کو حصہ دار نہیں بنایا جا سکتا اور اب اپنے عقیدے کو دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دوں کہ اللہ کے اس اعلان کے بعد اگر کوئی دعویٰ کرے کہ قرآن کا کچھ حصہ یا کوئی لفظ کسی انسان کی طرف سے ہے یا اس کی کوئی آیت کسی بشر کا کلام ہے تو ایسا عقیدہ رکھنے والا اسلام سے خارج ہوگا۔ اب اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ قرآن کو جزوی یا کلی طور پر کسی انسان نے محفوظ کیا ہے۔ یا کوئی یہ کہے کہ اگر فلاں شخص قرآن کی حفاظت کا انتظام نہ کرتا تو قرآن محفوظ نہ رہتا۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا بھی اپنی جگہ اسلام سے باہر تلاش کرے۔ دامن اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

اللہ کا طریق کار

اسی مرحلے پر یہ بھی عرض کر دوں کہ جب اللہ کسی کام کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ خود وہ کام سرانجام دیتا ہے۔ یقیناً اس کے تمام کام اس کے کارکن کرتے ہیں۔ لیکن جس کام کو وہ اپنا کام قرار دے اسے ایسے ذریعے سے لیتا ہے، جس کی طرف سے کسی غلطی، کسی کوتاہی کا امکان تک نہ ہو۔ اس نے کہا موت وہی

دیتا ہے۔ زندگی وہی دیتا ہے۔ تو جب موت آتی ہے تو اللہ خود بندے کی روح قبض نہیں کرتا بلکہ یہ کام ملک الموت سے لیتا ہے۔ اور ملک الموت کبھی غلطی نہیں کرتا۔ نہ اس کے جان لینے کے عمل میں کبھی بھول چوک ہوتی ہے نہ کبھی کوئی کوتاہی ہوتی ہے۔ گویا اللہ اپنے خاص کام ان ہستیوں ہی سے لیتا ہے جو معصوم ہوتی ہیں۔ اب اگر اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے تو جو فرشتہ قرآن لے کر نازل ہوا ہے وہ معصوم ہوگا۔ جس ذات پر قرآن نازل ہوا ہے وہ نہ سماعت میں غلطی کرے گی، نہ اس کے بیان میں کمی بیشی ہوگی۔ یعنی لانے والا بھی معصوم، جس ذات پر قرآن نازل ہوا ہے وہ ذات بھی معصوم اب اگر اللہ نے حفاظت قرآن کا ذمہ خود لیا ہے تو قرآن ان ہستیوں کے ذریعے ہی محفوظ کیا جائے گا جو معصوم ہوں اب نزول کا عمل ایک مرتبہ ہونا تھا اس لئے معصوم ہستی ایک ہی ہے جس پر قرآن نازل ہوا۔ لیکن اسے قیامت تک محفوظ رہنا تھا اس لئے جب تک قرآن ہے اس کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اس وقت تک اس کے لئے معصوم محافظ کا وجود رہے گا۔ چنانچہ جس پر قرآن نازل ہوا وہ ایک ذات تھی اور جنہیں قرآن کی حفاظت کرنی تھی وہ بارہ نفوس تھے اور دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ قرآن جانتا تھا کہ غیر معصوم کے ہاتھ لگ گیا تو اس کا سلامت رہنا ممکن نہیں ادھر اہل بیتؑ آگاہ تھے کہ ادھر خطا کاروں کا سایہ قرآن پر پڑا، ادھر قرآن خطروں میں گھر جائے گا۔ چنانچہ یہ اہتمام کر دیا گیا کہ نہ قرآن محافظوں سے الگ ہوگا نہ محافظ قرآن سے جدا ہوں گے کہ حتیٰ کہ دونوں ساتھ ساتھ حوض کوثر پر پہنچ جائیں گے۔

اور یہ حفاظت قرآن ہی کا فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لئے حسین علیہ السلام کو مدینہ چھوڑنا پڑا۔ ایک طرف بنی امیہ کے نئے حکمران کی دیرینہ خواہش تھی کہ قرآن اس

کے دست اقتدار میں کھلونا بن جائے، خواہ اس کے لئے اسے انسانیت کی تمام قدروں کو پامال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ دوسری طرف محافظ قرآن کو قرآن کی حفاظت کرنی تھی، خواہ اس کے لئے اسے اپنی جان کے ساتھ ساتھ اپنے جگر گوشوں، اپنے عزیزوں، اپنے دوستوں کی جانیں بھی قربان کرنی پڑیں۔ ادھر یزید نے اپنی افواج قاہرہ دیکھیں، اپنے اسلحہ خانے پر نظر دوڑائی، اپنے ظلم اور فریب کے اصولوں پر اعتماد کیا، اپنے سامان رسد کے ذخیرے دیکھے اور یہ سمجھ بیٹھا کہ اب اس کے لئے قرآن پر قبضہ کر لینا ممکن ہو گیا ہے۔ ادھر حسین علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کے کردار دیکھے، ان کے عزائم دیکھے، ان کے جوہر صبر کو دیکھا، ان کی حق پرستی کو دیکھا اور یہ تاریخ ساز فیصلہ کر لیا کہ اس بے مثال فوج سے میں قرآن کی حفاظت کا ایسا انتظام کر دوں کہ صرف آج کا یزید ہی نہیں، قیامت تک آنے والا ہر یزید قرآن پر تسلط پانے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظت قرآن : ۲

مقدس کتابوں کی تاریخ

قرآنِ مجید کو ہی ہدایت کے لئے کافی قرار دینے والوں نے خود کو کتاب الٰہی کا تنہا اور بلا شرکت غیرے وارث قرار دینے کے لئے دو بے بنیاد اور غلط باتیں کیں۔ ایک تو یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کو منتشر اور غیر ترتیب شدہ حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ بعد میں کچھ نیک دل لیکن غیر معصوم مسلمانوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کو جمع بھی کیا اور ترتیب بھی دیا۔ اور دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس قرآن کو مکمل بھی نہیں مانتا اور تحریف شدہ بھی سمجھتا ہے ان دونوں باتوں کا دعویٰ کرنے والے، اپنے ان دعوؤں سے، کتابِ خدا کے وارث ثابت ہو سکے ہوں یا نہیں، قرآن کے جمع کرنے کا اعزاز بخش دیئے جانے پر، ان کی پسندیدہ شخصیتوں کی فضیلت اور شان میں چار چاند لگے ہوں یا نہیں، اور مخالف مسلک والوں کو قرآن حکیم کے بارے میں مفروضہ عقیدہ تحریف کا الزام لگا کر کافر قرار دیا جا سکا ہو یا نہیں ان مقاصد کا جو بھی انجام ہوا ہو سے تو الگ رکھیے لیکن ان باتوں کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ اللہ کی لا ریب فیہ کتاب شکوک و شبہات اور اعتراضات کی زد میں آ گئی اور وہ کتاب کہ جس کی حفاظت کا واضح اعلان خود اللہ نے کیا

تھا، اس پر اسلام کے دشمن طرح طرح کی حرف گیریاں کرنے لگے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قرآن مجید پر لگنے والے الزامات کو دور کرنے کے لئے میدان عمل میں آئیں اور محض مخالفت برائے مخالفت میں اڑائی جانے والی گرد کو ہٹا کر فضا اتنی صاف کر دیں کہ کم از کم انصاف پسند لوگ حقیقت حال کو جان سکیں۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ایک نظریہ دیکھ لیں کہ قرآن سے پہلے نازل ہونے والی الہامی کتابیں کس حال میں ہیں اور ان کتابوں کے محفوظ یا غیر محفوظ ہونے کی کیا کیفیت ہے۔

یہاں عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے میں جو کتابیں زیر بحث آئیں گی ان کے متعلق ہمارا موقف صرف یہ ہے کہ ان کتابوں کو ان کے ماننے والے مقدس یا کسی بالاتر ہستی کی طرف سے نازل شدہ مانتے ہیں۔ اس تاریخی جائزے میں کوئی یہ نہ فرض کر لے کہ جن کتابوں کا تذکرہ کیا جائے گا ان کو ہم بھی اللہ کی طرف سے نازل شدہ مانتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر وہ سارا مذہبی ذخیرہ ہے جس کو دنیا کے اہل مذہب اپنے اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اس بات سے ہمیں کم از کم اس وقت کوئی سروکار نہیں کہ وہ حقیقتاً کلامِ الٰہی ہے یا نہیں۔

اللہ کی طرف سے بندوں کی ہدایت کا سلسلہ ہر دور میں رہا اور ہر قوم میں اللہ کی طرف سے انسان کو صراطِ مستقیم دکھانے والے اور اسے باطل سے منہ موڑ کر حق کی طرف بلانے والے آتے رہے۔ اتنی بڑی دنیا میں آدم علیہ السلام سے خاتم صلی اللہ علیہ وسلم تک کتنے نبی اور پیغمبر آئے اس سلسلے میں متعدد روایات ہیں۔ انبیاء کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار سے تین لاکھ تیس ہزار تک بتائی جاتی ہے لیکن مشہور عدد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تعداد کی تفصیل ایک طرف، اتنے انبیاء کے ناموں کی فہرست بھی دستیاب نہیں۔ قرآن مجید نے جن شخصیتوں کا نام لے کر بطور نبی ذکر کیا ہے۔ ان کی تعداد 26 ہے۔ ان

میں سے آدم، نوح، صالح، ھود، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحاق علیہم السلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دس انبیاء وہ ہیں، جو بنی اسرائیل سے باہر ہیں۔ باقی انبیاء کا تعلق حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد سے ہے چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ اس لئے ان کی اولاد بنی اسرائیل کہی جاتی ہے۔ ان 26 کے علاوہ قرآن مجید نے کچھ اور انبیاء کا ذکر نام کے بغیر کیا ہے۔ جیسے یعقوبؑ کے 12 اسباط بھی نبی تھے، یا وہ نبی جنہوں نے طالوت کو سردار بنایا تھا، یا وہ نبی جن کے ایک بستی میں آنے کا تذکرہ سورۂ یٰسین میں ہوا ہے۔ ان تمام انبیاء میں سے سورۃ شوریٰ اور سورۃ مائدہ کے ارشادات کی روشنی میں پانچ نبی حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور جناب خاتم النبیین علیہم السلام۔ انبیائے اولی العزم کہلاتے ہیں۔ یہ پانچ انبیاء صاحبانِ شریعت نبی ہیں۔ باقی انبیاء ان پانچ کی شریعتوں ہی کی تبلیغ اور ترویج کا فریضہ سرانجام دیتے رہے ہیں۔

انبیاء کی پوری جماعت خواہ ہمیں ان کا نام معلوم ہو یا نہ ہو، تمام کے تمام اللہ ہی کی طرف سے ہدایت پاتے تھے۔ اور اللہ ہی کا پیغام اس کے بندوں کو پہنچاتے تھے لیکن اس پوری جماعت کا ہر فرد صاحب کتاب نہیں تھا۔ مسند امام احمد ابن حنبل کی ایک روایت کے مطابق صاحب کتاب انبیاء کی تعداد 315 ہے۔ ہمارے ہاں کی بعض روایات میں ان کی تعداد 313 بیان ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اہم اور قابل توجہ اختلاف نہیں ہے اس لئے کہ ہمارے مطالعے کا موضوع ان کی کتابوں کا محفوظ ہونا یا محفوظ نہ ہونا ہے اور اس حوالے سے جو کتابیں آج موجود ہی نہیں ہیں۔ ان کا محفوظ نہ ہونا خود بخود ثابت ہوگیا۔ اب تو صرف ان ہی کی بات ہوسکتی ہے جو کتابیں کسی نہ کسی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔

زمانہ قبل از تاریخ کی کتابیں

مثلاً بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت آدم ؑ پر دس صحیفے نازل ہوئے تھے لیکن جب ہمیں یہی معلوم نہیں کہ حضرت آدم ؑ کے صحیفوں کی زبان کیا تھی تو یہ معلوم کرنا بالکل ناممکن ہے کہ ان میں لکھا کیا تھا۔ یہی حال حضرت آدم ؑ کے بیٹے حضرت شیث ؑ کا ہے۔ ان کو بھی صاحب کتاب نبی کہا گیا ہے، لیکن نہ ان کی کتاب کا پتہ چلتا ہے نہ اس میں کہی گئی باتوں کا کوئی علم ہے۔

حضرت شیث ؑ کے جو بیٹے منصب نبوت پر فائز ہوئے وہ حضرت ادریس ؑ کہلاتے ہیں۔ بائبل میں ان کا نام اخنوق بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی صاحب کتاب ہیں۔ ان کی کتاب سے بھی دنیا اس صدی کے نصف تک بالکل ناواقف تھی۔ سنہ 1947ء میں ایک عجیب اتفاق ہوا۔ فلسطین کے کچھ لڑکے جو تامیرہ قبیلے کے چرواہے تھے۔ اپنی بھیڑیں لیے بحیرہ مردار (Dead Sea) کے ساتھ ساتھ قمران کی پہاڑیوں سے گزر رہے تھے۔ اتفاق سے ایک چرواہے کی کچھ بھیڑیں ادھر ادھر ہوگئیں۔ چرواہا تلاش میں نکلا۔ یہاں چونے کے پتھروں کی چٹانوں میں چھوٹے بڑے بہت سے غار تھے۔ لڑکا ایک غار میں بھیڑوں کے لئے پتھر پھینک رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ گویا اس کا پتھر کسی کھوکھلے برتن سے ٹکرایا ہے۔ چرواہے نے ہمت کی اور غار میں اترا تو اسے مٹی کے کچھ بڑے بڑے مرتبان ملے۔ ان میں طومار یا (Scrolls) کی شکل میں بہت سی تحریریں بندھیں۔ یہ تحریریں باہر آئیں تو شام اور اسرائیل کے مخطوطوں کے شائقین ٹوٹ پڑے۔ چرواہوں سے حاصل شدہ تحریروں پر تحقیق شروع ہوئی تو ماہرین کی دلچسپی بڑھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں مزید تلاش شروع ہوئی۔ چنانچہ وادیٔ قمران میں

مربت اور خربت کا چپہ چپہ چھان مارا گیا۔ اور اس طرح بہت بڑا تحریری ذخیرہ ہاتھ لگا جو Dead Sea Scrolls کے نام سے پکارا گیا۔ ان میں کچھ مخطوطے Magnus Press یروشلم سے 1956ء میں شائع بھی کر دیئے گئے۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ سنہ 100ء میں جب رومن فوجوں نے یروشلم میں تباہی مچائی تھی تو ایسی نس (Essenes) فرقے کے یہودی راہبوں نے مذہبی لٹریچر کو تباہی سے بچانے کے لئے ان غاروں میں چھپا دیا تھا۔ ان تحریروں میں جہاں عہد نامہ عتیق (Old Testament) کا قدیم ترین نسخہ دریافت ہوا ہے۔ وہاں ایک تحریر کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ حضرت ادریس علیہ السلام یا اخنوق نبی کے صحیفے کا حصہ ہے۔ اب یہ خیال کس حد تک درست ہے۔ اس کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اگر یہ خیال صحیح ہے تو یہ ایک قدیم ترین مذہبی کتاب ہے جو بنی نوع انسان نے دریافت کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اولاً اس کا حضرت ادریس علیہ السلام سے نسبت دیا جانا درست ہے یا نہیں؟ یہی یقینی نہیں۔ اور پھر جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ حضرت ادریس علیہ السلام سے چل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے 100 سال بعد تک کے یہودی راہبوں تک کیسے پہنچی۔ اس کے محفوظ رہنے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر ظاہر ہے کہ اس طرح جو کچھ ہاتھ آیا ہے وہ ایک جزو ہے، پوری کتاب نہیں۔ چنانچہ حضرت ادریس علیہ السلام کی کتاب کا محفوظ نہ رہنا تو اس طرح بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد جو صاحب کتاب نبی ہیں وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ ان کا صاحب کتاب ہونا قرآن میں سورۃ شوریٰ کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ عراق میں ایک بہت چھوٹی سی جماعت ہے جو سعدیات کہلاتی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی امت ہیں۔ ان کے پاس چند سطروں پر مشتمل ایک تحریر

ہے جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی کتاب کا حصہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس حضرت نوح علیہ السلام کی پوری کتاب ہوا کرتی تھی لیکن جیسے جیسے امت میں گناہ بڑھتے گئے سزا کے طور پر اللہ اپنا کلام واپس لیتا گیا حتیٰ کہ اب صرف یہ چند سطریں باقی رہ گئیں ہیں۔ ان سطروں میں اخلاقیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اب جس کتاب کے متعلق اس کے ماننے والے کہتے ہوں کہ یہ محفوظ نہیں تو اس کو غیر محفوظ ثابت کرنے کے لئے کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کے طویل درمیانی وقفے میں ہمیں انبیاء میں سے کسی کے صاحب کتاب ہونے کا علم نہیں۔ البتہ قرآن مجید نے دو مقامات پر ﴿صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى﴾ کہہ کر انہیں صاحب کتاب قرار دیا ہے۔ ہمارے پاس اس سند کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ البتہ یہودی لٹریچر میں چند سطریں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کتاب سے منسوب ہیں۔ اب یہ سطریں ان کی پوری کتاب کے محفوظ ہونے کی سند نہیں بن سکتیں۔

غیر سامی مذہبی کتابیں

انبیاء بنی اسرائیل سے پہلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے قریب دنیا کے کچھ اور حصوں میں بھی مذہبی لٹریچر وجود میں آ رہا تھا۔ یہ لٹریچر ان معنوں میں تو الہامی نہیں ہے جن معنوں میں توریت یا قرآن ہے لیکن ان کی نسبت اگر اللہ کی طرف نہیں ہے تب بھی ان کو کسی انسان سے بالاتر وجود کی طرف سے عطا کردہ سمجھا جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کی عظمت اور اہمیت کو سمجھنے کے لئے ہر اس کتاب کو زیر بحث لانا چاہیے جو انسان کی فکر و دانش سے بالاتر، کسی عظیم تر ذات کی طرف سے، انسان کی

راہنمائی اور ہدایت کی دعویدار ہو۔ چنانچہ اس لٹریچر پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں قدیم ترین کتاب، پارسیوں کے رہنماء زرتشت کی کتاب اوستا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ زرتشت نبی ہیں یا نہیں۔ (بعض علماء نے، جن میں آیت اللہ خامنہ ای شامل ہیں، پارسیوں کو فقہی معاملات میں اہل کتاب کے زمرے میں شامل کیا ہے۔) قرآن مجید نے قوم مجوس کا تذکرہ کیا ہے اور ایک مقام پر یہ بھی کہا ہے کہ یہ گمراہ ہو گئے (سورۂ حج، ۲۲ آیت ۱۷) اس ارشاد کی بنیاد پر اگر زرتشت کو نبی قیاس کر لیا جائے تو غالباً کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔

خیر زرتشت کی کتاب کا نام اوستا ہے جو قدیم پہلوی یا ژند زبان میں تھی۔ سروش ایزدی یعنی فرشتہ الٰہی نے اپنے احکام مزدا یعنی خدا کی طرف سے اپنے بندہ خاص زرتشت اسپنتمان تک پہنچائے تھے۔ روایت کے مطابق اوستا ہخامنشی بادشاہوں کے زمانے تک 21 پاروں پر مشتمل تھی اور یہ 21 پارے چمڑے کے بارہ ہزار صفحوں پر سنہری حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ 331 قبل مسیح میں جب سکندر نے ایران پر حملہ کیا تو ملک اور عوام کے ساتھ ساتھ اوستا کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ پھر ایک طویل عرصے کے بعد ساسانی بادشاہوں نے اوستا کو دوبارہ جمع کیا تو کل 348 فصلیں یا باب دستیاب ہو سکے۔ ان ہی کو 21 پاروں میں تقسیم کر کے سابقہ عدد برقرار رکھا گیا۔ بعد میں عرب اور منگولوں کے حملے ہوتے رہے۔ ان حملہ آوروں نے اس کتاب کو مزید نقصان پہنچایا۔ ان تباہیوں سے پہلے ایک حادثہ یہ بھی ہو چکا تھا کہ وقت کے طویل سفر نے رفتہ رفتہ اوستا کی اصل زبان کو متروک کر دیا تھا۔ اور قدیم پہلوی زبان ایرانیوں کے لئے اجنبی ہوتی جا رہی تھی اس لئے اوستا کا مزید خلاصہ کر کے، جدید زبان میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ یہ منتقل شدہ حصے خود اصل کتاب کا صرف دسواں حصہ تھے۔ اس خلاصے کا نام ژند رکھا گیا، پھر اس کی ایک شرح بھی اس کے

ساتھ شامل کی گئی اس کا نام پاژند رکھا گیا۔ آج ہندوستان کے شہر بمبئی میں بہت سے پارسی آباد ہیں۔ ان کے پاس اوستا کے نام سے جو کتاب موجود ہے وہ ایک لاکھ اکتالیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق، موجود کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے۔ جن میں سے صرف ایک حصہ جسے یاسنہ کہا جاتا ہے، صرف وہ، خود زرتشت کی یا ان کے زمانے کی تصنیف ہے اور وہ بھی اصل نہیں بلکہ ترجمہ شدہ ہے۔ باقی پانچ حصے بعد کے زمانے میں مختلف لوگوں کی تحریر ہیں۔ تو جو کتاب بارہ ہزار صفحات سے گھٹ کر سوسوا سو صفحات تک محدود رہ جائے، اور جس کا ترجمہ کر دیا جائے، جس کے اصل کا کہیں سراغ نہ ملے اور جس کی مجموعی ضخامت کا صرف چھٹا حصہ زرتشت سے تعلق رکھتا ہو تو اس کتاب کے غیر محفوظ ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے۔

زرتشت سے نسبت رکھنے والی کتاب اوستا کے تذکرے کے بعد ایک اور ذخیرہ کتب وہ ہے جسے ہندو مقدس قرار دیتے ہیں۔ ان کتابوں کے تین مجموعے ہیں جو وید، پران اور اپن شد کہلاتے ہیں۔ ان کتابوں پر تفصیلی گفتگو کرنے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ اس مختصر کلام میں ایسا کرنا ممکن ہوگا کیونکہ ویدوں کی تعداد تو چار ہے یعنی رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید۔ پرانوں کی تعداد زیادہ ہے البتہ ان میں 18 پران زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اپنشد کی تعداد 200 بتائی جاتی ہے۔ ہمارے مقصد بیان کے لئے صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ہندو علماء کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک وید تو دیوتاؤں کی عطا کردہ کتابیں ہیں۔ رہ گئے پران اور اپنشد تو یہ قدیم آریہ علماء کی تصنیف ہیں۔ اور اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ کہ ان تمام کتابوں کا عرصہ تصنیف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے 1400 سال پہلے سے شروع ہو کر 1000ء تک، تقریباً ڈھائی ہزار سال میں پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی داخلی شہادتوں سے قطع نظر اتنے طویل عرصے کی تصانیف کسی فرد واحد کی نہیں ہو

سکتیں۔ لاتعداد ہاتھوں اور بے شمار ذہنوں کے اشتراک نے ان کتابوں کی تخلیق کی ہے ایسی صورت میں ان کا ماخذ ایک نہیں ہوسکتا۔ اگر صرف ویدوں ہی کو دیکھا جائے تو یہ چار وید بھی تقریباً 2000 سال میں لکھے گئے تھے۔ ان پر کام کرنے والے محققین آج تک یہ بھی نہ جان سکے کہ اس کے مصنفین کون افراد تھے، یا ہماری اصطلاح میں اگر یہ نازل شدہ کتابیں ہیں، تو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ وید کن شخصیتوں پر نازل ہوئے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جن کتابوں کے مصنفین کا نام تک محفوظ نہ ہو، ان کتابوں کو خود کیسے محفوظ کہا جا سکتا ہے۔

پھر ان کتابوں کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام کی تمام سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہیں جو گوتم بدھ کے زمانے سے بھی پہلے سے متروک اور غیر عوامی زبان ہے۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں یہ کتابیں چند ہاتھوں تک محدود رہیں اور جب تک ان پنڈتوں کی دیانت اور امانتداری کا ثبوت نہ ہو ان کتابوں کو محفوظ نہیں کہا جا سکتا۔

ہندوؤں کی یہ مقدس کتابیں زمانہ قبل از تاریخ کی کتابیں ہیں۔ ان کے اپنی اصل حالت میں باقی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان کتابوں میں بھی ہمیں اسلام سے متعلق واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان اشارات پر تفصیلی گفتگو نہ میرا موضوع ہے اور نہ دامن وقت میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ ربط کلام کے لئے صرف اتنا عرض کر دوں کہ تلاش کرنے والوں کو ان کتابوں میں اسلام سے متعلق جتنی پیشین گوئیاں ملی ہیں۔ ان کا تعلق صرف دو باتوں سے ہے یا تو ان پیشین گوئیوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی ہے اور یا پھر اس عظیم قربانی کا تذکرہ ہے جو کربلا کے میدان میں رسول کا نواسہ حسین علیہ السلام پیش کرے گا یہاں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ 1911ء میں

ایک کتاب بشارتِ احمدیؑ کے نام سے شائع ہوئی۔ 144 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ویدوں اور پرانوں کے حوالوں سے اسلام سے متعلق ہونے والی پیشین گوئیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اسلام کی حقانیت اور ہمارے درست ہونے کے لئے یہ پیشین گوئیاں مضبوط دیل ہیں لیکن اس وقت ان پیشین گوئیوں پر گفتگو کرنے کی بجائے مجھے صرف کتاب بشارتِ احمدیؑ کے ٹائیٹل کی طرف توجہ دلانی ہے۔ کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں کتاب کے نام کے بعد لکھا ہے:

> ''بشارتِ احمدی جس میں مولوی عبد العزیز بن غلام احمد جمال الدین سی حنفی نے نہایت تلاش و تحقیق سے ہندوؤں کی مقدس کتابوں سے لے کر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین اور خیر المرسلین ہونے کے ناقابل تردید شواہد فراہم کئے ہیں نیز مظلوم کربلا سید الشہداء، پارۂ جگر مصطفیؐ، امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی تفصیل بھی ان ہی کتابوں سے بیان کی گئی ہے۔''

اب یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ بشارتِ احمدی کا مصنف، اپنے مسلک اور عقائد کے حوالے سے قابلِ احترام شخصیتوں اور لائق ثبوت واقعات کی ایک طویل فہرست رکھتا ہے۔ اس صورت میں اگر تلاش و تحقیق کے دوران اسے تاریخ کی کسی اور شخصیت کے متعلق کوئی ہلکا سا اشارہ بھی مل جاتا تو اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے بے پناہ خوشی ہوتی۔ ساری تحقیق کے نتیجے میں اس کا صرف دو باتوں کا تذکرہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے صرف انہی دو واقعات کے حوالے مل سکے اور یہ شہادت ہے اس بات کی کہ ان کتابوں کی پیشین گوئیوں میں دو ہی باتوں کا ذکر ہے۔ ایک بعثت رسولؐ اور دوسری شہادتِ حسینؑ۔ بات یہ ہے کہ اللہ کا ہر پیغمبر انسان کی ہدایت کے لئے آیا۔ ان تمام

پیغمبروں کی محنت اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی تھی جب ایک طرف وہ پیغام مکمل ہو جائے جسے تھوڑا تھوڑا کرکے انبیاء پہنچا رہے تھے۔ اور دوسرے اس پیغام کی حفاظت کا ایسا انتظام ہو جائے کہ قیامت تک اس کے باقی رہنے کی ضمانت مل جائے۔ اللہ کا دین مکمل ہوا آنحضرتؐ کی بعثت سے، اور دین محفوظ ہوا حسینؑ کی شہادت سے۔ چنانچہ انبیاءؑ احسان مند ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے، کہ جنہوں نے اللہ سے تکمیل دین کی سند حاصل کرکے کام کو انجام تک پہنچایا۔ دوسری طرف ممنون و شکر گزار ہیں حسین علیہ السلام کے، کہ ان کی قربانی سے قیامت تک دین ہر تباہی و بربادی سے بچ گیا اب یہ ان انبیاءؑ کی احسان مندی کا تقاضا ہے کہ ایک طرف تو یہ اپنے ان محسنوں کے احسان کا تذکرہ کریں اور دوسری طرف آنے والے زمانے کے انسانوں کو ان عظیم ہستیوں کے استقبال کے لئے ذہنی طور پر آمادہ اور تیار کرلیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے کے مذاہب کی مقدس کتابوں میں انسانیت کے ان بزرگ ترین محسنوں کا ذکر موجود ہے اور جب کربلا انبیاءؑ پر احسان ہے تو ان انبیاءؑ سے فیض ہدایت پانے والی انسانیت پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ ذکرِ حسینؑ کی سعادت حاصل کرکے اپنی احسان شناسی اور شرافت انسانی کا ثبوت فراہم کرے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

﴿ حفاظتِ قرآن : ۳ ﴾

انبیائے بنی اسرائیل کی کتابیں

حفاظت قرآن کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے مرحلے پر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ محفوظ ہونے کے اعتبار سے قرآن مجید کو دیگر آسمانی اور مذہبی کتابوں پر کوئی ترجیح یا فوقیت حاصل ہے؟ اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی دعویٰ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب ہم دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں کے بارے میں ضروری بنیادی معلومات رکھتے ہوں۔ اگر ہم دوسری کتابوں کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں تو قرآن کے متعلق ہمارے تمام دعوے محض ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہوں گے۔ چنانچہ ہم نے کل کی گفتگو میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک اس تمام مذہبی لٹریچر کی بات کی جو قرآن سے پہلے انسانوں کی راہنمائی اور ہدایت کا فریضہ سرانجام دے رہا تھا لیکن غیر محدود وقت اور آپ کی قوت برداشت کو غیر ضروری امتحان سے بچانے کے لئے میں نے ایک بڑے ذخیرۂ کتب کا ذکر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کتابیں کسی حد تک ذرا تفصیلی تذکرے کا تقاضہ کر رہی تھیں چنانچہ آج ان باقی ماندہ کتابوں پر گفتگو کر کے بات کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ باقی کتابیں وہ الہامی یا مقدس کتابیں ہیں جو ایک ہی نسل یعنی بنی اسرائیل کے انبیاء سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جن کو عرف عام میں

بائبل یا عہد نامۂ قدیم وجدید کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کے انبیاء کی ان کتابوں کا معاملہ تھوڑا سا تفصیل طلب بھی ہے اور الجھا ہوا بھی ہے۔ کیونکہ بائبل میں، جو ان کتابوں کا مجموعہ ہے، کل 66 کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سے 39 کتابیں پرانے عہدنامے میں ہیں اور 27 کتابیں نئے عہدنامے میں۔ اس نئے عہدنامے کو انجیل کہتے ہیں۔ پرانے عہدنامے کی 39 کتابوں میں سے پانچ پہلی کتابیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تعلق رکھتی ہیں اور 34 ان انبیاء یا علماء سے منسوب ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بنی اسرائیل میں گزرے ہیں۔ آج کی بات کو سادہ اور عام فہم کرنے کے لئے میں اپنی گفتگو کے تین حصے کر رہا ہوں۔ پہلے توراۃ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ کتابوں پر گفتگو ہو جائے، پھر یہودیوں کے باقی انبیاء کی کتابوں پر بات ہو اور پھر آخر میں عیسائیوں کی مقدس کتاب انجیل کا جائزہ لیا جائے۔

توراۃ کا لفظ ہماری اصطلاح میں اس ایک کتاب کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ لیکن آج بائبل میں ان کی تعداد پانچ ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب پیدائش ہے۔ اس میں دنیا بننے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک رونما ہونے والی واقعات ترتیب کے ساتھ بیان کیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد دوسری کتاب خروج ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے فرعون کے ملک مصر سے نکلنے کے حالات درج ہیں۔ پھر کتاب قانون ہے اور درحقیقت اسی کتاب کا نام توراۃ ہے۔ توراۃ یا تورہ کے معنی قانون ہیں۔ اس کتاب قانون میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے احکام درج ہیں۔ یہی احکام، احکام عشرہ یا Ten Commandments کہلاتے ہیں۔ چوتھی کتاب گنتی کہلاتی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام قبیلوں کی گنتی کرائی تھی۔ کتاب گنتی اسی

مردم شماری کے اعداد و شمار یا Census Report پر مشتمل ہے۔ پانچویں اور آخری کتاب کا نام تثنیہ ہے۔ اس لفظ تثنیہ کا مطلب دہرانا ہے۔ اس کتاب میں نہ تو کوئی نیا موضوع ہے اور نہ ہی کوئی نئی بات کہی گئی ہے۔ درحقیقت یہ چار پہلی کتابوں کا خلاصہ ہے۔ یہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے چھ سو سال بعد محض اتفاق سے ایک غار سے دریافت ہوئی۔ چونکہ اس کتاب کے مندرجات باقی کتابوں کی تحریر سے مطابقت رکھتے تھے اس لئے اسے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتابوں کا حصہ بنالیا گیا۔

توراۃ کی کتابوں کی حقیقت پر ایک نظر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتابیں جو آج ہمیں تحریر شدہ کتابی شکل میں نظر آتی ہیں، ہمیشہ سے اس حال میں نہیں تھیں۔ بلکہ لوک کہانی (Folk traditions) کی طرح، سینہ بہ سینہ، محض حافظے کی بنیاد پر ایک فرد سے دوسرے فرد اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی تھیں۔ اور پھر یہ الگ الگ باب یا کتابوں کی موجودہ صورت بھی نہیں تھی بلکہ نظم و نثر کی ایسی ملی جلی داستان تھی جسے سنانے والے کبھی گا کر سناتے کبھی تحریر کے انداز میں بیان کرتے۔

چنانچہ اس لوک حکایت کو کتاب کی شکل دیتے دیتے اس کے ساتھ دو مختلف قسم کے حادثے ہوئے۔ ایک حادثہ تو یہودیوں کی داخلی سیاست سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے کا تعلق بیرونی طاقتوں کی کشور کشائی اور زور آزمائی کا نتیجہ تھا۔

داخلی سیاست تو یہ ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد یہودی سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک سلطنت تو جنوبی فلسطین میں یہودی سلطنت کے نام سے قائم ہوئی۔ دوسری سامریہ میں اسرائیلی سلطنت کہلائی۔ سنہ 721 قبل مسیح میں یہودی سلطنت

نے سامریہ کو فتح کر لیا۔ اور اس طرح دونوں حکومتیں ایک ہوگئیں۔ لیکن اس دوران دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے طور پر توراۃ کے ایڈیشن تیار کیئے۔ ان میں سے ایک یہودی ٹیکسٹ (Yahvist Text) کہلاتا ہے اور دوسرا الوہیمی ٹیکسٹ (Elohist Text) ہے۔ دونوں سلطنتوں کے ایک ہو جانے کے بعد ان دونوں متون کو جمع کرنے کی ایک کوشش کی گئی۔ اس کوشش سے وہ دونوں Text ایک تو نہ ہوئے البتہ ایک تیسری توراۃ ضرور تیار ہوگئی۔ اس کا نام اشتثنائی ٹیکسٹ Deuteromony Text) رکھا گیا۔ پھر یروشلم کے نو علماء نے مل کر چھٹی صدی قبل مسیح میں توراۃ کا ایک اور نسخہ ترتیب دیا۔ اس کو مرشدانہ ٹیکسٹ (Sacerdotal Text) کا نام دیا گیا۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے پہلے توراۃ کے کم از کم چار نسخے تھے۔ اور یہ تمام کے تمام ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ان چار نسخوں کو ایک بنانے کی تمام کوششیں ناکام ہی نہیں ہوتی رہیں بلکہ ہر کوشش کے نتیجے میں ایک اور متنازعہ نسخہ وجود میں آتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آٹھ سو سال کے بعد یعنی اسلام کے ظہور کے بعد بھی تقریباً دو سو سال بعد کہیں جا کر اس ایک توراۃ پر یہودیوں کا اتفاق ہوا جو آج یہودیوں کے پاس موجود ہے اور وہ بھی اس توراۃ سے مختلف ہے جو عیسائیوں کے عہد نامہ عتیق میں موجود ہے۔ اس دو ہزار سال کے دوران توراۃ کیا کیا شکلیں بدلتی رہی اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بائبیل قرآن اور سائنس کے مصنف موریس بوکائے (Maurice Bucaille) نے صرف پہلے دو متون کا مقابلہ کیا تو فیصلہ سنانے پر مجبور ہوگیا کہ دو ہزار سال کی مدت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب توراۃ اپنی ابتدائی شکل سے بالکل تبدیل ہوگئی ہے۔

یہ تو ان حادثات کا مختصر تذکرہ تھا جو توراۃ پر خود یہودیوں کے ہاتھوں گزرتے

رہے۔ اب ذرا اس کتاب پر آنے والی بیرونی مصیبتوں کا حال بھی سن لیجیے میسو پوٹیمیا یا عراق کے تخت پر جب بخت نصر دوم بیٹھا تو اس نے اپنی سلطنت کی فتوحات کے ذریعے وسعت دینی شروع کی۔ چنانچہ اس کے مفتوحہ علاقوں میں مصر بھی شامل ہوگیا۔ مصر کے ساتھ بخت نصر کا قبضہ فلسطین پر بھی ہوگیا۔ سنہ 897 قبل مسیح میں یہودیوں نے بخت نصر کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت کچل دی گئی۔ سنہ 886 قبل مسیح میں یہودیوں نے دوسری مرتبہ سر اٹھایا تو بخت نصر نے خود حملہ کر کے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان کی عبادت گاہیں مسمار کر دیں۔ عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ توراۃ کے سارے نسخے بھی نذر آتش کر دیئے۔ اور چار ہزار یہودیوں کو قیدی بنا کر اپنے ہمراہ عراق لے گیا۔ تقریباً چھیاسی سال کی جلاوطنی کے بعد یہودی آزاد ہوئے تو ان کے پاس نہ تو توراۃ تحریری طور پر باقی بچی تھی نہ وہ نسل باقی بچی تھی جسے توراۃ زبانی یاد ہو۔ اس موقع پر ایک شخصیت عزرا یا عزیر نے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان کی مدد کی اور وہ محض اپنے حافظے کی مدد سے ایک مرتبہ پھر توراۃ لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ کچھ وقت گزرا تو رومن سردار اینٹوکس فلسطین پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بھی بخت نصر کی تاریخ دہرا دی۔ پھر ایک اور سردار طیطس (Titus) نے حملہ کر دیا۔ اس نے بھی تباہی مچائی غرض توراۃ بار بار غائب ہوتی رہی اور بار بار اس کو نئے سرے سے لکھا جاتا رہا۔ اب خود اندازہ کر لیجیے کہ وہ کتاب بار بار سو سو سال تک لاپتہ رہے اور اس کے بعد محض انسانی حافظے پر بھروسہ کر کے لکھی جائے اس کے اصل کے مطابق ہونے کے کتنے امکانات ہو سکتے ہیں۔

یہ سب تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن اصلاح کی لاتعداد کوششوں کے باوجود آج صورتحال یہ ہے کہ آج بھی توراۃ میں ایسی بیسیوں مثالیں موجود ہیں جو واضح طور پر یہ

ثابت کرتی ہیں کہ اس کتاب میں اضافے بھی کیئے جاتے رہے اور کمی بھی ہوتی رہی۔ اضافے کی ایک تو انتہائی روشن شہادت یہ ہے کہ کتاب تثنیہ کے آخری حصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انتقال اور تجہیز و تکفین کے حالات بھی درج ہیں۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام شاعر تو تھے نہیں کہ اپنے مرنے کا حال خود سناتے۔ ظاہر ہے کہ یہ تفصیل کسی اور نے داستان مکمل کرنے کے لئے اپنی طرف سے شامل کر دی ہے۔

یہ تو تھی توراۃ میں اضافہ کی مثال۔ اب کمی کیئے جانے کی شہادت یہ ہے کہ توراۃ میں کئی مقامات پر ایک بات بیان کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہی بات اس سے پہلے توراۃ کے فلاں باب میں بیان کی گئی ہے۔ اس قسم کی کراس ریفرینسنگ کے دوران دو ابواب ''خدا کی جنگیں'' اور ''مخلص اور نیک لوگوں کی کتاب'' ایسے باب ہیں کہ آج کی توراۃ میں نہیں ملتے۔ ظاہر ہے کہ پہلے موجود تھے اب غائب ہو چکے ہیں۔

ان باتوں کے ساتھ ساتھ توراۃ کے بارے میں ایک اور اہم حقیقت بھی پیش نظر رہے۔ اور وہ یہ کہ توراۃ عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا عبرانی متن یہودی یا کیتھولک عیسائیوں کے بہت بلند پایہ عالموں کے لئے تو شاید قابل فہم ہو لیکن عوام اسے صرف ترجمے کی مدد سے ہی سمجھ سکتے ہیں۔

انبیائے بنی اسرائیل کی دوسری کتابیں

چنانچہ توراۃ تاریخی طور پر بھی غیر محفوظ ثابت ہوتی ہے اور اپنی داخلی شہادتوں سے بھی تحریف اور ترمیم شدہ ثابت ہوتی ہے اور جب توراۃ، جو یہودیت میں بنیادی کتاب ہے، وہی سلامت نہیں تو باقی انبیاء کی ۳۴ کتابوں کے متعلق حقیقت حال کیا ہوگی؟ اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کے متعلق الگ الگ گفتگو کرنا بہت کو یا

مقصد طول دینا ہوگا۔ انتہائی اختصار سے بات کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کردوں کہ یہ 34 کتابیں بھی دو حصوں میں منقسم ہیں۔ یشوع سے حزقیل تک دس انبیاء کی بیس کتابیں تو باقاعدہ انبیاء کے صحیفے ہیں۔ باقی 14 ان لوگوں کی تصانیف ہیں جو انبیائے خورد کہلاتے ہیں۔ میں نے ان کتابوں کو تصنیف اس لئے کہا کہ انبیاء میں تو چھوٹے بڑے کا فرق ہو سکتا ہے لیکن انبیاء کے چھوٹے بڑے ہونے سے کتاب چھوٹی بڑی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ الہامی کتاب تو ایک اللہ کی طرف سے ہے اور اس کا ہر عمل یکساں ہے۔ درحقیقت یہ 14 انبیائے خورد بنی اسرائیل کے بلند پایہ علماء ہیں اور ان کی علمی عظمت کے پیشِ نظر ان کی تصانیف کو بھی بائبل کا حصہ بنالیا گیا ہے۔ عہد نامۂ عتیق کی انہی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور کتاب حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور ہے۔ زبور ایک نہیں پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں میں مجموعی طور پر ایک سو پچاس نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں اللہ کی حمد یا نیک لوگوں کی مدح اور یا پھر بعض نظموں میں کچھ اخلاقی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔

اب صورت یہ ہے کہ ان 34 کتابوں کا عرصۂ تصنیف یا عرصۂ نزول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے شروع ہوکر آگے کے سولہ سو سال ہیں۔ ان صحیفوں میں سے تقریباً 29 صحیفوں کا مواد وجود میں آچکا تھا کہ یہودیوں کو سرزمین فلسطین سے پہلی مرتبہ جلاوطن ہونا پڑا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد یعنی سنہ 886 قبل مسیح میں بخت نصر کے حملے سے دوسری جلاوطنی شروع ہوگئی جو تقریباً سو سال تک جاری رہی۔ ان دو جلاوطنیوں کے دوران تو راۃ کا ایک نسخہ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ باقی انبیاء کی کتابیں کہاں محفوظ رہ سکتی تھیں لیکن تاریخ کی اس بحث سے قطع نظر اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم ان کتابوں کو محفوظ بھی مان لیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے کہ یہودیوں کی ساری شریعت صرف اور صرف توراۃ میں ہے۔ باقی انبیاء کی تمام کتابوں میں یا تو حمدیہ نظمیں ہیں اور یا پھر تاریخی

واقعات ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے عبادات کے وقت گیت تو گائے جا سکتے ہیں لیکن حلال وحرام کے احکام حاصل نہیں کیئے جا سکتے چنانچہ ان کتابوں پر مزید گفتگو کرنا وقت کو ضائع کرنا ہوگا۔

انجیل بھی غیر محفوظ ہے

اب آیئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب انجیل پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ انجیل الہامی کتابوں میں زمانے کے اعتبار سے قرآن مجید سے قریب ترین کتاب ہے۔ اور اپنے سلسلے یعنی انبیائے بنی اسرائیل میں آخری کتاب ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب سے یہ توقع غلط نہیں تھی کہ اسے اپنے سے پہلے کی کتابوں کے مقابلے میں نسبتاً شکوک و شبہات سے بالاتر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اب اسے کیا کہیے کہ یہاں صورت حال سابقہ کتابوں سے بھی زیادہ پریشان کن ہے۔

موجودہ انجیل یا عہدنامہ جدید کل 27 کتب پر مشتمل ہے۔ ان میں چار کتابیں متی (Mathew)، لوقا (Luke)، مرقس (Mark) اور یوحنا (John) کی انجیلیں کہلاتی ہیں۔ باقی 23 میں سے جن کو "رسولوں کے اعمال" کہا جاتا ہے، 21 رسولوں کے خطوط ہیں، جو انہوں نے مختلف قوموں اور حکمرانوں کے نام لکھے اور ایک یوحنا کا مکاشفہ ہے۔

جہاں تک انجیلوں کا تعلق ہے تو یہ قرآن مجید کی طرح اللہ کے رسول پر نازل ہونے والی کوئی کتاب نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان پر ایمان لانے والوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال اور واقعاتِ زندگی کو جمع کیا ہے۔ اگر انجیلوں کا موازنہ اسلامی مذہبی لٹریچر سے کیا جائے تو ان کی حیثیت احادیث کے ان

مجموعوں کی طرح ہے جنہیں مسلمان محدثین نے حضور ﷺ کے بعد جمع کیا ہے۔ ان انجیلوں کی تحریر کی بڑی وجہ ابتدائے عیسائیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیوں میں ایک اہم اختلاف نے سر اٹھایا۔ یہ اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے متعلق تھا۔ ایک بڑا گروہ، جس کی قیادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک رشتہ دار سینٹ جیمز (James) کر رہے تھے، یہ کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت بدستور نافذ العمل تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف یہودیت میں پیدا ہو جانے والی خرابیاں دور کرنے آئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ عبادات اور مذہبی رسومات میں یہودی طریقوں پر ہی عمل کرتے تھے۔ ابتداء میں جیمز کا مسلک ہی مقبول تھا۔ اسی اثناء میں ایک اور شخصیت عیسائی دنیا میں داخل ہوئی۔ یہ ایک صاحب پال یا پولس (Paul) تھے۔ پال نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تک نہیں تھا۔ البتہ ان کا دعویٰ تھا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ جی اٹھے تو پال کے سامنے ظاہر ہوئے۔ اور اسے عیسائیت کا پیغام دیا۔ پال آج تو سینٹ پال کے نام سے جانے جاتے ہیں لیکن ابتدائی عیسائیت میں ان کو منافق، بدعتی اور گمراہ قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب عیسائی علماء کا پہلا اجلاس عیسائیت کے مستقبل پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تو پال کو اجلاس سے باہر نکال دیا گیا۔ لیکن جلدی ہی سینٹ جیمز کی یہودی عیسائیت (Judeo - Christianity) پر سینٹ پال کے نظریات غالب آنے لگے اور انجام کار یہودی عیسائیت ختم ہوگئی۔

سینٹ پال کا کہنا یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے گناہ مصلوب ہو جانے کے بعد اب عیسائیوں کو کسی شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کے لئے آخرت کی نجات کے لئے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر عقیدہ رکھنا کافی ہے اور یہاں ضمناً یہ

عرض کردوں کہ یہ صرف عیسائیت کی بات ہی نہیں، دنیا کے اکثر مذاہب کو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے عوامی طبقے میں نجات کا وہ تصور زیادہ مقبول ہوا جس میں آخرت کی تمام نعمتیں بغیر کوئی عمل کیئے ہوئے، محض کوئی خاص عقیدہ رکھنے سے حاصل ہو جائیں۔ کسی بھی قوم کے دینی زوال کی یہ ایک نمایاں علامت ہے کہ اس میں عمل کی بجائے محض عقاید اور نظریات پر اکتفا کرلیا جائے۔

خیر۔ یہودی عیسائیت اور پالپائی عیسائیت کے اس اختلاف کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ تمام عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو محفوظ کرنے کی فکر ہونے لگی۔ چنانچہ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات، واقعات اور اقوال کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح سے ستر سے سو تک کتابیں وجود میں آگئیں۔ یہ سب انجیل کہلائیں۔ ان تمام کتابوں کے تصنیف کرنے والوں یا ترتیب دینے والوں کا بنیادی مقصد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صرف وہ واقعات اور حالات جمع کرنا تھا جن سے اس وقت کے مذہبی اختلافات کی جنگ میں ان کا موقف درست ثابت ہو جائے اور مخالفین کی بات رد ہو جائے۔ اگر یہ کوشش شعوری نہیں تھی تو غیر شعوری ضرور تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس طرح جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کے معروضی مطالعے سے محروم تھیں۔ اب اس ذخیرے سے صرف چار کتابوں کو کیسے منتخب کیا گیا اور انہیں مقدس انجیلوں کا مرتبہ کس طرح دیا گیا؟ یہ وہ سوال ہیں جن کا جواب اب تک فراہم نہ ہو سکا۔ فرانس کے فلسفی طنز نگار والٹئر نے اس انتخاب پر جملہ کسا کہ شاید یہ انتخاب یوں عمل میں آیا کہ تمام انجیلوں کو قربان گاہ کی میز پر رکھ کر، میز کو زور زور سے ہلایا گیا۔ غرض قبول شدہ کتابیں انجیل مقدس ہوگئیں اور جنہیں رد کیا گیا تھا وہ اسفار محرفہ کہلائیں۔ ان اسفار محرفہ میں سے دو کتابیں، تامس اور برناباس کی انجیلیں اپنی مقبولیت کی وجہ سے کچھ

عرصہ تک باقی رہیں۔ پھر باقی اسفار محرفہ کی طرح چرچ نے ان کو بھی غائب کر دیا۔

جو انتخاب کا عمل انجیل کے ساتھ ہوا تھا وہی سلوک مختلف حکمرانوں اور قبیلوں کے نام لکھے گئے خطوط کے ساتھ ہوا۔ برناباس کی انجیل کی طرح، ان کے تبلیغی خطوط بھی رد کر دیئے گئے۔ جو چار انجیل منتخب کی گئی تھیں ان میں پہلی انجیل متی (Mathew) کی تھی۔ اس کا زمانہ تحریر سنہ ستر عیسوی ہے۔ متی مسلک کے اعتبار سے اپنے ساتھیوں میں واحد یہودی عیسائی ہیں باقی تین لوقا (Luke)، مرقس (Mark) اور یوحنا (John) سینٹ پال کے مقلد اصحاب ہیں۔ چنانچہ متی کی انجیل میں اعمال و کردار پر زور ہے جب کہ باقی تین صرف عقائد پر اصرار کرتے ہیں۔

ان چار انجیلوں کے متعلق چرچ کا دعوی تھا کہ ان کے مصنف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تھے لیکن خود عیسائی محققین نے اس دعوے سے اختلاف کیا۔ ان کے خیال میں جہاں تاریخ چرچ کے دعوے کی تائید نہیں کرتی وہاں داخلی شہادتیں بھی اس کے خلاف جاتی ہیں۔ بلکہ لوقا نے تو اپنی انجیل کا آغاز ہی اس اعتراف سے کیا ہے کہ ''چونکہ بہت سے لوگوں نے اس امر پر کمر باندھی ہے کہ جو باتیں ہمارے درمیان ہوئیں ان کو ترتیب وار بیان کریں۔ جیسا کہ انہوں نے جو شروع سے دیکھنے والے اور کلام کے سننے والے تھے ان کو ہم تک پہنچایا۔ اس لئے اے معزز تھیوفیلس میں نے بھی مناسب جانا کہ سب باتوں کا سلسلہ شروع سے ٹھیک ٹھیک دریافت کر کے تیرے لئے ترتیب سے لکھوں'' ۔ مرقس کی انجیل مختصر ترین ہے۔ لیکن محققین اس کو زیادہ سے زیادہ مرقس کے کسی شاگرد کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ خود اس انجیل نے کسی مصنف کی نشاندہی نہیں کی ۔ یوحنا یوں بھی باقی تین انجیلوں سے الگ تھلگ ہیں۔ واقعات، انداز بیان اور انتخاب واقعات، غرض کہ تینوں باتوں میں ان کی راہیں جدا ہیں۔ ان کی انجیل سب سے

آخر میں، یعنی سنہ ایک سو دس عیسوی میں لکھی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب ان سے پہلے کے مؤلفین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں موجود نہیں تھے۔ تو یوحنا کے حواری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اسی طرح پہلی انجیل کے خالق متی کو بھی اس حواری سے مختلف شخصیت قرار دیا گیا ہے۔ جو کاپورناؤم کے مقام پر چونگی وصول کرتے تھے۔ اور جو یری کے نام سے معروف ہیں۔

جس طرح ان انجیلوں کے مرتبین کے متعلق حقائق واضح نہیں اسی طرح جو کچھ ان میں لکھا ہوا ہے اس کے متعلق بھی کئی سوال اٹھتے ہیں۔ ان چار انجیلوں میں بہت سے سنگین اختلافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اختلافات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شجرے سے شروع ہوتے ہیں اور آپ کو قبر سے زندہ اٹھائے جانے تک جاری رہتے ہیں۔

عیسائی چرچ نے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ انجیلیں ان کے مصنفین نے حقیقتاً خود تحریر نہیں کیں، روح القدس کی نگرانی میں بھی نہیں لکھی گئیں، بلکہ براہ راست خود روح القدس یعنی حضرت جبرئیل نے لکھوائیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حواریوں یا سینٹس نے جو خطوط لکھے، یا مجمع عام سے خطاب کیا، یا یہودی علماء سے مناظرہ کیا، یا کوئی معجزہ دکھایا، تو ہر مرحلے پر روح القدس ہی سب کچھ کرتے تھے۔ اب بائبل، قرآن اور سائنس کا مصنف موریس بکائے ہی نہیں، ہر شخص یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہے کہ جب ساری انجیلوں کا ماخذ روح القدس ہی تھے تو پھر ان میں اختلاف کیوں؟ اور پھر جب یہ چار انجیلیں روح القدس نے لکھوائیں تو باقی جن کو ٹھکرا دیا گیا، کس نے لکھوائی تھیں۔ اور پھر یہ کیسے پتہ چلا کہ صرف چار انجیلیں، اکیس خطوط، ایک مکاشفہ اور ایک اعمال نامہ تو روح القدس نے لکھوایا ہے اور باقی انہوں نے نہیں لکھوایا ہے۔ اور اگر سب الہامی ہیں تو ان میں کسی کو کسی پر ترجیح کیسے حاصل ہوئی۔ آخر برناباس کی انجیل کیوں رد کر

دی جائے جبکہ وہ ایک حواری کی تحریر ہے اور وہ انجیلیں کیوں قبول کر لی جائیں جن کے لکھنے والوں کے متعلق یہی معلوم نہ ہو سکے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر دیکھا ہی تھا تو کیا وہ ان تمام واقعات و حالات کے بھی چشم دید گواہ تھے جن کو انہوں نے اپنی انجیل میں درج کیا ہے۔

ان چاروں انجیلوں کو اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کی تصنیف مان بھی لیا جائے تو ان کے ناقابلِ اعتبار ہونے کے لئے صرف ایک ہی بات کافی ہے کہ ان کو ان حضرات نے جمع کیا جو ایمان کے امتحان میں بری طرح ناکام ہوگئے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام زندگی نہ کوئی گھر بنایا، نہ بیوی بچوں کے مسئلے سے دوچار ہوئے۔ انہوں نے اپنا تمام وقت، تمام توجہ صرف اور صرف اپنے اصحاب کی ایک مختصر جماعت کی تربیت پر صرف کردی۔ لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ دنیوی کی آخری رات آئی تو جو سب سے بڑا صحابی تھا۔ اس نے رومی سپاہیوں کے خوف سے ایک ہی رات کے دوران تین مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رومیوں کے حوالے کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جو لوگ ایسے کمزور ایمان کے مالک ہوں کہ پہلے ہی امتحان میں ان کے قدم ڈگمگا جائیں۔ وہ جب کوئی واقعہ بیان کریں گے تو سب سے پہلے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اصل واقعہ میں تحریف کردیں گے۔ ان سے غلط بیانی کی صرف توقع ہی نہیں، یقین ہوگا۔ ایسوں کے ہاتھوں جمع ہونے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کبھی قابلِ اعتماد نہیں ہوسکتے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۴

قرآن مجید کی امتیازی خصوصیات

قرآن مجید کے نزول اور حفاظت کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں ہم نے اس مقدس کتاب کے نزول کی تاریخ بیان کی وہاں ایک مناسب حد تک تفصیلی جائزہ ان تمام کتابوں کا بھی پیش کیا جو قرآن سے پہلے نازل ہوئیں یا جن کتابوں کو دوسرے مذاہب میں تقدس کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس مطالعے سے ہمیں جہاں دوسرے مذاہب کی کتابوں کے بنیادی خدوخال معلوم ہوئے ہیں، وہاں یہ جاننے میں بھی مدد ملی کہ قرآن مجید میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اسے دوسری تمام کتابوں میں امتیاز عطا کرتی ہیں اور یہ امتیاز بھی اس حوالے سے کہ قرآن مجید دنیا میں موجود وہ واحد الہامی کتاب ہے جس کے متعلق خود نازل کرنے والے قادر مطلق نے یہ وعدہ کیا ہے کہ جہاں ہم اسے نازل کرنے والے ہیں وہاں ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ کی حفاظت کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا کہ قرآن کی حفاظت اس طرح سے ہوگی جس طرح ہم اپنی دولت کی حفاظت کرتے ہیں۔ دولت کی حفاظت کا طریقہ تو یہ ہوگا کہ اسے کسی مضبوط تجوری میں بند کر دیا جائے، یا اس کی نگرانی کے لئے طاقت ور نگران مقرر کر دیئے جائیں۔ یہ دونوں طریقے وہاں اختیار کیے جاتے ہیں جہاں کسی چیز کو مالک کے سوا اور

تمام گوشوں سے بچانا مقصود ہو۔ قرآن مجید تو اس کے خالق کی طرف سے نازل ہی اس لئے ہوا تھا کہ اسے تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچا دیا جائے۔ اس کی حفاظت کے لئے ضروری تھا کہ اس کے اندر ایسا حفاظتی نظام موجود ہو کہ قرآن دوست دشمن، سب ہی تک پہنچے، لیکن یہ اتنا محفوظ ہو کہ نقصان پہنچانے کے آرزومند ہاتھ ملتے رہ جائیں لیکن اللہ کی کتاب کو کوئی ضرر نہ پہنچ پائے۔ یہی قرآن کا داخلی حفاظتی نظام ہے۔ جو قرآن کو دوسری تمام الہامی کتابوں میں ممتاز کر دیتا ہے۔

قرآن مجید کی زبان

چنانچہ اس نظام کا پہلا جزو، یا یوں کہیے کہ قرآن کی پہلی امتیازی خصوصیت اس کی زبان ہے۔ قرآن مجید سے پہلے کی تمام مقدس کتابیں سنسکرت، پہلوی، عبرانی، سریانی اور آرامی زبانوں میں تھیں۔ ان میں سے کوئی ایک زبان بھی آج دنیا کے کسی خطے یا کسی قوم کی زبان نہیں ہے۔ آج ان زبانوں کا کوئی وجود ہے، تو صرف ان کتابوں میں ہے اور آج اگر کوئی انسان ان کا علم حاصل کرتا ہے تو اس لئے کہ ان کتابوں کو پڑھ سکے۔ ان تمام مقدس کتابوں کی اصل زبان کے مردہ ہو جانے سے خود اس کتاب کے ماننے والوں کے لئے بھی ان کی مقدس کتاب اجنبی ہو گئی۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام مذہبی کتابیں دوسروں تک پہنچیں تو براہ راست نہیں پہنچیں بلکہ ترجمے کے ذریعے پہنچیں۔ اور دنیا کا بڑا سے بڑا ترجمہ کرنے والا خواہ کتنا ہی ماہر زبان کیوں نہ ہو۔ علم و فضل کے اعتبار سے خواہ اسے کتنا ہی بلند درجہ کیوں نہ حاصل ہو، لیکن وہ اپنے کیئے ہوئے کسی ترجمے کے لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے مصنف کی تحریر کی سو فی صد ترجمانی کی ہے۔ دنیا کا کوئی مترجم اپنے شعور کی آخری حدوں تک کوشش

کرے، لیکن اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اصل تحریر کے ترجمے کے دوران اپنے ذاتی احساسات، تصورات، خیالات، تجربات، رجحانات اور تعصّبات سے مکمل طور پر دستبردار ہو جائے۔ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی اصل مصنف ترجمے سے رخصت ضرور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ترجمہ کرنے والے کی ذات داخل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا میں جو تحریر بھی محض ترجمے کے ذریعہ دوسروں تک پہنچے گی لازماً تحریف شدہ پہنچے گی۔

دوسری طرف جب ہم قرآن مجید کو دیکھتے ہیں تو یہ جس زبان میں نازل ہوا اسی میں نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ اس کا مطالعہ کرنے والے اس کو اس کی اصل زبان میں پڑھیں تو اسے تلاوتِ قرآن سمجھتے ہیں ورنہ اس کا ترجمہ پڑھنا قرآن کے پڑھے جانے کے مترادف نہیں ہوتا ..... اور پھر قرآن نازل ہوا عربی زبان میں۔ جو آج اقوام متحدہ کی شائع کردہ 1958ء کی رپورٹ کے مطابق دنیا کی آٹھویں سب سے بڑی زبان ہے۔ چودہ سو سال پہلے نازل ہونے والی قرآن مجید کا صرف عربی زبان میں ہونا ہی کافی نہیں تھا کیونکہ اور تمام زبانوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتنی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں کہ تین چار سو سال میں زبان کی شکل ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ دکنی ہندوستان میں، چار سو سال پہلے بولی جانے والی قطب شاہی اردو آج کے اردو بولنے والے کے لئے اجنبی ہو چکی ہے۔ پانچ سو سال پرانا انگریزی کا شاعر، چاسر، آج کی بین الاقوامی زبان انگریزی کے اہل زبان کے لئے بھی ناقابل فہم ہے۔ لیکن عربی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وقت کی رفتار نے اس زبان کے قواعد پر، الفاظ پر، تلفظ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ آج بھی عرب اخبارات و رسائل، بازاروں اور گھروں کی زبان وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے بولی جاتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ آج دنیا کے بیسیوں ملک کے عوام جس عربی میں بات کرتے ہیں وہ صرف عربی نہیں بلکہ قرآنی عربی ہے۔

چنانچہ اب اس گفتگو سے مَیں یہ نتیجہ نکالوں تو غلط نہیں ہوگا کہ جن کتابوں کو مختصر مدت تک رہنا تھا ان کے لئے قدرت نے زبانیں بھی وہ چنیں جو کچھ عرصہ بعد صرف ماہرین تک محدود رہ جانے والی تھیں۔ ان کے مقابلے میں قرآن کو قیامت تک رہنا تھا۔ اس لئے اس کی زبان بھی وہ ہے جو قیامت تک اپنی اصلی صورت میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

قرآن مجید کا محفوظ اور موجود ہونا

اب آیئے قرآن مجید کی ایک اور خصوصیت کا جائزہ لیں۔ کل 313 یا 315 کتابوں میں جن کو غلط یا صحیح طور پر الہامی کہا جاتا ہے۔ آج تک ہم تک پہنچنے والی کل کتابوں کی تعداد بمشکل پچاس ہے۔ اور یہ کتابیں جن شخصیتوں کی طرف منسوب ہیں ان کی تعداد 35 یا 36 ہے۔ ان اعداد و شمار سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ تقریباً پونے تین سو انبیاء کی کتابوں کا کوئی سراغ ہی نہیں ہے اور جن کتابوں کا سراغ ہی نہیں ہے ان کے غیر محفوظ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب جو باقی ماندہ کتابیں ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہے جو من وعن وہ کتاب ہو جو نبی یا صاحب کتاب نے چھوڑی تھی توراۃ اور انجیل جو بائبل کی اہم ترین کتابیں ہیں ان کا حال ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان تمام کتابوں میں اضافہ، تخفیف اور ترمیم ہوتی رہی۔ اور خوش عقیدگی کے کرشمے اپنی جگہ پر ان کتابوں کے ماننے والے محققین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کتابیں اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی نہ ماننے پر اصرار کرے تو ڈھیروں داخلی شہادتیں ہیں جو ان کو بمطابق اصل نہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ آج بھی جب بائبل کا کوئی حوالہ دیا جائے تو فوراً سوال اٹھتا ہے کہ یہ حوالہ کس بائبل سے ہے۔ نیو امریکن اسٹینڈرڈ بائبل (New

American Standard Bible) اور آتھورائزڈ کنگ جیمز ورژن (Authorized King James Version) میں ایک ایک آیت میں صرف لفظی اختلاف نہیں، بلکہ اضافہ اور تحریف کے مترادف اختلاف ہیں۔ (حوالے کے لئے یوحنا کے باب پنجم کی آیت ۱۶ اور ۷ کا موازنہ کر لیجیے)۔

ان باتوں کے مقابلے میں قرآن کو دیکھیے۔ کہ اپنے نزول کے بعد آج تک ایک مسلسل تاریخی حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ کسی بخت نصر، کسی سکندر، کسی رومن سردار کے ہاتھوں اس کے تباہ ہونے، اس کے ناپید ہونے، ردو بدل کیئے جانے کا کوئی واقعہ، کبھی نہیں ہوا۔ اس کتاب کی بازیافت ہی کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ چہ جائیکہ اس بازیافت کے لئے اتفاق، کسی معجزے، کسی حادثے کا احسان مند ہونا پڑتا۔ چودہ سو سال کے ہر دور کے لاتعداد نسخے آج بھی دستیاب ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں مسلمان آباد ہیں۔ ان سب کے پاس قرآن کے نسخے موجود ہیں۔ اب قرآن مجید کا کوئی نسخہ ہو، خواہ اس کا ملک کسی مسلک، کسی عقیدے سے تعلق رکھتا ہو، آج تک پوری دنیا میں کوئی ایک نسخہ قرآن ایسا نہیں ملا جو دوسرے نسخوں سے متن میں، ترتیب میں، اعراب میں، الفاظ میں غرض کسی اعتبار سے مختلف ہو۔

کیا قرآن کا اختلافی نسخہ ممکن ہے؟

اس مرحلے پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ بعض مسلمان مؤرخین کے مطابق حضرت عثمان کے دورِ خلافت کے زمانے میں قرآن مجید کے کچھ نسخوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ یہ قرآن مختلف تھے۔ اور آج ہمیں جو ایک قرآن ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ تمام اختلافی نسخے جلا دیئے گئے۔ اور پھر ایک قرآن رائج کر دیا گیا۔ میں آگے چل کر

شاید اس مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کروں۔ لیکن اس وقت تاریخ دانوں کے اقوال اور اطلاعات پر بحث کرنے کی بجائے، عقلی بنیادوں پر صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر قرآن کے اختلافی نسخے ہوتے تو کسی کے جلانے سے ان کا ختم ہو جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ قرآن مجید کسی مسجد میں رکھا ہوا ایک نسخہ نہیں تھا بلکہ اس کی نقول ڈھیروں مسلمانوں کے پاس ذاتی ملکیت کی حیثیت سے محفوظ تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر قرآن رکھنے والا اپنے قرآن ہی کو اللہ کی کتاب سمجھتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کا اصل نسخہ وہی تھا جو ان کے پاس موجود تھا۔ اب ذرا صورت حال کا تصور کیجیے کہ حکام کا ایک فرمان پہنچتا کہ جس کے پاس قرآن مجید کا کوئی نسخہ ہے وہ اسے نذر آتش کر دے یا حکومت کے حوالے کر دے تا کہ وہ اسے جلا دے۔ تو اس وقت کے مسلمانوں کی دین اور قرآن کے متعلق حساسیت دیکھتے ہوئے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس حکم کو تسلیم ہی نہ کیا جاتا۔ ہمیں تو ایسی روایات بھی ملتی ہیں کہ اگر حضرت عثمان نے کسی آیت میں اپنی رائے سے کام لے کر ایک واؤ کا اضافہ کرنا چاہا تو ابی بن کعب لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ جو مسلمان حکومت کے اصرار کے باوجود قرآن میں ایک لفظ کی تحریف گوارا نہ کریں وہ بھلا حکومت کے کہنے پر اپنے پاس موجود قرآن کا جلایا جانا کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اور اگر دو چار، دس بیس حکومت کے دباؤ میں آ کر مان بھی جاتے تو کوئی نہ کوئی مختلف نسخہ کبھی نہ کبھی ضرور منظر عام پر آ جاتا۔ ذرا بائبل اور انجیل کے حالات پر نظر ڈالیے۔ عہد نامہ قدیم ہو یا جدید، دونوں کے ساتھ یہی صورت پیش آئی۔ بائبل کو ایک رکھنے کے لئے یہودیوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن اگر سنہ ۱۰۰ء کا کوئی ایک نسخہ بحیری مردار کے کنارے سے ملا تو وہ آج کی بائبل سے مختلف تھا۔ اگر قمران کے غاروں سے انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے ملے تو وہ آج کے رائج صحیفوں سے مختلف تھے۔ انجیل کے بارے

میں دیکھیے کہ یروشلم کی کانفرنس میں چار انجیلوں کو منتخب کر کے باقی تمام ضائع کر دی گئیں۔ اس وقت عیسائیوں کی کل تعداد بمشکل چند سو افراد تھی اس کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان لوگوں کے پاس کسی بھی انجیل کے کتنے نسخے رہے ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو یا تین۔ لیکن آج بھی برنا باس کی، سینٹ ٹامس کی انجیلیں موجود ہیں قرآن مجید تو ہزاروں مسلمانوں کے پاس موجود تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ علمی روشنی کی صبح ہو جانے کے بعد جاگتی دنیا کے دور میں قرآن حکیم کے اختلافی نسخے ہوتے اور آج ہم ان کو دریافت کرنے میں ناکام رہتے۔ گویا قرآن مجید دنیا کی واحد مذہبی دستاویز ہے کہ اسے جس شکل میں متعارف کرایا گیا، اسی شکل میں اپنے مکمل متن کے ساتھ محفوظ بھی ہے اور موجود بھی ہے۔

قرآن مجید عوامی کتاب ہے

اب آیئے قرآن مجید کی ایک اور غیر معمولی انفرادی خصوصیت پر نظر ڈالیں۔ ہمیں سابقہ کتابوں کی ایک اور مشترکہ صفت یہ نظر آتی ہے کہ وہ کتابیں صرف مخصوص لوگوں کے گروہ میں چند افراد کے ہاتھوں میں محدود رہیں۔ ہندوؤں کی کتابیں صرف پنڈتوں کے لئے تھیں۔ عام لوگوں کا مقدس ویدوں کا پڑھنا تو درکنار، اگر معاشرے کے نچلے طبقے کے کان میں اس کے الفاظ پڑ جاتے تو ان کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ بائبل کا عہدنامہ عتیق بھی صرف ایک طبقے میں محدود رکھا گیا۔ صرف وہ گیت عام لوگوں تک پہنچ پاتے جن کو اہل مذہب روزمرہ کی عبادات میں پڑھا کرتے۔ انجیل کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا رہا۔ اہل ہندوستان کی زبان پالی ہوگئی لیکن وید بدستور سنسکرت ہی میں رہے۔ اس دوران سنسکرت زبان ہندوستانی معاشرے میں ایک اجنبی زبان بن

چکی تھی۔ چنانچہ تیسری صدی عیسوی میں جب گوتم بدھ نے تبلیغ شروع کی تو ان کے لئے عوام سے رابطہ کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ وہ سنسکرت کی بجائے پالی زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنائیں۔ بائبل کے حالات اور زیادہ خراب تھے۔ تیرہویں صدی کے ابتدائی زمانے میں پوپ انوسنٹ سوم (Innocent III) کے حکم سے بائبل کا پہلا جرمن ترجمہ جمع کر کے جلا دیا گیا۔ رومن کیتھولک چرچ نے اس بائبل کے رکھنے کے جرم میں بہت سے لوگوں کو جیل میں ڈالا، کوڑے مارے اور موت کی سزا تک دی۔ سنہ 1452-55ء میں پہلی مرتبہ لاطینی بائبل کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا گیا۔ جس کو گوتھن برگ بائبل (Guthenberg Bible) کہا جاتا ہے۔ جب اس کا ترجمہ ٹنڈیل (Tyndale) نامی پروٹسٹنٹ انگریز نے انگریزی زبان میں کیا اور وہ بھی پورا نہیں، عہد نامہ عتیق کا جزوی، اور انجیل کا پورا، تو اسے گرفتار کر کے، بدعتی قرار دے کر برسلز کے نزدیک اکتوبر 1536ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ یہ تو سولہویں صدی میں جب مارٹن لوتھر نے کیتھولک چرچ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور جرمن زبان میں سنہ 1521ء میں بائبل کا ترجمہ کیا تو رفتہ رفتہ چرچ بھی مجبور ہوا کہ وہ بھی کتاب مقدس کو عوام الناس تک پہنچائے۔

ان کتابوں کے برعکس قرآن مجید کی داستان بالکل مختلف ہے۔ اسے اپنے نزول کے فوراً بعد خواص کی بجائے، عوام کے سپرد کر دیا گیا۔ بلکہ یہ حیران کن حقیقت ہے کہ ہمیں ماضی میں کسی کتاب کو عوام تک پہنچانے کا وہ اہتمام نظر نہیں آتا جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہے۔

سب سے پہلا انتظام تو یہ تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض نبوت میں قرآن کی تلاوت کو سرفہرست رکھا گیا۔ یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے پہلا کام ہی یہ تھا کہ وہ

لوگوں تک قرآن پہنچا دیں اور پھر قرآن کی تعلیم ایک اور فریضہ قرار پائی۔ یعنی قرآن کا متن اور اس کے معنی دونوں کو نسل انسانی تک پہنچانا خود اس کی ذمہ داری تھی جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔

پھر تبلیغ رسالت کا بنیادی ذریعہ ہی قرآن مجید قرار پایا۔ حضورؐ کا طریقۂ تبلیغ یہ تھا کہ آپ کفار کے سامنے جا کر قرآن کی تلاوت کرتے۔ کبھی خانہ کعبہ میں تلاوت کی جاتی، کبھی دو چار آدمیوں کا اجتماع ہوتا تو وہاں تلاوت کی جاتی۔ کبھی آیات قرآنی لکھ کر خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کر دی جاتیں۔ حتیٰ کہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیارؓ نے جب اسلام کا تعارف کرایا تو وہ بھی قرآن کی تلاوت سے کرایا۔ غرض دنیا والوں تک اسلام قرآن ہی کے ذریعے پہنچ رہا تھا اور کفار کا یہ حال تھا کہ قرآن کی حیران کر دینے والی تاثیر دیکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ لوگوں تک قرآن نہ پہنچنے پائے۔ غرض اپنے نزول کی ابتداء سے ہی قرآن مؤمن و کافر، ہر شخص تک پہنچ رہا تھا۔ اور مؤمن و کافر ہر ایک کے لئے موضوع بحث بنا ہوا تھا۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایمان والوں کے لئے قرآن اللہ کے احکام سے باخبر ہونے کا ذریعہ تھا اور کفار کی اسلام کے خلاف ساری علمی جنگ قرآن ہی کے خلاف تھی یعنی اسلام کی مخالفت کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ اسلام لانے والوں پر مظالم ڈھائے جائیں اور دوسری صورت یہ تھی کہ اسلام کو اعتراضات کا نشانہ بنایا جائے۔ اب اعتراضات کے لئے ایک صورت تو یہ تھی کہ آنحضورؐ کی شخصیت اور کردار پر اعتراضات کیئے جائیں۔ لیکن چالیس سال سے زیادہ مدت میں شب و روز کے مشاہدے نے کردارِ رسولؐ نے اپنی عظمت کا اس طرح لوہا منوالیا تھا کہ کافر آپؐ کی شخصیت پر کسی اعتراض کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب لے دے کر ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ بحث مباحثے کا سارا شوق قرآن

پر اعتراضات کر کے پورا کیا جائے اب ان کے اعتراضات قرآن کا تو کیا بگاڑتے لیکن ہوا یہ کہ اعتراض کرنے کے لئے قرآن سے آگاہ ہونا ضروری ہو گیا۔ اس طرح، اب چاہے ایمان لاتے یا نہ لاتے لیکن کافر تک قرآن سے آگاہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔

قرآن مجید کو مسلمانوں تک پہنچانے کا نظام بھی ابتدائے اسلام سے قائم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب بھی کوئی سورۃ یا آیت نازل ہوتی، اسے بلا تخصیص ہر مسلمان تک پہنچا دیا جاتا۔ مکہ کے انتہائی ناسازگار ماحول میں بھی یہ اہتمام حیران کن باقاعدگی سے جاری و ساری رہا۔ آپ کو تاریخ سے ڈھیروں ایسی شہادتیں مل جائیں گی۔ حضرت عمر کے ایمان لانے کی روایت میں ان کی بہن اور بہنوئی کے پاس قرآن کے اجزاء موجود تھے۔ حضرت عمارؓ نے اپنے والد یاسر اور والدہ سمیہ کو قرآن کی تازہ ترین آیات سنا کر اسلام لانے پر آمادہ کیا تھا۔ مدینے سے جب بارہ آدمیوں نے مکہ آ کر اسلام قبول کیا تو ان کو اس وقت تک نازل ہونے والا قرآن دے کر واپس مدینہ بھیجا گیا کہ وہاں کے لوگوں کو قرآن سنائیں۔ غرض آنحضورؐ قرآن کو مسلمانوں تک پہنچانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ ہونے دیتے۔

قرآن کو پڑھنے اور سنانے کے ساتھ ساتھ اس کو تحریر کرنے کا کام بھی مکہ ہی میں شروع کیا گیا۔ مؤمن اور منافق غرض ہر لکھ پڑھ سکنے والے سے قرآن کی کتابت کرائی گئی۔ سب سے کتابت اس لئے کرائی گئی کہ غیر بھی اس کی عبارت کے ایک ہونے کی گواہی دے سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپ سال میں ایک مرتبہ کاتبوں، حافظوں اور عام مسلمانوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے۔ سالِ وفات میں آپ نے یہ عمل دو مرتبہ دہرایا۔

قرآن کے اجزاء کو زبانی یاد کر کے ہر نماز میں پڑھنا لازمی قرار دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اجازت دی گئی کہ ہر نمازی سورۂ حمد کے علاوہ دو رکعتوں میں جو سورہ چاہے پڑھے۔ نماز کا پڑھنا ہر بالغ مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کو جزوی طور پر حفظ کرنا ہر مسلمان کی ضرورت بن گیا اور کسی مسلمان کے لئے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ قرآن سے آگاہ ہوئے بغیر مسلمان رہ سکے۔

پھر قرآن کا دیکھنا، سننا اور پڑھنا باعث ثواب قرار دیا گیا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ قرآن کے الفاظ کو دیکھنے اور سننے پر اس لئے زور دیا گیا کہ اگر کوئی مسلمان پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو تب بھی قرآن کے الفاظ سے شناسا ہو جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی الفاظ اگر کسی نامناسب مقام پر پڑے ہوں تو پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود اگر اس پر کسی مسلمان کی نظر پڑ جاتی ہے تو فوراً اٹھا کر کسی مناسب جگہ پر رکھ دیتا ہے۔ مسلم معاشرے میں رہنے والی بہت سی بڑی بوڑھیاں ان پڑھ ہونے کے باوجود کسی بچے کو غلط قرآن پڑھتے سنتی ہیں تو فوراً ٹوک دیتی ہیں۔

دوسری طرف قرآن نے بار بار کفار کو للکارا کہ اگر تم اسے خدا کا کلام نہیں سمجھتے تو اس کا جواب تیار کرو۔ کبھی کہا گیا کہ اگر انسانی کلام سمجھتے ہو تو اس کی دس سورتوں کا ہی جواب دے دو۔ پھر کہا گیا کہ دس سورتوں کا جواب مشکل نظر آتا ہے تو جاؤ کسی ایک سورۃ کا جواب ہی لے آؤ۔ اب کفار سے قرآن کا جواب تو کیا ممکن ہوتا۔ لیکن بار بار کے چیلنج نے کافروں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ قرآن پڑھیں اور اس پر غور کریں۔ کیونکہ یہ واضح بات ہے کہ اگر کوئی شخص کسی تحریر کا جواب دینا چاہے گا تو پہلے اس تحریر کو پڑھے گا، اس پر غور کرے گا، اس کے معنی اور مفہوم سے آگاہی حاصل کرے گا، پھر جواب دینے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح قرآن مجید صرف دوستوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اپنے بدترین

دشمنوں کے لئے بھی ایک جانی پہچانی چیز بن گیا۔

قرآن مجید کو عام کر دیئے جانے کی یہ انتہا تھی کہ خود حضورؐ کے سامنے یہ دعوی کر دیا گیا کہ ہمارے لئے قرآن ہی کافی ہے۔ یہ دعویٰ اپنی جگہ کتنا ہی غلط ہو، اور اس قول کے کہنے والے کے، یہ دعویٰ کرتے ہوئے مقاصد کچھ بھی ہوں، لیکن اس دعوے نے کم از کم یہ واضح کر دیا تھا کہ قرآن مجید ایک ایسی دستاویز تھا کہ اس تک ہر مسلمان کو براہ راست رسائی حاصل تھی۔

غرض متن کو اتنا عام کر دیا گیا کہ وہ پوری نوع بشر کی ملکیت بن گیا۔ کسی فرد واحد کا اس پر اجارہ نہ رہا۔ کوئی جماعت، کوئی ایک گروہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ قرآن صرف ہمارے پاس ہے۔ صرف ہم اس کے مالک ہیں۔ قرآن سب کے پاس تھا، سب کی ملکیت تھا۔

حفاظت کتاب کا منفرد طریقہ

قرآن مجید کا خواص تک محدود نہ رہنا اور اس کا عوامی ملکیت بن جانا، قرآن کی ایک ایسی منفرد خصوصیت تھی کہ اس صفت میں دنیا کی کوئی کتاب قرآن کی شریک نہیں تھی۔ بلکہ میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ دنیا میں پہلی مرتبہ اسلام نے حفاظت کا ایک نیا طریقہ متعارف کرایا۔ اسلام سے پہلے کسی بھی حفاظتی نظام کا بنیادی اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ کوئی قول، کوئی تحریر اسی وقت تک محفوظ رہ سکتی ہے جب تک اسے صرف خواص تک محدود رکھا جائے۔ لیکن وقت کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا گیا کہ جو تحریر جتنے کم لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی قدر تحریف اور تبدیلی کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ سابقہ کتابوں کو محدود ہونے ہی کی قیمت اس طرح ادا کرنی پڑی کہ ان میں سے

ایک بھی ردوبدل سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسلام نے قرآن کے معنی اور مفہوم کی حفاظت کے لئے جو طریقے اختیار کیئے وہ مختلف تھے لیکن اس سے پہلے قرآن کے الفاظ یا قرآن کے متن کی حفاظت کا ایک بالکل نیا اصول اپنایا گیا اور وہ اصول یہ تھا کہ کتاب خدا کو اتنا عام کر دیا جائے کہ کوئی فرد، کوئی جماعت، کوئی دور، کوئی زمانہ اس کو نقصان پہنچانے کا تصور تک نہ کر سکے۔ اور اگر کوئی دیوانہ اس قسم کا ارادہ رکھتا بھی ہو تو اس کی کامیابی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عام ہونے سے قرآن کیسے محفوظ ہوگیا۔ تو پہلے یہ دیکھ لیں کہ محفوظ ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ قرآن محفوظ ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی زبان سے پڑھنے والا اسے غلط پڑھ نہیں سکتا، کوئی لکھنے والا اسے غلط لکھ نہیں سکتا اور کوئی چھاپنے والا اسے غلط چھاپ نہیں سکتا۔ اگر حفاظت کا یہ مطلب لیا جائے تو قرآن ہرگز محفوظ نہیں ہے کیونکہ یہ تو سب کچھ ہوتا ہے۔ پڑھنے والے تلاوت میں غلطی کرتے ہیں۔ لکھنے والے کتابت میں غلطی کرتے ہیں۔ تو حفاظت کا کیا مطلب ہوا؟ تو گزارش یہ ہے کہ کسی تحریر کی حفاظت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک معیاری اور مستند تحریر موجود ہے جس سے مقابلہ اور موازنہ کر کے کسی بھی نقل کے درست یا غلط ہونے کا پتہ چلایا جا سکتا ہو۔ قرآن کی حفاظت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اگر کوئی پڑھنے میں غلطی کرے یا لکھنے میں اس سے بھول چوک ہو جائے تو اسے بتایا جا سکے کہ تم نے کیا غلطی کی ہے بلکہ یوں کہیے کہ جب کوئی غلط قرآن بیان کرتا ہے، یا لکھتا ہے، یا پڑھتا ہے تو اسے ٹوک دیا جاتا ہے کہ تم نے غلط پڑھا۔ یہ ٹوک دیا جانا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں، ایک معیاری قرآن، ایک اسٹنڈرڈ قرآن موجود بھی ہے اور محفوظ بھی ہے۔

اور یہاں ایک اور حقیقت۔ جو دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی۔ چودہ سو سال

سے قرآن مجید کے پڑھنے یا لکھنے میں کوئی معمولی سی غلطی، محض زیر یا زبر کی غلطی بھی پکڑ لی جاتی ہے۔ لیکن آج یا اس سے پہلے کسی مقام پر کوئی ایسا قرآن نہیں ہے جسے بحفاظت اس غرض سے رکھ دیا گیا ہو کہ کسی جگہ قرآن کی نقل تیار کرتے ہوئے کسی غلطی کا شبہ ہو جائے تو محفوظ شدہ قرآن کی مدد سے مشکوک قرآن کی اصلاح کر لی جائے معیار یا اسٹنڈرڈ نام کا کوئی قرآن نہ ہوتے ہوئے بھی قرآن محفوظ ہے۔ کہیں کوئی سند نہ ہوتے ہوئے بھی قرآن کا متن ایک ہی رہتا ہے۔ آج کا بڑے سے بڑا عالم دین ایک طرف، بعد رسولؐ، صحابہ کی جماعت میں، تابعین کے گروہ میں، کسی محترم سے محترم، عالم سے عالم شخصیت کو بھی یہ اختیار نہیں ملا کہ وہ قرآن کی کسی آیت کو قرآن سے خارج کر سکے یا قرآن میں کچھ شامل کر سکے۔ یہ نہیں کہ ایسی کوشش نہیں ہوئی۔ ہوئی اور بار بار ہوئی۔ لیکن کوئی کہتا رہے کہ فلاں لفظ یا آیت قرآن کا حصہ نہیں ہے یا فلاں لفظ یا آیت کو قرآن میں شامل کیا جانا چاہیے، لیکن وہ مسلمان جو عہد اول کے مسلمانوں کی کہی ہوئی ہر بات کو فوراً قبول کر لیتا ہے، قرآن میں اضافے، کمی، تحریف، ترمیم کے عنوان سے کسی کی بات پر یقین کرنے کے لئے ذرہ برابر تیار نہیں۔ اور... ایک اور صرف ایک قرآن پر کامل یقین، یہ پختہ ایمان، اس عالم میں ہے کہ دنیا میں کہیں کوئی مستند قرآن موجود نہیں ہے۔

میں اپنی بات کو اور واضح کر دوں۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں بارہا، کبھی وقت، کبھی فاصلے، کبھی وزن کی پیمائش کرنا پڑتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو ناپنے کے لئے ہم نے بہت سے آلات بنا رکھے ہیں۔ وقت کے لئے گھڑی ہے۔ فاصلے کے لئے میٹر ہے۔ وزن کے لئے گرام ہے۔ اب فرض کیجیے۔ معلوم کرنا ہے اس وقت، وقت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھڑی دیکھیں گے۔ لیکن اگر یہ معلوم کرنا تھا کہ گھڑی درست وقت دے رہی ہے یا نہیں، تو اب ریڈیو، ٹی وی یا محکمہ موسمیات سے دریافت کریں گے۔ لیکن اگر ان

کے بتائے ہوئے وقت میں شبہ ہو جائے، یا خود ریڈیو والوں کو اپنی گھڑی کا وقت ٹھیک کرنا ہو تو انگلستان میں لندن کے قریب، گرینچ کے مقام پر، ایک رسدگاہ ہے۔ اس میں ایک گھڑی ہے۔ اس گھڑی کا وقت معیار تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ دنیا میں کہیں کسی کو صحیح وقت کی تصدیق کرنا ہو تو وہ گرینچ اسٹینڈرڈ ٹائم سے تصدیق کرے گا۔ یہی حال فاصلے اور وزن کے پیمانوں کا ہے۔ فرانس میں پیرس کے نزدیک سیور (Sevres) کے مقام پر صفر ڈگری سنٹی گریڈ پر پلاٹینم اور اریڈیم کے آمیزے سے بنی ہوئی ایک سلاخ رکھی ہوئی ہے۔ یہ ایک میٹر ہے۔ اسی طرح اسی آمیزے کا ایک سلنڈر ہے جو ایک کلوگرام ہے۔ اب جسے بھی کسی میٹر یا کلوگرام کی لمبائی یا وزن کی تصدیق کرنی ہو، سیور کے ان معیاروں پر پرکھ لے۔ لیکن قرآن مجید کا کوئی ایسا نسخہ کہیں نہیں ہے۔ مکہ میں، مدینہ میں، کہیں نہیں۔ آج کی بات نہیں۔ پہلے بھی کبھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے آپس کے لاتعداد اختلافات کے باوجود قرآن میں ایک زیر زبر کی غلطی بھی کبھی قابل قبول نہیں رہی۔

یہ اس قدر غیر معمولی بات ہے کہ اس پر جتنا غور کرتے جایئے اسی قدر حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز کا ایک پیمانہ ہے، ایک معیار ہے۔ شاعر کی شاعری ہو، مصور کی مصوری ہو، کسی محقق کی کوئی تحقیق ہو، انسان کی بنائی ہوئی زبان کا کوئی لفظ ہو، کسی لفظ کا کوئی تلفظ ہو، غرض ہر چیز کو درست رکھنے کے لئے، ہر چیز کی تصدیق کے لئے ایک نہ ایک معیار ضروری ہے۔ شاعر کی شاعری کی صحت، اس کی اپنی تحریر، اس کے قلمی نسخے سے پرکھی جائے گی۔ لفظ کے لئے ڈکشنری ہوگی۔ میرے علم میں یہ صرف قرآن کی صفت ہے کہ اس کا معیار کائناتی ہے۔ یونیورسل ہے۔ قرآن اتنی عوامی کتاب ہے۔ کہ اس کے درست یا غلط کو جانچنے کے لئے کسی خاص مستند نسخے کی ضرورت نہیں۔ اس کا معیار کہیں نہیں ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ موجود ہے۔ اس کا ہمیشہ ایک صورت میں

رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنا پیمانہ خود ہے۔ قرآن اس قدر عوامی ہے کہ اس کی ملکیت کا کوئی دعویدار نہ ہوتے ہوئے بھی ہر شخص اس کا مالک ہے، اس کا امین ہے اور یہی عمومیت اس کی حفاظت کی ضامن ہے۔

نزول قرآن

گزشتہ تقاریر میں ہماری گفتگو کا محور و مرکز مجموعی طور پر الہام و وحی کی تاریخ رہا ہے۔ اب تک ہم نے دیکھا کہ اسلام سے پہلے نازل ہونے والی کتابیں یا وہ کتابیں جن کو مختلف مذاہب میں مقدس سمجھا جاتا ہے ان پر زمانے کے مختلف ادوار میں کیا کچھ گزرتا رہا۔ ان تمام کتابوں کے ذکر کے بعد اب ہمارا موضوع گفتگو اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم ہے۔ اور سب سے پہلے ہمیں اس کی تاریخ نزول پر نظر ڈالنی ہے۔ تاکہ پہلے اس کتاب کے نازل ہونے کے متعلق کچھ بنیادی باتیں طے ہو جائیں تو پھر اس کے محفوظ ہونے پر بات کی جا سکے۔

قرآن کا تدریجی نزول

قرآن مجید 23 سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ اس تاریخی حقیقت کو ہر مسلمان تسلیم کرتا ہے۔ اس کی ایک شہادت تو یہی ہے کہ ان 23 سالوں میں بہت سے واقعات ہوئے۔ مثلاً ہجرت ہوئی، بدر و احد و خندق و خیبر و حنین کی لڑائیاں ہوئیں، حدیبیہ کی صلح ہوئی، مکہ فتح ہوا، واقعہ غدیر خم ہوا۔ ان سب واقعات کے بارے میں

قرآن مجید میں آیات موجود ہیں۔ ظاہر ہے، جب جب یہ واقعات ہوتے رہے اس کے بعد ہی ان کے متعلق آیت نازل ہوتی رہی۔ اسی طرح کبھی کفار نے کوئی اعتراض کیا تو اس کے جواب میں آیت نازل ہوئی۔ یعنی پہلے اعتراض ہوا، تب آیت نازل ہوئی۔ کبھی مسلمانوں نے کوئی سوال کیا تو قرآن کی آیت نے جواب دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سوال کے بعد جواب نازل ہوا۔ اس قسم کے تمام حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم تھوڑا تھوڑا کر کے تدریجاً نازل ہوا۔

پھر قرآن مجید نے خود بھی اپنے تدریجی نزول کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوا:

﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾۔ (سورۂ بنی اسرائیل، ۱۷، آیت ۱۰۶)

اور قرآن کو ہم نے جزو جزو نازل کیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے بتدریج نازل کیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے کہا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے اعتراض کیا گیا تھا کہ اس سے پہلے تو انبیاء پر نازل ہونے والی کتابیں ایک مرتبہ میں ہی نازل ہو جاتی تھیں۔ قرآن کے سلسلے میں یہ سنت الٰہی بدل کیوں گئی۔ اس اعتراض کے جواب میں قرآن نے اپنے تدریجی نزول کا سبب یہ بتایا کہ اسے تھوڑا تھوڑا اتار کر لوگوں کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَ رَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾۔ (سورۂ فرقان، ۲۵، آیت ۳۲)

ہم نے اسے تدریجاً پڑھا ہے۔

گویا تاریخ سے بھی اور قرآن کی داخلی شہادتوں سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے چھوٹے چھوٹے اجزاء کی صورت میں تدریجاً اعلانِ نبوت سے پیغمبر

اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال تک کے عرصے میں نازل ہوا۔

قرآن کا یکبارگی نزول

اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں ہی کئی مقامات پر بہت ہی واضح الفاظ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ قرآن ایک ہی مرتبہ، یکبارگی نازل ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ﴾۔ (سورۃ القدر ۹۷ آیت ۱)

ہم نے اسے (یعنی قرآن کو) قدر کی رات میں نازل کیا۔

﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾۔ (سورہ دخان ۴۴ آیت ۳)

ہم نے اسے مبارک رات میں نازل کیا۔

اور اس کے بعد یہ بھی بتایا کہ وہ قدر والی رات کس مہینے کی رات تھی۔ چنانچہ سورہ بقرۃ میں ارشاد ہوا:

﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ﴾۔

(سورۃ البقرہ ۲، آیت ۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا۔

ان تینوں آیات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول رمضان کے مہینے کی ایک رات کو ہوا اور پورا قرآن ایک ہی مرتبہ میں نازل ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ تاریخی اور واقعاتی شہادتوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا ہوا۔ اور خود قرآن کی کچھ آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ دوسری طرف قرآن ہی یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ اس کا نزول ایک رات میں ہو گیا۔ تو کیا اس صورت حال سے یہ اندازہ لگایا جائے کہ نعوذ باللہ قرآن مجید میں تضاد بیانی ہے۔ یا پھر اس ظاہری اختلاف کا

کوئی ایسا جواز ہے جو مسئلے کو حل کر سکے؟

پہلا حل:۔ رمضان آغاز نزول ہے

ظاہر ہے کہ آج جس مسئلہ کی طرف ہماری نظر اٹھ رہی ہے اس پر آج سے پہلے بھی توجہ دی گئی ہوگی۔ اور یقیناً کوئی حل بھی تلاش کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ ماضی میں قرآن کے مفسرین نے اس بات پر غور بھی کیا اور اس کی وضاحت بھی کی۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ کہی گئی کہ درحقیقت رمضان میں آنے والی شب قدر میں پورا قرآن نازل نہیں ہوا۔ بلکہ اس رات قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ اور سورہ بقرہ میں جو لفظ قرآن آیا ہے وہ بطور مجاز مرسل استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی جیسے ہم کہیں کہ زید کتاب پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ زید ایک وقت میں پوری کتاب نہیں پڑھ سکتا۔ وہ کتاب کا کوئی جزو ہی پڑھ رہا ہوگا۔ گویا کتاب کہنے سے پوری کتاب نہیں بلکہ اس کا جزو مراد ہے۔ اسی طرح رمضان میں، یا شب مبارکہ میں، یا شب قدر میں قرآن کے نازل ہونے سے پورا قرآن مراد نہیں بلکہ اس کی صرف وہ آیات مراد ہیں جن سے قرآن کے نزول کا آغاز ہوا۔

لیکن قرآن مجید رمضان میں جس قرآن کے نازل ہونے کا ذکر کر رہا ہے اس سے مراد پورا قرآن نہیں بلکہ اس کا کوئی جزو ہے تو یہ اعزاز تو سال کے ہر مہینے کو حاصل ہے کہ ان میں سے ہر مہینے میں قرآن کی کوئی نہ کوئی آیت نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ شرف صرف رمضان کو کیوں دیا گیا کہ اس کے لئے خصوصیت سے کہا گیا کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہوا۔

پھر صرف یہی نہیں کہا گیا کہ ہم نے رمضان میں قرآن نازل کیا بلکہ یہ بھی بتایا گیا کہ اس قرآن کی کچھ صفات بھی ہیں۔

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾۔

(سورۃ البقرہ،۲،آیت ۱۸۵)

یعنی رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا، وہ قرآن جو روشن دلیل ہے، جو ہدایت ہے راستہ بتانے والا ہے اور حق و باطل کا فرق واضح کرنے والا ہے۔

اب یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے نازل ہونے والی وحی، وہ پانچ آیات ہیں جو آج سورہ علق کی ابتداء میں موجود ہیں۔ ان پانچ آیتوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ ان پانچ آیتوں میں اللہ کے کچھ انعامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجیے کہ ان آیات میں اللہ کی کچھ صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیتیں معرفت الٰہی کا پہلا سبق ضرور ہیں لیکن ان کو روشن دلیل، ہدایت، راہنما اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والا کہنا ایک ایسا دعویٰ ہوگا جس کی کوئی دلیل نہیں ہوگی۔ یہ صفات تو مکمل قرآن ہی پر صادق آتی ہیں۔ ماہِ رمضان میں نازل ہونے والی سورہ علق کی صرف پانچ آیات پر نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات۔ سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کی تاریخ نزول میں یا وحی کے آغاز کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔ جہاں برادرانِ اہل سنت کے اکثر علماء نے یہ کہا ہے کہ نزول قرآن کا آغاز ماہ رمضان کی کسی تاریخ کو ہوا، وہاں کچھ علمائے اہل سنت (مدارج النبوت، عبدالحق محدث دہلوی) نے یہ بھی کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی ماہ رجب کی ستائیس تاریخ کو نازل ہوئی۔ دوسری طرف اہل بیت اطہار علیہم السلام سے نقل کی گئی روایات میں کئی حوالوں سے یہ خبر دی گئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت رجب کی 27 تاریخ کو ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ بعثت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ سے

پس اللہ کا پیغام پہنچا اور آپ کو کارِ رسالت شروع کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے وحی نازل ہوئی۔ اہل بیت کی اس روایت کے بعد اب کسی اور امکان کی گنجائش ہی نہیں رہتی ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نزول قرآن کا آغاز رجب کے مہینے میں ہوا۔ اور اس طرح رمضان میں نزول کی ابتداء کا نظریہ بالکل ناقابل قبول ہو جائے گا۔

دوسرا حل:۔ دو نزول، بیت معمور اور قلب رسولؐ پر

چنانچہ اس مسئلے کا ایک اور حل نکالا گیا۔ ایک روایت عبداللہ ابن عباس سے نقل کی گئی کہ قرآن دو مرتبہ نازل ہوا۔ ایک مرتبہ تو عرش سے یا لوح محفوظ سے چوتھے آسمان پر، بیت معمور میں نازل ہوا۔ دوسری مرتبہ اجزاء کی صورت میں بیت معمور سے قلب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترتا رہا۔ اس طرح قرآن میں جہاں پورے قرآن کے ایک ساتھ نازل ہونے کا پورا بیان ہے تو اس سے بیت معمور پر نزول کی طرف اشارہ ہے اور جہاں ترتیل کے ساتھ نازل ہونے کی بات کی گئی ہے وہاں قلب رسولؐ پر نزول کی بات کی گئی ہے۔ اس روایت کو ہمارے علماء میں شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب اعتقادیہ میں بھی نقل کیا ہے۔ علماء نے اس روایت پر دو علمی اعتراض کئے ہیں۔ ایک تو یہ روایت احادیث سے ہے۔ یعنی صرف ایک راوی سے ہم تک پہنچی ہے اس لئے صرف اس روایت کی بنیاد پر کوئی اہم نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ دوسرا اعتراض شیخ مفید علیہ الرحمہ نے کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ روایت تمیں قرآن کے قدیم یعنی ثابت ہونے کے غیر عقلی نظریے کی طرف لے جاتی ہے۔

خیر یہ تو صاحبان علم کی باتیں ہیں۔ وہ جو کچھ فرماتے ہیں اپنے مقام اور مرتبے سے فرماتے [illegible] ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کو کوئی چیز [illegible] اور عصمت سے

خالی نہیں ہوتا۔ تو آخر اس میں کیا مصلحت تھی کہ قرآن کو لوح محفوظ سے اتار کر چوتھے آسمان پر رکھ دیا جائے۔ کیا قرآن اتنا وزنی تھا کہ اسے یکبارگی اتارنا ممکن نہ تھا۔ آخر جو ذرائع اسے لوح محفوظ سے اتار سکتے تھے وہ فرش زمین تک بھی لے آتے۔

بات کو واضح کر دوں۔ نزول قرآن کی حکمت کیا تھی؟ آخر کیوں نازل ہوا قرآن؟ سورہ دخان میں ارشاد ہوا

إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ

قرآن اس لئے نازل ہوا کہ یہ لوگوں کو بے راہروی سے ڈرائے۔

اور سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا کہ یہ کتاب اس لئے نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو ہدایت کرے، ان کے لئے برہان بنے، ان کو راستہ دکھائے اور انہیں نیک و بد کا فرق بتائے۔ تو یہ کتاب تو نوع انسان کی ہدایت کے لئے ہے اور یہ اپنا مقصد تب ہی پورا کر سکتی ہے جب انسانوں تک پہنچے۔ چرخ چہارم پر ملائکہ کے ہجوم میں یہ کتاب بالکل بے مقصد ہے۔ وہاں نازل کرنا بغیر کسی مصلحت اور حکمت کے ہوگا۔ اور بے مقصد عمل کو اللہ سے نسبت دینا صریحاً غلط ہوگا۔

پھر ایک اور بات غور طلب ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جہاں جہاں قرآن کے یکبارگی اتارنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں وہاں ساتھ ساتھ کسی خاص وقت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ دو مقامات پر ارشاد ہوا کہ یہ نزول رات کے وقت ہوا۔ ایک جگہ فرمایا گیا کہ قرآن رمضان کے مہینے میں اتارا گیا۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دن اور رات زمین کے اپنے محور پر گردش کرنے کا نتیجہ ہے۔ اور رمضان زمین کے گرد چاند کی گردش سے آتا ہے۔ چرخ چہارم پر نہ زمین ہے نہ چاند۔ چنانچہ وہاں نہ رات ہے نہ رمضان۔ تو وہاں قرآن کسی رات میں یا رمضان میں کیسے نازل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ عالم

بالا میں تو دن رات نہیں لیکن بات تو دنیا والوں سے ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ جس وقت بیت معمور میں قرآن اترا اس وقت تمہاری دنیا میں رات تھی۔ تو اس جواب سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس وقت رات تھی تو کہاں رات تھی۔ دنیا میں تو کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب یہاں کے کسی نہ کسی مقام پر رات نہ ہو۔ اور کہیں نہ کہیں دن نہ ہو۔ تو اب اگر کسی واقعہ کے رونما ہونے کا دنیاوی وقت بتانا ہو، خاص طور پر جب واقعہ دنیا سے باہر ہوا ہو تو جیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ رات کو ہوا اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات دن کے وقت ہوئی۔ یہ تو بالکل غیر مناسب ہوگا کہ اسی وقت رات بھی ہو اور دن بھی، ان میں سے رات کو تو بڑی منزلت والی، بڑی برکتوں والی قرار دیا جائے اور دن کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن چاہے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہو یا پورا نازل ہوا ہو، ہر صورت میں یہ واقعۂ نزول ہماری دنیا سے تعلق رکھتا ہے عالم بالا سے نہیں۔

میں تو کہوں گا کہ لوح محفوظ سے قرآن کو بیت معمور میں لانے کی ضرورت تو تب ہوتی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسائی لوح محفوظ تک نہ ہوتی۔ فریقین کی روایت ہے کہ ڈھائی سال کی عمر میں جب ایک مرتبہ امام حسن علیہ السلام نے کچھ اتنی بڑی بڑی باتیں کیں کہ سننے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ اس پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیران کیوں ہوتے ہو میرا فرزند زمین پر بیٹھ کر لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے۔ اب انصاف کیجیے کہ نبی کا نواسہ تو بچپنے میں لوح محفوظ کو پڑھتا ہو اور نانا نبی ہو کر لوح محفوظ پر لکھا ہوا قرآن نہ پڑھ سکے؟

بیت معمور کیا ہے

اب آیئے مسئلے کو ایک اور زاویہ سے دیکھیں۔ قرآن کے اپنے ارشاد سے ہم

نے یہ نتیجہ نکالا کہ قرآن دو مرتبہ اترا۔ اور فرض کیجیے کہ روایت اتنی مستند ہے کہ اس سے انکار کی کوئی صورت نہیں کہ قرآن کے دو مرتبہ کے نزول میں ایک منزل کا نام بیت معمور ہے۔ تو اب اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ روایت میں بیت معمور کا محل وقوع نہیں بتایا گیا۔ تو اس کے تعین کے لئے یا تو ہمیں کسی اور روایت کا سہارا لینا پڑے گا، یا پھر غور وفکر سے مدد لے کر اس بیت کو تلاش کرنا پڑے گا۔

لغت کے اعتبار سے بیت کے معنی ہیں گھر۔ اور معمور کے معنی ہیں آباد۔ یعنی بیت معمور کے معنی ہیں آباد گھر۔ قرآن مجید میں یہ ترکیب، یعنی دو الفاظ کا یہ مجموعہ، صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن کی باونویں سورہ، طور میں پانچ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان پانچ قسموں میں سے ایک قسم بیت معمور کی بھی ہے۔ کوہ طور کی قسم اور کھلی ہوئی کتاب کی قسم جو ایک ورق لطیف پر لکھی ہوئی ہے۔ اور قسم ہے بیت معمور کی چونکہ یہاں قسم کھانے کے علاوہ بیت معمور کی کوئی اور تفصیل بیان نہیں کی گئی اس لئے اس لفظ کے معنی کے لئے ہمیں انحصار کرنا پڑتا ہے روایات پر۔ اور روایات یہ بتاتی ہیں کہ بیت معمور چوتھے آسمان پر ایک مقام ہے۔ جو ملائکہ کے لئے خانۂ کعبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ستر ہزار فرشتے روزانہ وہاں حاضری دیتے ہیں۔ اور اللہ کے فرشتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک مرتبہ اس مقام پر حاضری دینے والوں کی دوسری مرتبہ باری نہیں آتی۔ چونکہ اس جگہ فرشتوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے اور ان کی آمد و رفت سے ہر لحظہ چہل پہل رہتی ہے اس لئے اسے آباد گھر یا بیت معمور کہا جاتا ہے۔

اب اگر یہ مقام اس لئے آباد مقام ہے کہ یہاں ہر وقت فرشتوں کا اژدہام رہتا ہے تو ایسے مقام تو دنیا میں بھی ہیں کہ جہاں ہر وقت ملائکہ جمع رہتے ہیں۔ جن روایات سے ہمیں بیت معمور میں فرشتوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے انہی روایات میں یہ بھی ملتا

ہے کہ کربلائے معلیٰ میں روزانہ ستر ہزار فرشتے قبر حسینؑ کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ اتنے ہی فرشتے وہاں آنے والے زائرین کے لئے دعا میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اتنے ہی فرشتے مقرر ہیں جن کا کام زائرین کے ہاتھ پیر سے لگی ہوئی نجاستوں کو دور کرنا ہے۔ اب اگر بیت معمور کو صرف اس لئے بیت معمور کہا جاتا ہے کہ وہاں فرشتوں کا ہجوم ہے تو یہ ہجوم تو کربلا میں بھی ہے، اسے بھی بیت معمور کہا جا سکتا ہے۔ اس مقام کو تلاش کرنے کے لئے چوتھے آسمان پر ہی کیوں جایا جائے۔ زمین کا معاملہ زمین ہی پر کیوں نہ حل کیا جائے۔

آیئے اس لفظ کو ایک اور زاویئے سے دیکھیں۔ اس مقام کی قسم اللہ نے کھائی ہے اور اللہ ہی اس جگہ کی یہ صفت بیان کر رہا ہے کہ یہ معمور ہے۔ آباد ہے۔ اب جب ہم کسی جگہ کو آباد کہتے ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اس جگہ بہت سے انسان رہتے ہیں۔ جنگل میں ہزاروں جانور، لاکھوں کروڑوں حشرات الارض رہتے ہیں لیکن وہ ہمارے نزدیک ویرانہ ہے۔ اس لئے کہ وہاں انسان نہیں رہتا۔ لیکن اللہ کے نزدیک ہم کیا اور ہماری آبادی کیا؟ جس کا ایک ''کن'' کائنات کے گوشے گوشے کو مخلوق سے بھر دے اور جس کا ایک اشارہ ہر وجود کو عالم فنا میں پہنچا دے، اس کے لئے ستر ہزار کیا ستر کروڑ فرشتے بھی آبادی نہیں ہوگی۔ اللہ کے نزدیک تو آباد مقام وہی ہو سکتا ہے جہاں نور الٰہی کی جلوہ نمائی ہو۔ وہ آباد کہے گا تو عرش معلیٰ کو آباد کہے گا، جلوہ گاہ طور کو آباد کہے گا۔ اور سب سے زیادہ اس دل کو آباد کہے گا جو معرفت الٰہی کے نشہ سے سرشار ہو، جو جمال الٰہی سے ہمہ وقت منور ہو، جو جلوہ گاہ آیات الٰہی ہو، جو قرب الٰہی میں قاب قوسین او ادنیٰ کی منزل پر ہو۔ چنانچہ کیوں نہ صاف لفظوں میں کہہ دوں کہ اللہ کی بنائی ہوئی کائنات میں قلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ آباد کوئی مقام نہیں۔ چنانچہ جب اللہ بیت معمور کی قسم کھائے گا تو یہ قلب محمدؐ کی قسم

ہوگی۔ اور جب وہ قرآن کو کسی بیت معمور میں اتارے گا تو یہ مقام قلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقام ہوگا۔ اور جب قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی بیت معمور قرار پایا تو الجھن دور ہوگئی اور صورت حال واضح ہوگئی۔ چنانچہ اب قرآن کے نزول کے لئے ہمیں یہ ماننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ قرآن دو مرتبہ نازل ہوا اور دونوں مرتبہ قلب رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہوا۔

سورۂ قدر سے استدلال

اور اب ہم چاہیں تو اس بات کو سورۂ قدر سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ سورۂ قدر میں اس رات کا تذکرہ ہے جس رات قرآن نازل ہوا۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ وہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ اس رات ملائکہ اور جبرئیل نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کے احکام اور امور کو لاتے ہیں۔ اور یہ رات سلامتی ہی سلامتی ہے۔ حتیٰ کہ صبح طلوع ہو جاتی ہے۔ اس وقت سورہ قدر پر تفصیلی بحث مقصود نہیں۔ صرف ایک روایت سن لیجیے۔ ہمارے لئے تو حکم ہے کہ ہم زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ سہی شب قدر کی تلاش کریں۔ لیکن خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان کے لئے ہر شب، بلکہ ہر لمحہ شب قدر ہے۔ یعنی ذاتِ پیغمبرؑ کے حوالے سے سورہ قدر کا مفہوم یہ ہوا کہ آپ کا ہر لمحہ نزول کا لمحہ ہے، آپؐ کا اپنے رب سے ہر آن تعلق قائم رہتا ہے، آپؐ کا ہر لمحہ ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ آپؐ کے پاس ہر گھڑی جبریل اور ملائکہ نازل ہوتے رہتے ہیں، اور آپ تک اللہ کے احکام پہنچتے رہتے ہیں، اور آپ کے قلب کے لئے ہر آن سلامتی ہی سلامتی ہے، حتیٰ کہ صبح یا فجر طلوع ہو جاتی ہے۔ یہ فجر نتیجہ ہے ہزاروں ملائکہ، احکامِ الٰہی اور سلامتی کے نزول کا۔ یعنی اب جو صبح طلوع ہوگی وہ پیغامِ الٰہی کو نسل انسانی تک پہنچانے

سے شروع ہوگی۔ اس صبح سے انسانیت کے قلب و دماغ کی تاریکیاں دور ہوں گی۔ جب تک پیغام خداوندی نہاں خانۂ قلب رسالتؐ میں مستور تھا۔ جب تک اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک محدود تھی اس وقت تک شب تھی۔ اور بڑی محترم شب، بڑی مبارک شب، بڑی قدر والی شب۔ اس لئے کہ یہ رازِ الٰہی کی، پیغام الٰہی کی، امین شب تھی۔ اور جب یہ پیغام عام ہوگیا، جب امانت الٰہی خاص و عام تک پہنچا دی گئی تو انسانیت کے افق پر ہدایت کی صبح طلوع ہوگئی۔

سورۂ قدر کے اس ارشاد کی روشنی میں اللہ کا کلام دو طریقوں سے نازل ہوا۔ ایک شب قدر میں دوسری مرتبہ طلوع فجر، یعنی اعلانِ رسالت کے بعد۔ جب شب قدر میں نازل ہوا تو پورا قرآن ایک ساتھ نازل ہوا۔ اور جب اعلانِ رسالت کے بعد نازل ہوا تو حالات اور ضرورت کے مطابق ۲۳ سال کے دوران تھوڑا تھوڑا نازل ہوا۔ لیکن دونوں مرتبہ مقام نزول ایک ہی منزل، یعنی قلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا۔ فرق یہ تھا کہ جب شب قدر والا نزول ہوا تو لب و لہجہ بھی رازدارانہ تھا۔ براہ راست قلب رسالتؐ کا نام لینے کی بجائے بیت معمور کہہ کر اس کی صفت کے ذریعے ذکر کیا گیا اس طرح بات کی مناسبت سے الفاظ کے انتخاب کا حسن بھی ظاہر ہوگیا اور عظمت رسالتؐ کا یہ گوشہ بھی نمایاں ہوگیا کہ آپ کا دل تجلیات الٰہی سے اس طرح آباد ہے کہ زبانِ قدرت اسے بیت معمور کا خطاب دیتی ہے۔

قرآن کے دو مرتبہ نزول کا مقصد

اب سوال یہ ہے کہ ایک ہی قرآن کو، ایک ہی ذات پر دو مرتبہ کیوں نازل کیا گیا۔ تو اس بات کی وضاحت کے لئے ایک مثال کا سہارا مناسب ہوگا میں پاکستان

میں اپنے گھر میں تھا۔ ایک دن ایک ٹیلی فون آیا۔ سنا تو لندن سے قیصر زیدی صاحب بول رہے تھے۔ کہنے لگے: آپ کو ایک زحمت دینی ہے۔ پوچھا: وہ کیا۔ فرمایا: آپ کو اس سال لندن میں محرم کی مجالس پڑھنی ہیں۔ یکم سے بیس محرم تک ادارہ جعفریہ میں۔ میں نے پوچھا اور کچھ۔ کہنے لگے: جی ہاں ان بیس مجلسوں کے علاوہ بھی ممکن ہے چار پانچ اور تقریریں بھی کرنی پڑیں۔ میں نے پوچھا: بس یا اور کچھ۔ کہنے لگے بس میری بات مکمل ہوگئی۔ اب میں نے پوری طرح غور کیا۔ اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ اپنی مصروفیات پر نظر دوڑائی۔ پھر یہ بھی دیکھا کہ اپنی علمی بے بضاعتی کے عالم میں چوبیس پچیس تقریریں کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ غرض پوری طرح غور کرنے کے بعد میں نے وعدہ کرلیا کہ انشاء اللہ حاضر ہو جاؤں گا۔ بات مکمل ہوگئی۔ کچھ دن گزرے۔ قیصر صاحب کا پھر فون آیا۔ کہ اب آپ برٹش ہائی کمشنر کے دفتر سے ویزہ لے لیجیے۔ ایک دن پھر فون آ گیا کہ ہم نے آپ کا ٹکٹ بھیج دیا ہے۔ ایئر لائن سے وصول کرلیں۔ پھر ایک اور فون آ گیا کہ اپنے لندن پہنچنے کی تاریخ سے مطلع کیجیے۔ غرض جب تک میں لندن پہنچ نہیں گیا، قیصر صاحب کے ٹیلیفون میری راہنمائی کے لئے آتے رہے۔ اب کیا مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ آپ نے جس دن پہلی مرتبہ دعوت دی تھی اس دن تو یہ کہا تھا کہ آپ کی بات مکمل ہوگئی۔ پھر یہ بعد کے ٹیلی فونوں کے کیا معنی؟ اگر خدانخواستہ میں نے یہ سوال کر دیا ہوتا تو زیدی صاحب ایک مرتبہ تو ضرور پچھتاتے کہ میں نے کس ناسمجھ کو دعوت دی ہے اور ان کا پچھتاوا بالکل حق بجانب ہوتا۔ اس لئے کہ جب انہوں نے دعوت دی تھی تو میرے تمام فرائض بتا دیئے تھے۔ اور اس اعتبار سے ان کی بات یقیناً مکمل تھی اور بعد کے ٹیلیفون بھی ضروری تھے کیونکہ وہ جزئیات تھیں کہ جن کے جانے بغیر میرے لئے اپنی ذمہ داری پوری کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور بعد کی باتیں کوئی نئی باتیں نہیں تھیں۔ جب انہوں نے لندن آنے کے لئے کہا تھا تو اس

میں یہ بات شامل تھی کہ ویزہ لینا ہوگا۔ جب انہوں نے بلایا تھا تو اس میں یہ بات شامل تھی کہ ٹکٹ وہ بھیجیں گے۔ غرض بعد کی تمام باتیں پہلے پیغام ہی کا حصہ تھیں۔

مثال ذرا طویل ہوگئی۔ کہنا یہ ہے کہ جب کسی کے سپرد کوئی بڑا کام کوئی مہم کی جاتی ہے تو اسے پہلے ہی مرحلے پر یہ بتا دیا جانا ضروری ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تاکہ ایک طرف کام کرنے والا اپنا لائحہ عمل بنا لے، اپنا طریق کار طے کر لے۔ دوسری طرف وہ اپنے کو پرکھ لے، اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح جانچ لے کہ وہ کام کر سکتا بھی ہے یا نہیں۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد انسانیت کی ہدایت کا کام تھا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ کام سپرد کرتے ہوئے پہلے، ابتدا ہی میں یہ بتا دیا جائے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تمہاری منزل کہاں ہے۔ اس کے بعد جب فرض ادا کیا جانے لگے، جب لوگوں تک پیغام پہنچایا جانے لگے تو حسب ضرورت تفصیلات بتائی جاتی رہیں۔ چنانچہ قرآن دو مرتبہ نازل ہوا۔ پہلی مرتبہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے فرائض بتانے کے لئے، ان کو ان کے مشن سے آگاہ کرنے کے لئے۔ بعد میں ان فرائض کی تفصیل بتائی جاتی رہیں۔ دونوں ہی سلسلے قرآن تھے۔ لیکن پہلا نزول قرآن صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہوا۔ دوسرا نزول پوری انسانیت کے لئے ہوا پہلا قرآن پیغام الٰہی کا خلاصہ تھا، نچوڑ تھا، روح تھا۔ دوسرا قرآن پہلے قرآن کی تفصیل تھا، پہلے قرآن کا جسم تھا، اس کی شرح تھا۔ پہلا قرآن صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے لئے تھا کہ وہ اپنا لائحہ عمل ترتیب دے لیں۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کرنا ہو اس کا انتخاب کر لیں۔ اور جب حصول مقصد کا کام شروع ہو گیا تو پیغام کی تفصیلات آنے لگیں پہلا قرآن اس زبان میں، اس لب و لہجے میں کہ جو صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھنا تھا، اس لئے صرف اشارے کئے گئے۔ ایسے اشارے جو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے گئے تھے۔ جنہیں وہ اپنے علم کے بلند مقام پر سمجھ سکیں۔ لیکن دوسروں کے لئے عام انسانوں کے لئے ان کا سمجھنا مشکل تھا۔ پھر دوسرا قرآن اس لہجے میں، اس زبان میں آیا جو سب کی سمجھ میں آجائے جو قرآن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر ان کے لئے نازل ہوا وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کافی تھا۔ لیکن ہماری ہدایت کے لئے ناکافی تھا۔ یہ وہ قرآن تھا کہ جس کے لئے ارشاد ہوا کہ اگر ہم اسے پہاڑوں پر نازل کرتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ اس لئے اب اس قرآن کی ضرورت تھی جسے ہم برداشت کر سکیں، جس کا ہم بوجھ اٹھا سکیں۔ چنانچہ جبرائیل آتے اور اللہ کا پیغام سناتے کہ ہم نے تم پر جو قرآن نازل کیا ہے اس کے فلاں جزو کو ان الفاظ میں لوگوں تک پہنچا دو پہلا قرآن ایک رات میں بھی نہیں، ایک لمحہ میں نازل ہوا۔ دوسرا قرآن ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔

پہلے قرآن کی مصلحت یہ تھی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کی اہم مہم شروع کرنے سے پہلے جان جائیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ کس راہ سے گزرنا ہے۔ کس منزل پر پہنچنا ہے۔ راستہ بتانے والا اگر منزل پر پہنچنے سے پہلے اس سے واقف نہ ہو تو وہ راہنمائی کر ہی نہیں سکتا۔ کام کے آغاز سے پہلے کام کے مقصد سے آگاہ نہ ہو تو کبھی ایک کام کرے گا کبھی دوسرا۔ اس میں کچھ اقدام غلط ہوں گے کچھ درست ہوں گے۔ لیکن جب مقصد واضح ہو، انجام سامنے ہو تو جو کچھ کیا جائے گا، سوچ سمجھ کر، پوری ذمہ داری کے ساتھ، پوری منصوبہ بندی کے ساتھ چنانچہ سردار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک لڑی میں پرونے کے لئے، ان کی تمام کوششوں کو ایک سمت میں رکھنے کے لئے، ان کے ہر عمل کو مقصد سے قریب ترین رکھنے کے لئے اعلان نبوت سے پہلے ایک مرتبہ حقیقت قرآن کو اپنے رسولؐ تک پہنچانا ضروری تھا۔

اس کے بعد انسانیت کی بھلائی کا وہی پیغام جب انسانیت کے لئے آنا شروع

ہوا تو اسے اگر ایک ساتھ اتارا جاتا تو انسان اسے سمجھ ہی نہ پاتا۔ نہ اس پر عمل کر پاتا۔ کیونکہ انسانیت میں بہت سی بری باتیں تھیں جنہیں ترک کرنا ضروری تھا۔ بہت سی نئی باتوں کو سیکھنا تھا۔ بہت سے غلط نظریات اس کے ذہن میں جگہ بنا چکے تھے۔ انہیں نکالنا تھا۔ بہت سی سچائیاں تھیں جن کو ذہن میں بٹھانا تھا۔ اب اگر ایک ہی مرتبہ تمام برائیوں کو چھوڑنے کا حکم آ جاتا، تمام خیالات کو بدلنے کا فرمان آ جاتا، تو ان پر عمل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اللہ انسان اور اس کی فطرت کا خالق تھا۔ انسان تو کسی ایک عادت کو آسانی سے نہیں چھوڑ پاتا، وہ بھلا اپنی پوری شخصیت کو اچانک کیسے بدل سکتا تھا۔ چنانچہ ایک ایک کر کے برائی چھڑائی گئی۔ ایک ایک کر کے اسے اچھی باتیں سکھائی گئیں۔ عقائد کی دنیا میں اسے سب سے پہلے کہا گیا کہ وہ ایک اللہ پر ایمان لے آئے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ پھر بتایا گیا کہ جو یہ بات بتا رہا ہے وہ خدا کا فرستادہ ہے۔ اللہ کا رسولؐ ہے۔ اس کے بعد ایک اور سبق دیا گیا کہ اس دنیا کی زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔ اس دنیا میں تمہارا عمل جیسا ہوگا اس کے مطابق ہی تمہاری دوسری زندگی ہوگی۔

عمل کی دنیا میں تو ایک ہی سانس میں سب کچھ سکھا دینا بالکل ہی بیکار ہوتا۔ اس لئے کہ اگر کوئی ماننے اور سمجھنے پر آمادہ ہو تو اسے ایک ہی نشست میں سارے عقائد سارے نظریات بتا دیئے جانے کا امکان ہے۔ لیکن ساری زندگی کے اعمال کا سبق نہ تو ایک مرتبہ میں دیا جا سکتا ہے نہ اس تعلیم کا کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ مثال عرض کر دوں۔ شراب ہر حرام چیز کی طرح ہمیشہ سے حرام تھی۔ لیکن عربوں نے اسے حلال سمجھ لیا تھا۔ تو جس کام کو حلال سمجھتے تھے وہ ان کی معاشرت میں ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت سے گہری جڑیں پکڑ چکی تھیں۔ اب اگر انہیں ایک دم سے بتا دیا جاتا کہ شراب حرام ہے اور خبردار اسے استعمال نہ کرنا تو اول اس حکم پر عمل ہی دشوار ہوتا، اور اگر کچھ صاحبان ایمان حکم الٰہی

کے سامنے سر جھکا بھی دیتے تو ان کا ذہن، اور اس سے بڑھ کر ان کی عادت ضرور ان کو بغاوت پر اکساتی رہتی۔ اس لئے پہلے غور و فکر کی دعوت دے کر خیالات میں تبدیلی سے کام شروع کیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ شراب میں فائدے بھی ہیں لیکن اس کے نقصان فائدے سے کہیں زیادہ ہیں اب تک اسے صرف ایک اچھی چیز سمجھا جاتا تھا۔ اب نئے زاویے سے غور شروع ہوا تو برائیاں بھی سامنے آنے لگیں۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔ ارشاد ہوا دیکھو اگر شراب پی ہو۔ نشہ طاری ہو تو نماز پڑھنے نہ کھڑے ہو جانا۔ اب احساس ہوا کہ شراب اتنی بری چیز ہے کہ اس سے تعلق ہو تو اپنے خالق سے، اپنے معبود سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ جب برائی واضح ہوگئی تو پھر اگلا قدم اٹھایا گیا۔ کہ کہ شراب حرام ہے۔ اس کا استعمال ممنوع کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک برائی کو تین مرحلوں میں ختم کیا گیا۔ پہلے برائی کا احساس دلایا گیا، پھر جزوی ترک کر کے، ترک کرنے کی مشق کرائی گئی۔ پھر مکمل ترک کا حکم دیا گیا۔

اس طرح اچھی باتوں کا معاملہ ہے۔ پہلے صبح کی نماز فرض کی گئی۔ واقعہ معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوگئیں۔ ہجرت کے بعد جمعہ کی نماز بھی ہونے لگی۔ کچھ اور وقت کے بعد عیدوں کی نمازیں، آیات کی نمازیں، اور جنازے کی نماز بھی فرض ہوگئی۔

غرض یہ کہ رسولؐ کی ضرورت تھی کہ پوری مہم کے مراحل ایک ہی دفعہ بتا دیئے جائیں اور امت کی ضرورت تھی کہ ان کو بتدریج تعلیم دی جائے۔ چنانچہ قرآن دو مرتبہ نازل ہوا۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لئے نازل ہونے والا قرآن ایک شب کے ایک لمحے میں نازل ہوگیا۔ اور امت کا قرآن 23 سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ... اب ایک جملہ معترضہ حضرت علی علیہ السلام کے لئے ایک روایت ہم تک پہنچی کہ آپ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت ایک پیر رکاب میں رکھتے تو قرآن شروع کرتے اور دوسرا پیر دوسری رکاب

میں نہیں جاتا تھا کہ قرآن ختم ہو جاتا۔ اب عقل عقل کا نعرہ لگانے والوں نے شور مچایا کہ یہ تو محض مبالغہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا بڑا قرآن اتنی کم مدت میں ختم کر دیا جائے۔ اتنے عرصے میں تو قرآن کی سب سے چھوٹی سورہ یعنی سورۂ وثر بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ میں عرض کروں گا کہ آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر۔ لیکن پہلے معلوم تو کر لیجیے کہ یہ کون سا قرآن ہے۔ 23 سال میں نازل ہونے والا، یا ایک لمحے میں نازل ہونے والا؟ شہر علم تھے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اور علی علیہ السلام تھے اس شہر کا دروازہ۔ تو شہر میں جو کچھ آیا دروازے سے گزر کر آیا۔ اس لئے علی علیہ السلام اس قرآن سے بھی واقف جو ۲۳ سال میں آیا۔ اور اس سے بھی واقف جو ایک لمحے میں آیا۔ اب حیران ہونے والی کیا بات ہے کہ اگر علی علیہ السلام آپ کے سامنے کریں تو آپ والے قرآن کی تلاوت کریں۔ اور جب وقت اجازت نہ دے تو ہر لحہ عبادت میں گزارنے والے علی علیہ السلام اس قرآن کی تلاوت کریں جو جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نازل ہوا تھا۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ۲۳ سال میں نازل ہونے والے قرآن کی تلاوت کے لئے تو مدت درکار ہے۔ لیکن جو قرآن ایک لمحے میں نازل ہوا ہو یقیناً اس کی تلاوت بھی ایک لمحے میں ہو سکتی ہے۔

اور ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی یاددہانی کہ کار رسالت کی عظمت کا تقاضا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مقصد بعثت سے، اپنے مشن سے، اپنی منزل تبلیغ سے، آغاز کار سے پہلے پوری طرح آگاہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونے والے قرآن میں ہمیں کوئی تضاد کوئی اختلاف نظر نہیں آتا اس طرح 63 سال کی حیات ظاہری میں کردارِ رسالتؐ میں کوئی تضاد، کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلانِ رسالت سے پہلے کی زندگی ہو یا اعلانِ رسالت کے بعد کی زندگی ہو۔ اور پھر قرآن میں اور کردارِ رسالتؐ میں بھی کوئی تضاد، کوئی اختلاف نہیں

ہے۔ قرآن کردار رسالت کی لفظی تصویر ہے اور کردار رسالت قرآن کی عملی تشریح ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کو ہم تک پہنچانے سے پہلے اس سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

راہنما کو دوسروں کو راستہ دکھانے سے پہلے خود راستے کے پیچ وخم سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ قائد کے لئے دوسروں کی قیادت سے پہلے اپنی منزل سے خود باخبر ہونا لازمی ہے یہی وجہ تھی کہ جسے اسلام پہنچانا تھا، اسے ابتداء سے ہی اس کے پورے نصب العین سے باخبر کر دیا گیا، اور جسے اسلام بچانا تھا، اسے اس کے مقصد سے آگاہ کر دیا گیا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا کہ حسین علیہ السلام کی ولادت ہو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی شہادت کا ذکر شروع کر دیں۔ اور جیسے جیسے حسین علیہ السلام بڑے ہوتے جائیں ذکر کربلا بڑھتا جائے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہم سب کو ایک دن موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن کوشش ہوتی ہے کہ موت کا ذکر کم سے کم ہو۔ آخر زندگی کو ایک تلخ انجام کے تصور سے کیوں اندوہناک بنایا جائے۔ حسین علیہ السلام کو جام شہادت پینا تھا تو کیا ضروری تھا کہ ہر آن آنے والے مسائل کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا؟ اس کی مصلحت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ حسین علیہ السلام ابتداء سے ہی انتہا کی تیاری شروع کر دیں۔ اور اپنی منزل تک پہنچنے کیلئے زادِ سفر جمع کرنا شروع کر دیں۔ اور حسین علیہ السلام کا زادِ سفر اشیاء نہیں تھیں بلکہ کردار تھے اور عظیم کردار ایک دن میں وجود میں نہیں آتے اس کے لئے تو حسین علیہ السلام کو اپنی پوری زندگی صرف کرنی تھی۔ اسی لئے نانا نے نواسے کی ولادت کے فوراً بعد اس کی منزلِ حیات کا پتہ دے دیا تھا۔

* * * * *

حفاظتِ قرآن : ٦

شب قدر میں نازل ہونے والا قرآن

قرآن حکیم کے نزول پر بات کرتے ہوئے، سلسلۂ کلام اس منزل پر ہے کہ قرآن مجید کی کچھ آیات کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید ایک محترم اور مبارک رات میں، ایک بار میں، نازل ہوا۔ دوسری طرف قرآن مجید ہی کے کچھ اور ارشادات کی روشنی میں، اور پھر تاریخ کی انتہائی واضح شہادتوں سے، ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن کا نزول، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت بعثت سے، آپ کے وصال تک، 23 سال کی مدت میں، بتدریج چار چار، پانچ پانچ آیات کی صورت میں لگاتار ہوتا رہا۔ اس طرح قرآن حکیم کے دو نزول ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ سمجھنے کی بھی کوشش کی کہ ایک کتاب کو دو مرتبہ نازل کرنے کا سبب کیا ہے۔ چنانچہ ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اعلانِ رسالت سے پہلے، پیغامِ الٰہی کو نوع انسانی تک پہنچانے کے لئے، اپنا پورا لائحہ عمل ترتیب دے لیں۔ اور اس کے بعد دوسری مرتبہ قرآن، تمام انسانیت کی تعلیم و تربیت کے لئے اس طرح بتدریج اترا کہ اسلام قبول کرنے والوں کو اسلام کے تقاضے سمجھ میں بھی آجائیں، اور عمل کے میدان میں ان کو اپنی غلط باتوں اور ناپسندیدہ عادتوں کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کرنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو۔

قرآن کے دو مرتبہ نازل ہونے کی مصلحت جان لینے کے بعد، ایک سوال باقی رہتا ہے کہ آج ملت اسلامیہ جس قرآن کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے، یہ تو وہ قرآن ہے جو دوسری مرتبہ، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا تھا۔ لیکن وہ قرآن جو ایک مرتبہ میں نازل ہوا تھا، جو صرف اللہ کے رسولؐ کے لئے مخصوص تھا، جو پورے کا پورا ایک ہی شب میں نازل ہوا تھا، ہم اس قرآن سے بھی واقف ہیں یا نہیں۔ اور کیا ہم بھی اس قرآن سے کوئی استفادہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اگر ہم اس قرآن سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو وہ قرآن کہاں ہے۔ ہم اس سے واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہی ہے کہ اس قرآن کو بھی ہمارے پاس موجود ہونا چاہیے۔ اس کے موجود ہونے کا یہی ایک جواز کافی ہے کہ اگر وہ قرآن ہمارے درمیان موجود نہ ہو، ہم اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں، تو پھر بار بار اس کا تذکرہ ہی کیوں کیا جائے؟ وہ قرآن اگر خدا اور اس کے رسولؐ کے درمیان ایک راز تھا تو اس راز کو راز ہی رہنے دیا جاتا۔ ہمارے سامنے اس کا بیان ہی کیوں کیا جائے۔ قرآن مجید تاریخ کی کتاب تو ہے نہیں کہ جو واقعہ کبھی ہوا ہے اس کا تذکرہ ضرور کیا جائے۔ یہ تو کتاب ہدایت ہے۔ یہ تو رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔ اس میں موجود ہر لفظ، ہر بات انسانیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عقل کہتی ہے کہ اگر اس قرآن کا بار بار ذکر کیا گیا ہے، تو اس تک ہماری رسائی بھی ممکن ہے، اور ہم اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ بلکہ آگے بڑھ کر کہوں کہ اگر اس قرآن کی طرف ہمیں بار بار متوجہ کیا گیا ہے تو اس سے ہمارا فائدہ اٹھانا ممکن بھی ہوگا اور ضروری بھی ہوگا۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ہم اس قرآن کے معنی اور مفاہیم کو اس حد تک نہ سمجھ سکیں جس طرح جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے واقف اور آگاہ تھے۔ یعنی ہم اسے سمجھ تو سکیں، لیکن اس حد تک نہیں کہ اس سے پورے قرآن کے تمام مطالب

اور احکامات کو اخذ کر سکیں۔ ہم اس حد تک اپنی استعداد، اپنے ظرف، اپنی صلاحیت کے مطابق فائدہ تو اٹھا سکتے ہوں لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ یہ گمان کریں کہ ہمارے لئے یہی قرآن کافی ہے۔ اور ہم نے اسے جتنا سمجھا ہے، اس میں بس یہی کچھ تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

پہلے نازل ہونے والے قرآن کو پوری طرح سمجھنے کا امکان تو تب ہو جب ہم اس قرآن کو پوری طرح سمجھنے میں کامیاب ہو چکے ہوں جو ہمارے لئے نازل ہوا تھا۔ جب کہ اس قرآن کو سمجھنے میں ہماری استعداد اور صلاحیت پر قرآن حکیم یوں تبصرہ کرے کہ ''اس (قرآن) میں کچھ تو محکم آیتیں ہیں، جو ام الکتاب ہیں۔ یعنی مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، اور کچھ متشابہ ہیں۔ تو وہ جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ حالانکہ اس حصہ کی صحیح تاویل، یا اللہ جانتا ہے اور یا پھر وہ جانتے ہیں جو راسخون فی العلم ہیں۔'' (آل عمران ۳، آیت ۷) تو جو قرآن ہمارے لئے آیا، جسے اللہ نے آسان قرار دیا، اسی کو پوری طرح سمجھنا ہمارے لئے ممکن نہیں، تو اس قرآن کو کیا سمجھ پائیں گے جو خاص اشرف الانبیاء، فخر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نازل ہوا تھا۔ لیکن اس قرآن کا بار بار تذکرہ کیئے جانے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آنحضورؐ پر نازل ہونے والا قرآن ہمارے درمیان موجود بھی ہے اور ہم بقدر ظرف اس سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ دریا کی وسعتیں اپنی جگہ پر، اس سے کون کون، کتنا کتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے، یہ بھی اپنی جگہ پر، لیکن ایک پیاسی چیونٹی یہ چاہے کہ پورے دریا کو پی جائے تو یہ چیونٹی کی حماقت ہوگی۔ لیکن اگر وہ دریا کی نمی پر بھی اپنا منہ رکھ دے تو اس کی پیاس ضرور بجھ جائے گی۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر، خود ان کے لئے نازل ہونے والا قرآن، ذات پیغمبرؐ کے لئے معنی و مطالب کا ایک بحر ذخار ہوگا۔ ہم اس سمندر کی تہہ تک نہ

پہنچ سکیں، نہ سہی، لیکن اس میں اس قدر عام فہم اجزاء ضرور موجود ہوں گے جو ہر طلبگار معرفت کی پیاس بجھا سکیں۔

قرآن کے دو غیر معمولی مقامات

تو آیئے ہم اپنی توفیق اور انتہائی محدود استعداد کے مطابق اس قرآن کو پہچاننے کی کوشش کریں گے جو شب قدر میں، ایک آن میں، نازل ہوا قرآن مجید میں دو مقامات ایک خاص حوالے سے غیر معمولی ہیں۔ پہلے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دوں، پھر یہ بھی عرض کر دوں کہ ان میں قرآن مجید کے دوسرے اجزاء کے مقابلے میں غیر معمولی بات کیا ہے۔

سورۂ علق کی پانچ آیات

چنانچہ پہلا مقام سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ اس بات پر سب مفسرین متفق ہیں کہ غارِ حرا میں حضرت جبرائیل علیہ السلام جب پہلی مرتبہ اللہ کا پیغام لے کر آئے تو یہ پیغام صرف پانچ آیات پر مشتمل تھا۔

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾۔ (سورۂ علق، ۹۶، آیات ۱ تا ۵)

ان پانچ آیت میں اللہ کی حمد بیان ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک حکم دیا گیا ہے۔ حکم تو یہ ہے کہ پڑھنا شروع کر۔ اور حمد یہ ہے کہ اس رب کے نام سے جو پیدا کرنے والا ہے۔ جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا۔ اس کے نام سے پڑھ کہ جو

انتہائی کرم والا ہے۔ اس کے نام سے کہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم عطا کیا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو انسان نہیں جانتا تھا۔ اب ہم ایک سورہ توبہ کے علاوہ، قرآن حکیم کی کسی سورۃ کی بھی تلاوت کریں تو سب سے پہلے جزو سورہ سمجھتے ہوئے بسم اللہ پڑھتے ہیں۔ اس بسم اللہ میں ایک عمل کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ شروع کر رہا ہوں، پڑھنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد اللہ کی صفات بیان ہوتی ہیں کہ اس اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ اس کے بعد ہمیں جو کچھ پڑھنا ہوتا ہے اسے پڑھتے ہیں۔ اب اگر سورۂ علق کی ان پانچ آیات کو دیکھیں تو یہ بھی بسم اللہ ہیں۔ وہاں بسم اللہ ہے، یہاں باسم رب ہے۔ وہاں شروع کرنے کے اعلان کے ساتھ اللہ کی دو صفات کا بیان ہے، یہاں پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔

اب یہاں تک تو دونوں بسم اللہ میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں میں شروع کرنے کا ارادہ، اور دونوں میں حمد الٰہی۔ لیکن اس کے بعد فرق پیدا ہوگیا۔ اور وہ یہ کہ جب ہم بسم اللہ پڑھتے ہیں تو اس کے فوراً بعد کچھ اور بھی پڑھتے ہیں۔ بسم اللہ پڑھی ہی اس لئے جاتی ہے کہ ہمیں کچھ اور بھی پڑھنا ہے۔ لیکن دوسری طرف، سورہ علق کی پانچ آیات پر مشتمل بسم اللہ تو نازل ہوگئی لیکن اس کے ساتھ نہ کوئی آیت نازل ہوئی، نہ کوئی سورہ اتری۔ ممکن ہے ان پانچ آیتوں کے ساتھ حضرت جبرائیل علیہ السلام کوئی تختی، کوئی لوح، کوئی تحریر لائے ہوں۔ جسے سامنے رکھ کر کہہ رہے ہوں کہ اسے اپنے خالق کے نام سے پڑھو، اس صاحب کرم کے نام سے جو ایک لوتھڑے کو شکل انسانی عطا کر دیتا ہے۔ اس کے نام سے جو انسان کے لئے قلم کے ذریعہ نامعلوم کو معلوم بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی تحریر تھی تو روایات میں اس کا ضرور ذکر ہوتا۔ اور خاص طور پر تیز نگاہ اور تیز سماعت رکھنے والے راوی نے مکالمۂ رسولؐ و جبرائیلؑ سن لیا، جسم لطیف رکھنے والے فرشتے کو قلم کی

بجائے قوت کے ذریعہ تعلیم دیتے دیکھ لیا۔ اس کی نگاہ سے یہ تحریر کیسے بچ سکتی تھی۔ پھر اگر صفحۂ اعجاز پر قلم قدرت سے لکھی ہوئی کوئی تحریر ہوتی، تو اسے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے جناب خدیجہؓ کو، اور بعد میں تمام اہل دنیا کو دکھاتے۔ کیونکہ ایسی کوئی تحریر تو نبوت کی محکم دلیل ہوتی۔ لیکن ایسی کسی تحریر کا کوئی ذکر نہ کبھی زبان رسالتؐ پر آیا، نہ کبھی کسی راوی نے اس کا تذکرہ کیا، نہ کسی مؤرخ نے اس کے وجود کی طرف اشارہ کیا، تو اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان پانچ آیات قرآنی کو قرآن مجید کا ایک غیر معمولی مقام تسلیم کیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ ان آیات میں پڑھنے کا حکم تو دیا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ کیا پڑھنا ہے۔

اس مرحلے پر یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ جب جبرائیلؑ پڑھنے کا حکم الٰہی پہنچا رہے تھے تو یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ جو کچھ پڑھوانا تھا اسے سامنے رکھتے۔ اور اگر وہ کوئی تحریر سامنے رکھے بغیر کہہ رہے تھے کہ ''پڑھیے'' تو اب فطری بات تھی کہ خود آنحضورؐ کی طرف سے پہلا سوال ہوتا کہ کیا پڑھنا ہے۔ .. وہ جو ردِ عمل امام بخاری نے بیان کیا ہے، وہ غیر عقلی اور غیر منطقی ہے کہ آنجنابؐ نے پڑھنے کی فرمائش پر یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے تو پڑھنا نہیں آتا، اس لئے کہ اقراء کے معنی صرف کتاب یا تحریر کو پڑھنا نہیں ہیں، بلکہ کسی سے سن کر بات کو دہرانا بھی قرأت ہے، اور حافظے میں موجود عبارت کو زبان سے دہرانا بھی قرأت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیدائشی نابینا کبھی قاری قرآن نہ کہلاتے چنانچہ جب جبرائیلؑ نے حکم اقرأ پہنچاتے ہوئے کوئی تحریر سامنے نہ رکھی تو اس کا سبب یہی تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اس کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ پیغام کا مطلب کیا ہے اس سے اسے نہ غرض تھی نہ یہ اس کے دائرۂ اختیار میں تھا۔ اور جو حضورؐ نے نہیں پوچھا کہ کیا پڑھنا ہے تو اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اچھی طرح واقف تھے کہ منشائے الٰہی کیا ہے اور ان کو کیا پڑھنا

ہے۔

دوسرا مقام:۔سورۃ الحمد

اب آیئے قرآن مجید کے ایک اور غیر معمولی مقام پر نظر ڈالیں۔لیکن پہلے قرآن مجید کے اندازِ بیان کے متعلق ایک بات تمہیداً سن لیجیے۔

قرآن حکیم، از ابتدا تا انتہا، بائے بسم اللہ سے والناس کے سین تک، مکمل طور پر خدا کا کلام ہے۔ اپنے اس کلام میں اللہ نے کئی مقامات پر مخلوق میں سے کسی فرد کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا ذکر بھی کیا ہے۔کبھی کسی نبی نے اپنی قوم سے کچھ کہا، کبھی کسی پیغمبر نے دعا مانگی، کبھی فرعون نے موسیٰ سے کچھ کہا، کبھی موسیٰ نے فرعون کو جواب دیا، کبھی شیطان نے اللہ کو جواب دیا، کبھی کسی چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے بات کی۔ اللہ نے اپنے کلام میں اس طرح کے کلامِ مخلوق کو جگہ دی۔ اسی طرح کئی مقامات پر اللہ نے کوئی بات اپنی مخلوق سے کہلوانا چاہی۔کبھی چاہا کہ رسولؐ اپنی قوم سے کوئی بات کہیں، کبھی چاہا کہ بندے اپنے معبود سے دعا مانگیں، کبھی چاہا کہ کفار سے کچھ کہا جائے۔ غرض ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں شامل کی ہیں جو یا تو کلامِ مخلوق ہیں یا ان باتوں کو کلامِ مخلوق بننا ہے۔لیکن ایسے تمام مقامات پر اللہ نے کوئی نہ کوئی ایسا واضح اشارہ رکھ دیا ہے جس سے کلام سنتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ بات خالق مخلوق سے کہہ رہا ہے۔اور یہ بات مخلوق کہہ رہی ہے یا اسے کہنی ہوگی۔قرآن مجید نے جگہ جگہ کہا ہے:''وقال موسیٰ''،''وقال فرعون''،''وقال الذین''،''و اذ قال لقمان''۔یعنی موسیٰ نے کہا، فرعون نے کہا، ان لوگوں نے کہا، پس لقمان نے کہا۔اسی طرح کبھی ارشاد''صابرین الذین قالوا''صابرین وہ ہیں جو کہتے

ہیں۔ اب اس ''قل'' یا ''قالوا'' کے بعد جو بات کہی جائے گی وہ کلام خدا نہیں، بلکہ اس کا کلام ہوگا جس کا نام لیا گیا۔

اسی طرح قرآن حکیم میں بہت سے ایسے جملے ہیں جو اللہ کی طرف سے ادا ہی نہیں ہو سکتے۔ جیسے ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىْ صَغِيْرًا﴾ اے پالنے والے میرے والدین پر اس طرح رحم فرما جیسے میرے زمانہ طفلی میں انہوں نے میری پرورش کی تھی۔ یا ارشاد ہوا: ﴿لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى﴾ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے قربیٰ کی مودت کے۔ اب یہ جملے اللہ نہیں کہے گا۔ نہ اس کے والدین ہیں کہ وہ ان کی بخشش کی دعا مانگے، نہ اس قادر مطلق کو اس کی کسی عطا پر اجر دیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جملے بندے کا قول ہیں۔ تو ایسے تمام جملوں سے پہلے قرآن نے لفظ ''قل'' کہا۔ یعنی یہ بات تم کہو کہ میرے والدین پر رحم فرما۔ اے حبیبؐ یہ آپ فرما دیجیے کہ میرا اجر مودت قربیٰ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ غرض پورے قرآن مجید میں جہاں جہاں کوئی ایسی بات آئی ہے جو اللہ کی بجائے بندے کا کلام ہے وہاں واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ یہ بات اللہ نہیں کہہ رہا بلکہ یہ بندے کا قول ہے۔

اب آیئے قرآن کی سب سے معروف سورۂ الحمد کی طرف۔ ''شروع اس اللہ کے نام سے جو انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تمام حمد و ستائش اسی کے لئے ہے۔ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ وہ روز حساب کا مالک ہے'' ۔ یہ جملے ایسے ہیں کہ چاہیں تو ان کو اللہ کی طرف سے اس کا اپنا تعارف سمجھ لیں اور چاہیں تو انہیں بندے کی زبان سے اللہ کی حمد قرار دے دیں۔ لیکن ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، تجھ سے ہی مدد کے آرزومند ہیں۔ تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے۔ ہمیں اس راستے پر گامزن کر جو تیرے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے اور اس راستے سے دور رکھ جس پر چلنے والے گمراہ قرار

پائے اور تیرے غضب کا نشانہ بنے" یہ تمام گفتگو، یہ تمام دعائیں بندے کی زبان ہی سے ممکن ہیں۔ اور ان جملوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس سے پہلے کی آیات بھی بندے کی ترجمانی کر رہی تھیں۔ گویا پوری سورۂ حمد از اول تا آخر وہ الفاظ ہیں جو عبد کو معبود کی بارگاہ میں عرض کرنے ہیں۔ لیکن اب ایک غیر معمولی بات، کہ ایک طرف تو بتائے بغیر مخلوق کا ایک جملہ بھی نقل نہیں کیا گیا۔ اور یہ پوری سورہ ہے تو بزبان مخلوق لیکن کہیں ایک لفظ نہیں جو اس سورہ کو کلام خالق سے الگ کرے۔ نہ حکم قل ہے کہ ایسا کہو، نہ کہیں لفظ قولوا ہے کہ کچھ لوگ اس طرح کہتے ہیں۔ گویا ظاہر یہ ہوا کہ اللہ اس سورہ کو اپنے بندوں سے پڑھوانا تو چاہتا ہے لیکن کسی وجہ سے اپنی اس منشاء کا اظہار نہیں کرتا۔

اب نتیجہ واضح ہے۔ سورۂ علق میں ایک حکم ہے کہ "پڑھو" لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ کیا پڑھنا ہے۔ اور سورۂ الحمد میں الفاظ بندگی ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ ان کو کون ادا کرے گا۔ تو کیوں نہ دونوں کو ایک دوسرے سے مربوط سمجھا جائے کہ جبرائیل نے آ کر کہا: "اپنے خالق کے نام سے پڑھو" رسولؐ جانتے تھے کہ انہیں کیا پڑھنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پڑھنا شروع کر دیا:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.
اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ. الخ﴾

اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ سورۂ الحمد، سورہ علق کی پانچ آیات سے پہلے نازل ہو چکی ہو۔ اور اس مرحلے پر ہماری رہنمائی خود قرآن حکیم کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی پندرہویں سورہ، سورۃ الحجر کی 87 ویں آیت میں ایک عجیب ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾۔

ہم نے آپ کو سات آیات (پر مشتمل سورہ حمد) دو مرتبہ عطا کیں

اور قرآن عظیم بھی دیا۔

اس آیت سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ سورہ حمد قرآن عظیم کے ہم پلہ بھی ہے اور اس سے الگ بھی ہے۔ اور دوسری یہ کہ سات آیات کی سورہ حمد دو مرتبہ نازل کی گئی۔ دو مرتبہ کے نازل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی مرتبہ سورہ حمد، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف ان کے لئے بطور قرآن کے نازل کی گئی اور دوسری مرتبہ اس کا نزول پورے قرآن مجید کے ایک جزو کی حیثیت سے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے ہوا۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قرآن کے اپنے ارشاد کے مطابق سورہ حمد کا نزول دو مرتبہ ہوا۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ یہ سات آیات قرآن مجید میں دو مرتبہ ہوتیں۔ سورۂ رحمان میں ایک آیت اکتیس مرتبہ نازل ہوئی اور اکتیس مرتبہ ہی دہرائی گئی:

﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾

اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب اللہ کی حکمت اور مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ ایک بات اکتیس بار نازل ہو تو قرآن کے قاری کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس بات کو اکتیس بار ہی پڑھے۔ تو جب سورہ حمد کو دو مرتبہ نازل کیا گیا اور دو مرتبہ نازل کرنا اتنا اہم تھا کہ اس دوہرے نزول کا ذکر بھی ضروری سمجھا گیا تو اسے قرآن میں دو مرتبہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن قرآن کے کسی نسخے کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، سورہ حمد ایک ہی مرتبہ درج ملے گی۔ اس کا سبب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ درحقیقت ان سات آیت کا پہلا نزول قرآن کے جزو کے طور پر نہیں، بلکہ ایک جامع قرآن کی حیثیت سے صرف ذات رسالتؐ کے لئے ہوا تھا۔

یہاں، ہماری رہنمائی وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن میں ارشاد ہوا کہ یہی سبع

مثانی یعنی دومرتبہ نازل ہونے والی سات آیتیں وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ۵۶۰) تفسیر ابن کثیر میں صحاح ستہ کی کئی حدیثوں کے حوالے سے یہ بات صراحت کے ساتھ کہی گئی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی مرتبہ ارشاد فرمایا کہ مجھے عطا ہونے والا قرآن عظیم یہی سورۂ حمد ہے۔ ہمارے ہاں تفسیر مجمع البیان میں اہلبیتؑ کے ماخذوں سے اس حدیث کے علاوہ بھی کئی ارشادات نقل کیے گئے۔ مثلاً اس سورہ کو عطا کرتے ہوئے اللہ نے اسے قرآن کے مقابل قرار دیا۔ یا اس سورہ کی تلاوت کا ثواب پورے قرآن کی تلاوت کے برابر ہے۔ یا یہ سورہ ام الکتاب ہے۔ یعنی قرآن کی جڑ ہے۔ قرآن کی اصل ہے۔ اور امیر المومنین علیہ السلام کے اس ارشاد سے تو بات بالکل صاف ہوگئی کہ جو کچھ پورے قرآن میں ہے وہ سب کچھ تنہا سورۂ حمد میں ہے۔

اور اب یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کی نازل ہونے والی سب سے پہلی آیات کون سی ہیں۔ کیونکہ بعض شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے کہا کہ سب سے پہلے سورہ حمد نازل ہوئی۔ اور اس سلسلے میں روایات کے علاوہ ایک دلیل یہ دی گئی کہ اسلام کا کوئی دور نہ تھا جب نماز نہ ادا کی جاتی ہو۔ اور کوئی نماز ہو ہی نہیں سکتی جب تک سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے۔ چنانچہ اسلام کے روز اول سے سورہ الحمد کا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب سب سے پہلے سورہ الحمد نازل ہوئی ہو (اتقان۔ جلد اول، جلال الدین سیوطی) دوسری طرف ایک بہت بڑے گروہ کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے نازل ہونے والی وحی، سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ اور اس قول کی تائید میں بھی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔ تو دونوں مستند، لیکن متضاد روایات کو جمع کرنے کی یہی صورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی سورہ حمد ہی ہے لیکن سورہ

کی حیثیت سے نہیں، بلکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آئندہ نازل ہونے والے پورے قرآن کے خلاصے کے طور پر۔ اور تمام انسانیت کی رہنمائی کے لئے اترنے والا قرآن جب نازل ہونے لگا، تو اس کی ابتداء سورہ علق کی پہلی پانچ آیات سے ہوئی۔

اور یہاں پر افسانہ سازوں کے بیان کردہ قصے کی حقیقت بھی ظاہر ہوگئی کہ سورہ علق کی آیات کے نزول کے موقع پر حضورؐ نے پڑھنے سے معذوری ظاہر کی تو جبرائیلؑ نے آنجناب کو اس قدر دبایا کہ آپ کا دم گھٹنے لگا۔ لیکن اس زور آزمائی کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ حضورؐ کی زبان پر وحی جاری ہوگئی۔ اس وقت اس بے سروپا کہانی پر جرح کرنے کی بجائے میں صرف یہ عرض کروں گا کہ غارِ حرا میں نازل ہونے والی وحی اللہ کی طرف سے پیغام کا آغاز نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے نازل شدہ پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا اجازت نامہ تھا۔ کہ اے حبیبؐ وہ جو قرآن ابھی تک تمہارے سینے میں بطور امانت محفوظ تھا، اب اسے دنیا والوں تک پہنچانے کا وقت آ گیا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں اس قطرہ حمد میں پورا دریائے قرآن موجزن نہ نظر آئے تو یہ ہماری نظر کی کوتاہی ہے۔ ورنہ جس دروازے سے شہرِ علمِ نبیؐ تک رسائی ہوسکتی ہے، وہ تو پوری رات سورہ حمد کی ایک آیت کی تفسیر بیان کرنے کے باوجود کہہ رہا تھا کہ میں سورہ حمد کی تفسیر لکھوں تو ستر اونٹوں کا بوجھ تیار ہوجائے لیکن سورہ حمد کی تفسیر مکمل نہ ہو۔

غرض سورہ حمد ذاتِ رسالتؐ کے لئے پورا قرآن ہے اور ہماری نگاہ میں قرآن حکیم کی ایک سورہ ہے۔ بیک وقت قرآن بھی ہو اور قرآن کی سورہ بھی ہو۔ یہ بات اگر سمجھنے میں دشواری ہو تو صحیفۂ شہادت کربلا کی سورۃ الحمد، علی اصغرؑ کو دیکھ لیجیے کہ کربلا کے شہداء میں ایک شہید بھی ہے اور تنہا پورا کربلا بھی ہے۔ مقصد سے لے کر نتیجے تک، ارادے سے لے کر عمل تک، جہاد سے لے کر شہادت تک، کمالِ اختیار سے انتہائے

مظلومیت تک، خاموشی سے لے کر کلام تک کون سا جزو کربلا ہے جو علی اصغرؑ کی ذات میں موجود نہ ہو۔

سورۂ حمد اور علی اصغرؑ میں ہر چیز مشترک تھی۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ الحمد میں سات آیتیں تھیں، اور حیات علی اصغرؑ میں بجی مہینوں کے ساتھ بھی سات کا عدد نہیں لگا تھا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۷

قرآن کے لئے ممکنہ خطرہ

قرآن مجید سے پہلے کی مقدس کتابوں کی تاریخ اور اس کے بعد کتاب خدا کے نزول پر گفتگو کے دوران ہم نے بہت سے امور طے کر لیئے ہیں۔ تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید کی تاریخ اپنے سے پہلے کی کتابوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ مردہ زبانوں کی بجائے ایک جیتی جاگتی زبان عربی میں نازل ہوا۔ اپنے نزول کے بعد اسے کبھی غائب ہونے کے خطرے سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ کسی بیرونی حملہ آور نے یا مسلمانوں کی کسی خانہ جنگی نے قرآن کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قرآن محض کسی حافظے کا محتاج ہو کر رہ گیا ہو۔ اور اس کے حصول کیلئے کسی غیر معصوم یادداشت پر بھروسہ کرنا پڑا ہو۔ قرآن مجید اپنے نزول سے آج تک ایک مسلسل تاریخی حقیقت کے طور پر انسانیت کی نگاہوں کے سامنے ایک زندہ وجود کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس کی روایت ہر زمانہ میں بغیر کسی کمی بیشی کے لفظ بلفظ ہوتی رہی۔ اسے روز اول سے اس طرح ہر خاص و عام میں متعارف کرایا گیا کہ دوست تو دوست تھے، دشمن نے بھی اس پر ایمان نہ رکھتے ہوئے بھی اس کے محفوظ ہونے کی گواہی دی۔ اللہ کی یہ کتاب ہر خطرے سے محفوظ رہی اور کسی کیلئے ممکن ہی نہ رہا کہ اس کو کسی طرح کا نقصان پہنچا سکتا۔

قرآن کے لئے خطرہ

اب ان حقائق کو جان لینے کے بعد ہم اس مقام پر آ چکے ہیں کہ ارشادِ الٰہی کے دوسرے جزو کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جزو اول تو یہ تھا کہ ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور دوسرا جزو یہ ہے کہ ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے قرآن نازل کیا تو یقیناً اللہ کے سوا کوئی اور انسان کی ہدایت اور راہنمائی کا کام سر انجام دے ہی نہ سکتا تھا۔ وہی انسان کا خالق تھا وہی جانتا تھا کہ اسے کس لئے پیدا کیا گیا ہے اور پھر وہی بتا سکتا تھا کہ مقصد تخلیق کو پورا کرنے کے لئے انسان کو کس راستے پر چلنا چاہیے۔ اس لئے انسان کی راہنمائی کرنے والا ضابطہ قانون اسی کی طرف سے نازل ہو سکتا تھا۔ اور بلا شک وشبہ اسی نے نازل کیا۔ لیکن جب قرآن نازل ہو چکا تو اب یہ اللہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو مخلوق کی ہدایت کے لئے آیا ہے۔ اس سے جو فائدہ اٹھائیں گے وہ انسان اٹھائیں گے۔ اس سے نجات اور بخشش کا جو راستہ معلوم ہوگا اس پر انسان کو چلنا ہوگا۔ تو جب قرآن نازل ہی انسان کے لئے ہوا ہے تو نازل کر کے کہہ دیا جاتا کہ تمہارے کام کی چیز ہے۔ تمہاری ضرورت ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ اسے نقصان نہ پہنچنے دینا۔ آخر اللہ قرآن بندوں کے لئے بھیج رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خود یہ ذمہ داری بھی لے رہا ہے کہ اس کی حفاظت تم نہیں کرو گے، ہم خود کریں گے۔ اللہ کی اس عنایت پر ہم اس کے شکرگزار ہیں۔ ممنون ہیں لیکن اس بے اعتباری پر اعتراض نہ سہی، گلا کرنے کی اجازت ضرور مانگتے ہیں کہ پروردگار جب تو نے ایک چیز ہمارے لئے بنائی تھی۔ ہمیں دے بھی دی تھی تو اب ہم پر اعتبار کر۔ ہم اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں گے۔ اس قدر مفید، اتنی کارآمد، اتنی قیمتی امانت کو ضائع تو نہیں ہونے دیں گے۔ اس کی حفاظت

بھی ہمارے ہی ذمہ رہنے دی جاتی۔

تو قرآن کے الفاظ فوراً ہماری توجہ اپنی طرف کھینچیں گے اور دعوت دیں گے کہ اس بات پر غور کرو کہ اللہ نے حفاظت کرنے کا ذکر ہی کیوں کیا ہے۔ کسی چیز کی حفاظت کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب اسے نقصان کا اندیشہ ہو۔ اگر کسی شئے کو کوئی خطرہ نہیں تو اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔

جیب میں پرس ہو اور پرس میں رقم موجود ہو تو گھر سے باہر نکلتے وقت اسے اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اگر کہیں ہجوم سے گزر ہوا تو محتاط ہو گئے۔ ہجوم سے نکلے فوراً دیکھا پرس موجود تو ہے کہیں گر تو نہیں گیا۔ کسی نے نکال تو نہیں لیا۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے تو کوٹ اتار کر ہینگر پر لٹکایا، پرس نکال کر کسی میز پر ڈال دیا۔ گھر سے باہر اتنی احتیاط تھی۔ گھر میں اتنی بے فکری ہوگئی۔ طرزِ عمل میں یہ فرق کیوں؟ بات اتنی سی ہے کہ جب تک گھر سے باہر تھے، تو کئی خطرے تھے، چوری کا خطرہ تھا، گم ہو جانے کا خطرہ تھا، چھن جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے حفاظت کی بھی فکر تھی۔ اب گھر میں ہم خود رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ وہ لوگ رہتے ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔ جو کبھی ایسی حرکت نہیں کرتے جس سے ہمیں نقصان پہنچے۔ تو چونکہ ہماری رقم کو کوئی خطرہ نہیں ہے اس لئے حفاظت کی ضرورت بھی نہیں ہے...... گویا نتیجہ نکلا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ قرآن کو نازل کر رہے ہیں لیکن اس کی حفاظت بھی ہم ہی کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن جہاں آیا ہے، جن لوگوں میں آیا وہاں نزدیک ہی، کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور موجود ہے۔

قرآن کو خطرہ خود مسلمانوں سے تھا

اب یہ تو پتہ چل گیا کہ قرآن کو کوئی خطرہ ضرور تھا۔ لیکن یہ خطرہ کس سے تھا کس

قسم کا تھا۔ کیونکہ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ خطرہ کس سے ہے اس وقت تک حفاظتی نظام بن ہی نہیں سکتا۔ تو اللہ تو عالم الغیب ہے۔ اسے حفاظت کا سامان کرتے ہوئے ضرورت نہیں تھی کہ پہلے دیکھتا کہ کون قرآن کو نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن اگر ہم چاہیں تو خود بھی اس خطرے سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ اسے آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن پہلی آسمانی کتاب تو تھی نہیں۔ اس سے پہلے بھی اللہ کتابیں نازل کرتا رہا ہے اور سب کتابیں تحریف کا نشانہ بن گئی تھیں۔ سب کی سب کچھ کی کچھ ہو گئی تھیں۔ ان کتابوں کو کس نے بدلا تھا؟ کس نے ان میں کمی زیادتی کی تھی؟ کتاب کا سب سے نمایاں دشمن تو وہ تھا جو کتاب کو مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ کتاب کو پھاڑ دیتا، جلا دیتا، دریا برد کر دیتا، دفن کر دیتا۔ اس سے یہ سب کی توقع تھی۔ لیکن ایک کام وہ نہیں کر سکتا تھا اور وہ یہ کہ وہ کتاب الٰہی میں کسی قسم کی ردوبدل نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں تحریف نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی تحریر کو کچھ سے کچھ کر دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ قرآن سے پہلے جتنی بھی کتابیں بدلی گئیں، وہ سب اس کے ماننے والوں نے تبدیل کیں۔ ان کے ہاتھوں ردوبدل ہوتا رہا جو خود کو کتاب کا وارث اور مالک قرار دیتے تھے۔ جو اس کو اپنی کتاب کہا کرتے تھے۔ اور یہ بڑی حقیقت ہے کہ کسی مذہب کی کتاب میں تحریف کرنا اس مذہب کے نہ ماننے والوں کے اختیار میں نہیں تھا۔ یہ کام تو وہی کر سکتے تھے جو نبی کی تعلیمات کے اس کے دین کے مالک بن بیٹھے تھے۔ یہ تبدیلی تو رشی منی پنڈت ہی کر سکتے تھے۔ یہ اختیار تو صرف خود ساختہ نبیوں اور نبیاؤں کا تھا کہ وہ جس کو چاہتے توراۃ قرار دے دیتے۔ یہ تو سینٹ پال اور سینٹ کا مرتبہ رکھنے والے [illegible] تھے کہ [illegible] میں سے صرف چار انجیلیں منتخب کر لیں اور باقی انجیل ماننے سے [illegible] قرآن کو بھی خطرہ تو کسی غیر سے نہیں۔ بلکہ مسلمانوں سے تھا [illegible]

معترضین کے اس گروہ سے جو خود کو قرآن کا حامل قرار دے رہا تھا۔ وہ گروہ جو قرآن سے بے پناہ وابستگی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ جماعت جو قرآن سے اتنی محبت، اتنی عقیدت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ اکیلا قرآن تمہاری ہدایت کے لئے ناکافی ہے۔ اس کو ہمیشہ میری سنت کی روشنی میں سمجھنا۔ اور میری سنت بھی اسی وقت سمجھ میں آئے گی جب ان ہستیوں سے وابستہ رہو گے، جو میرے کردار کا نمونہ ہیں جنہیں تم نے نہیں، خود میں نے اپنا نمائندہ بنایا ہے۔ لیکن قرآن کے ان عقیدت مندوں کا گروہ کہہ رہا تھا کہ حضور آپ کا کام قرآن پہنچانا تھا، سو آپ نے پہنچا دیا۔ اب یہ ہر مسئلے کا حل، ہر خشک و تر کے بیان کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے قرآن ہمارے پاس ہے۔ اب ہمیں کسی اور کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ قرآن کو خطرہ تھا تو ان قرآن کو کافی قرار دینے والوں سے تھا۔ اور قرآن سے گہرا تعلق ظاہر کرنے والے دشمنوں میں نہیں تھے بلکہ مسلمان کہلاتے تھے۔ صرف مسلمان نہیں تھے بلکہ مسلمانوں کی صف احترام میں انتہائی بلند مسندوں پر تشریف فرما تھے   جب تک میں رقم لئے ہوئے گھر سے باہر تھا تو مجھے اس کی حفاظت کی فکر تھی۔ لیکن گھر پہنچ کر بے فکری ہو گئی تھی اس لئے کہ گھر میں کوئی ڈاکو نہیں تھا۔ کوئی چور نہیں تھا   قرآن مسلمانوں کے حوالے کرتے ہوئے اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا اہتمام کرنا، خود اللہ عالم الغیب کی طرف سے مسلمانوں کو تنبیہ تھی کہ خبردار رہنا، قرآن کا دشمن صرف باہر نہیں خود تمہارے گھر میں موجود ہے۔

اور یہ قرآن کے دشمن کی اہمیت تھی۔ یا یوں کہوں کہ اپنوں میں سے ہونے کی وجہ سے وہ اتنا ناقابل شناخت تھا کہ اللہ نے یہ کام انسانوں پر نہیں چھوڑا، بلکہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ حفاظت کے اہتمام کا انحصار خطرے کی مقدار پر ہے۔ جتنا بڑا خطرہ ہوگا اسی قدر طاقتور محافظ کی ضرورت ہوگی۔ اللہ نے قرآن کی حفاظت کا کام

انسانوں کے کسی گروہ کے سپرد نہیں کیا، اپنے امین اور قوت والے فرشتوں کو بھی محافظ نہیں بنایا بلکہ اعلان کیا کہ میں خود حفاظت کروں گا۔ اس سب سے بڑے محافظ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس لئے کہ دشمن نے دوستی کا ایسا بہروپ بھرا تھا کہ اسے دشمن سمجھنے کا امکان ہی نہ تھا۔ اس کی دوستی پر ایسا اندھا اعتماد تھا، ایسا ایمان تھا کہ اگر کوئی ان کی دشمنی کا پردہ چاک کرتا تو ایسا کرنے والے کو ہی دشمن قرار دے دیا جاتا۔ شاید کوئی کہہ دے کہ میں زیادتی کر رہا ہوں، ملت کے مخلص لوگوں پر شبہ کر رہا ہوں۔ نیک ترین لوگوں کی نیتوں پر شک کر رہا ہوں۔ تو جناب دیکھ لیجیے۔ ایک قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا تھا۔ باقی اسلام تو مسلمانوں ہی کے سپرد تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ سب اسلام تھا۔ سب اللہ ہی کی طرف سے آیا تھا اور سب مسلمانوں کے سپرد تھا۔ کیا کیا گیا ان سب کے ساتھ۔ کیا ان کی حفاظت کر سکا مسلمان؟ نماز کے کتنے ورژن بن گئے۔ روزے کے کتنے طریقے رائج ہوگئے۔ حج کے قاعدے کتنی صورتیں اختیار کر گئے۔ زکوۃ کے قوانین کے کتنے مجموعے بن گئے۔ جب مسلمانوں کی حفاظت میں آنے والے اسلام کی ہر بات کے کئی ایڈیشن بن گئے تو اگر قرآن کی حفاظت بھی ان کے سپرد ہوتی تو اس کی کتنی صورتیں ہو جاتیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں آج کی صورت حال بیان کر رہا ہوں۔ آج کا مظلوم مسلمان تو یہ جرأت ہی نہیں کر سکتا کہ وہ نماز روزے کی شکل میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ یہ تو میں بالکل ابتدائی عہد کے مسلمانوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہ مسلمان جنہوں نے بڑے دعوے سے اسلام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہونے کے چھبیس سال بعد مسلمانوں نے علی علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی۔ علی علیہ السلام پہلی مرتبہ بصرہ آئے۔ مسجد بصرہ میں نماز پڑھائی۔ خلیفۂ وقت امامت کر رہا

تھا۔ سارا بصرہ ٹوٹ پڑا۔ اس میں تابعی تو سب ہی تھے لیکن بہت سے بڑے بڑے صحابی بھی تھے۔ علی علیہ السلام نماز پڑھا چکے تو جو صحابی تھے، جنہوں نے کبھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی تھی انہوں نے کہا: خدا کی قسم آج علی کے پیچھے نماز پڑھی تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز یاد آ گئی۔ گویا 26 سال کے عرصہ میں کسی نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ سے نماز ادا ہی نہیں کی تھی... اب انصاف کیجیے۔ یہ جو بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کی دو شکلیں ہو گئی تھیں، ایک علی علیہ السلام کی نماز جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ پر تھی اور ایک 26 سال پڑھی جانے والی وہ نماز جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے سے جداگانہ تھی ان کا خالق کون تھا؟ یہ نہ آج کے مسلمانوں کا کام تھا نہ اس وقت کے سیدھے سادے مسلمانوں، عوام مسلمانوں کا کام تھا۔ یہ تو وہی ہستیاں کر سکتی تھیں جو خود کو اسلام کا وارث کہتی تھیں۔ جن پر مسلمان اعتماد کرتے تھے۔ جن کے قول و فعل کو خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق سمجھتے تھے۔ تو جن محترم مسلمانوں نے نماز کے ساتھ یہ سلوک کیا وہ اگر قرآن کے محافظ ہوتے تو قرآن کی کیا حالت ہوتی؟

اسلام کی دی ہوئی فقط نماز ہی نہیں تھی جس کا یہ حال ہوا۔ اور تمام احکامات کی حفاظت میں بھی مسلمان اسی طرح ناکام ہوئے۔ لیکن میں نے نماز کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا کہ اسلامی احکامات میں سے نماز ہی وہ حکم ہے جس کا سامنا ہر اسلام لانے والے کو اپنی قبولیت کے پہلے دن کرنا پڑا تھا۔ روزہ، حج، زکوٰۃ تو بعد میں فرض ہوئے۔ لیکن نماز ابتدائے اسلام سے فرض تھی اور فرض بھی ایسا کہ جس کی ادائیگی روزانہ کرنی تھی۔ باقی اعمال تو سال میں ایک مرتبہ یا زندگی میں ایک دفعہ یا جب ضرورت پیش آئے۔ چنانچہ نماز سیکھنے میں کسی ایمان لانے والے کے لئے کوتاہی کا امکان ہی نہیں تھا۔ ادھر سکھانے والے کا یہ اہتمام کہ تئیس (۲۳) سال مسلسل نماز سکھائی، کسی گوشے میں

نہیں، سب کے سامنے۔ سب سے آگے کھڑے ہو کر سکھائی۔ ایک آدھ بار نہیں دن میں پانچ مرتبہ سکھائی۔ ان پانچ نمازوں میں ایک سبق کو کم از کم سترہ مرتبہ دہرایا۔ مکہ میں پڑھی گئی نمازوں کا شمار نہ کیجیے۔ وہاں جماعت کا امکان مشکل تھا۔ لیکن مدینہ پہنچ کر، مسجد نبوی بن جانے کے بعد، تو جو نمازیں ہوئیں انہیں تو تمام مسلمانوں نے دیکھا۔ ان نمازوں کی رکعتوں کا شمار کیجیے تو کم از کم بہتر (۷۲) ہزار مرتبہ نماز کی تعلیم دی گئی۔ اسلام کا کوئی اور عمل، کوئی اور قول اتنی تکرار سے نہیں سکھایا گیا۔ اس اہتمام کے باوجود نتیجہ یہ نکلا کہ نماز کے بنیادی ارکان کو چھوڑیئے، اس میں پڑھی جانے والی چیزوں کو ایک طرف رکھیے۔ صرف ایک چھوٹا سا عمل، جس کو سیکھنے کے لئے نہ کسی قابلیت کی ضرورت تھی۔ نہ کسی علم و دانش کی، ایک فقط آنکھیں سلامت ہوتیں تو اسے سیکھنے میں ذرہ برابر دشواری نہیں تھی۔ انصاف کیجئے کہ صرف یہ جاننے کے لئے کیا مشکل حائل تھی کہ دوران قیام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھ کہاں رکھتے تھے۔ اس آسان ترین بات کا اگلی نسل تک پہنچانے میں مسلمانوں کی ذمہ داری کا کمال دیکھیے کہ آج مسلمانوں میں صرف اس بات پر ایک دو نہیں پورے انیس (۱۹) اختلافات ہیں۔ اور ستم یہ کہ ہر مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کرتے تھے جس طرح ہم کرتے ہیں۔ بہتر ہزار مرتبہ کے دیکھے ہوئے عمل کی حفاظت میں تو ہمارے بزرگوں نے یہ کمال دکھایا قرآن تو 23 سال میں اس طرح نازل ہوا تھا کہ اس کی ہر سورۃ، بلکہ ہر آیت بس ایک مرتبہ نازل ہوئی اور وہ بھی مختلف موقعوں پر، مختلف جگہوں پر، کسی نے ایک آیت سنی تو دوسری کے نزول کے وقت موجود نہیں تھا۔ اب اگر قرآن کی حفاظت کا کام ان مسلمانوں کے حوالے ہو جاتا تو قرآن کے تیس پارے ہیں، اس صورت میں کم از کم تیس قرآن ضرور ہوتے۔

عہد اول کے مسلمانوں کی امانت داری اور احساس ذمہ داری کی حقیقی تصویر

دیکھنی ہو تو مسلمانوں کی فقہ کے اختلافات دیکھ لیجیے۔ تفسیر کی بحثیں دیکھ لیں۔ واقعات اور سیرت کے عنوان سے جو معرکہ آرائیاں ہیں ان پر ایک نظر ڈال لیں۔ اور سب سے بڑی بات، علم حدیث کا حال دیکھیں جو فقہ کی، تفسیر کی، تاریخ کی، سیرت کی غرض پورے اسلام کا ماخذ ہے۔ حدیث کی حفاظت میں جو گل کھلے ہیں ان کا تعلق ہم سے نہیں ہے۔ جعلی حدیثیں ہم نے نہیں بنائی ہیں۔ موضوعی روایتیں ہماری، آج کے دور کے مسلمانوں کی تخلیق نہیں ہیں۔ یہ سب ترکے میں ملی ہیں۔ یہ وہ ورثہ ہے جو ابتدائی عہد کے محترم مسلمانوں سے منتقل ہوا ہے۔ ذرا غور کیجیے تو قرآن بھی حدیث ہی تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں وہ سب حدیث ہے۔ یہ تو خود آپ بتاتے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا کون سا جملہ قول خدا ہے، قرآن ہے اور کون سا جملہ قول رسولؐ ہے، حدیث ہے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی احادیث کے محافظ، مسلمان اسے تحریف، اضافے اور کمی سے نہ بچا سکے، تو قرآن بھی تو آپ ہی کی زبان مبارک پر جاری ہوا تھا۔ اگر اللہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود نہ لے لیتا تو آج قرآن کو بھی تحریف سے کون بچا سکتا تھا۔

آج ہمارا جوشِ عقیدت، ماضی کی بعض شخصیتوں کی محبت میں ان کو طرح طرح کے اعزازات سے نوازتا ہے۔ ہم حقائق سے آنکھیں بند کر کے بارہا ایسے دعوے کرنے لگتے ہیں کہ اگر فلاں شخصیت نہ ہوتی تو آج قرآن نہ ہوتا۔ فلاں حکمران اگر بروقت اقدام نہ کرتا تو قرآن کے بارے میں سینکڑوں اختلافات پیدا ہو چکے ہوتے۔ فلاں حفاظت نہ کرتا تو قرآن محفوظ نہ رہتا۔ دعویٰ کرنے میں ہر شخص آزاد ہے۔ جس کا جو دل چاہے دعویٰ کرے۔ لیکن کسی دعوے کو دوسروں سے تسلیم کرانے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فلاں شخص محافظ قرآن ہے، میں دعویٰ کرتا رہوں کہ فلاں

صاحب نے مسلمانوں کو ایک قرآن پر جمع کیا تھا۔ تو ہر شخص کو مجھ سے یہ پوچھنے کا اختیار ہے کہ پہلے تو اسلام کے کسی دور میں قرآن کا عدم وجود ثابت کیجیے۔ اس کے بعد قرآن کو جمع کیے جانے کی بات کی جائے گی۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ظاہری کے بعد کسی لمحے میں قرآن غیر موجود نہیں رہا، تو بعد میں کسی کے قرآن جمع کرنے کا کیا مطلب؟ اور جب کسی دور میں ایک سے زیادہ قرآن نہیں تھے، تو ملت اسلامیہ کو ایک قرآن پر جمع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر قرآن مجید کے کسی مختلف نسخے کے وجود کے ثبوت کے بغیر بھی یہ اصرار باقی ہے کہ فلاں شخصیت جامع قرآن تھی یا ایک قرآن پر ملت کو جمع کرنے والی تھی، تو پھر ہم مجبور ہوں گے کہ قرآن کے جمع کیئے جانے کے وقت ایک سے زیادہ نسخوں کے وجود کا ثبوت مانگنے کے بجائے، اس شخصیت کی صلاحیت جمع پر بات کریں۔ جس کے سر اس کارنامے کا سہرا باندھا جا رہا ہو۔ عہد رسالتؐ کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب تمام مسلمان کسی مذہبی یا دینی مسئلہ میں کسی ایک صورت پر سو فیصد اتفاق کرتے ہوں۔ یا کسی شخصیت پر متفق رہے ہوں کہ دین کے معاملے میں اس کا فیصلہ ہی سب مسلمانوں کے لئے آخری فیصلہ ہے۔ یا یوں کہوں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں میں کبھی ایک قیادت کا وجود نہیں رہا۔ اور جب تک ایسی متفقہ قیادت کا وجود نہ ہو، اس وقت تک کسی بھی فرد کے لئے پوری ملت کو کسی مذہبی اختلاف میں ایک بات پر جمع کرنا ناممکن ہوگا۔

کسی ایک قرآن پر اگر مسلمان متفق نہیں تھے اور ایک صاحب اقتدار نے ان کو قرآن پر متفق کر دیا، تو اس دعوے کے پیش کرنے سے پہلے، یہ تو بتایئے کہ ان صاحب نے ملت کو کسی اور بات پر بھی متفق کیا؟ اگر وہ ساری زندگی پوری اسلامی برادری کو کسی ایک معمولی بات پر بھی ہم خیال نہ بنا سکے ہوں، تو قرآن جیسے اہم مسئلہ پر مسلمانوں کو

متفق بنانے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ تاریخ نے اسلام کی دوسری صدی میں قرآن کے متعلق ایک اور بحث کا پتہ دیا ہے۔ مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک جماعت قرآن کو اللہ کا کلام قرار دیتے ہوئے اسے اللہ کا خلق کردہ قرار دیتی تھی، جب کہ دوسری جماعت کا کہنا تھا کہ قرآن خلق نہیں کیا گیا۔ یہ ہمیشہ سے موجود ہے۔ یہ بحث اتنی بڑھی کہ اس وقت کی سلطنتیں بھی اس میں شریک ہوگئیں۔ بظاہر یہ ایک علمی بحث تھی، لیکن جب تخت و تاج بھی شریک بحث ہوگئے تو ان کے پاس سب سے بڑی دلیل منطقی نہیں شمشیری تھی۔ اربابِ اقتدار نے اپنی بات منوانے کے لئے بھرپور طاقت استعمال کی۔ لیکن نہ مسلمان قدامت قرآن پر متفق ہو سکے نہ خلق قرآن پر۔ جب عظیم الشان سلطنتیں، اپنی پوری طاقت استعمال کرنے کے باوجود، قرآن کے متعلق ایک ضمنی اور خالصتاً ایک فکری یا نظری مسئلہ پر مسلمانوں کو ایک موقف اختیار نہ کرا سکیں تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآن کے سلسلے میں کوئی بنیادی اختلاف ہوتا اور کوئی سلطنت اسے دور کرانے میں کامیاب ہو جاتی۔

غرض کہ خلاصۂ کلام یہی ہے کہ آج جو قرآن مجید صرف ایک شکل رکھتا ہے اور یہ شکل ہر طرح سے محفوظ ہے تو یہ تمام تر اللہ کا اپنا انتظام ہے۔ نہ بندوں کے بس کی بات تھی اور نہ ان کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ آپ اپنے معاملات میں جس کو چاہیں جو مقام عطا کر دیں اور جس کو چاہیں احترام و عقیدت کی جتنی بلند مسند میسر ہو، اس پر بٹھا دیں لیکن قرآن اپنے وجود کے ہر پہلو سے، اپنے نزول اور اپنی حفاظت میں کسی فرد بشر کا ممنون احسان نہیں ہے۔ اللہ نے نازل کیئے ہوئے قرآن کی حفاظت کے لئے اس میں ایک ایسا داخلی نظام رکھ دیا ہے کہ اسے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے نہ کسی حکومتی حاقت کی ضرورت ہے اور نہ کسی صاحب اقتدار کی کسی کوشش کی۔ اللہ نے قرآن کے متن کو اس کے ٹیکسٹ (Text) کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے اس طرح عام کر دیا کہ کوئی اس میں رد و

بدل کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔ پھر الفاظ یا متن کی حفاظت کافی نہ ہوتی، بلکہ بے مقصد ہو جاتی اگر ان الفاظ کے معنی محفوظ نہ رہ پاتے۔ چنانچہ قرآن کے معنی بھی محفوظ کیے گئے۔ لیکن معنی کا معاملہ الفاظ سے مختلف تھا۔ اس لئے اس کی حفاظت کا طریقہ بھی مختلف قرار دیا۔ الفاظ قرآن کی حفاظت تو ان کو عام کر کے کی گئی لیکن معنی قرآن بھی عام ہو جاتے یعنی ہر شخص کو اجازت عام ہوتی کہ وہ آزاد ہے جس طرح چاہے قرآن کو سمجھے تو ہر مسلمان، قرآن کا جو مطلب نکالتا وہی درست ہوتا۔ اور اس طرح قرآن لفظوں کی حد تک تو ایک رہتا، لیکن معنی کے اعتبار سے کثرتِ تعبیر کا نشانہ بن جاتا۔ یہاں ضرورت تھی ایک معیار کی، ایک اسٹینڈرڈ کی تا کہ پیغام قرآن کو سمجھنے میں انسان غلطی نہ کرے اور اگر کوئی غلطی کرے تو اسے پرکھا جا سکے۔ چنانچہ اللہ نے ایک طرف تو اجازت عام دے دی کہ قرآن میں ہر شخص غور کرے، ہر شخص اپنی عقل استعمال کرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ اس قرآن میں بہت سی آیات بہت صاف ہیں، محکم ہیں، ایسی ہیں کہ کوئی بھی شخص اگر دیانت داری سے، نیک نیتی سے، ان کو سمجھنا چاہے گا تو اگر پوری طرح نہ سمجھ سکا تب بھی اس کا غلط مطلب نہیں نکالے گا۔ لیکن کچھ آیات ایسی بھی ہیں جن کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ متشابہ آیتیں ہیں۔ جن کے دل میں کھوٹ ہے وہ ان آیتوں سے الٹے سیدھے مطلب نکال کر خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو دیکھو ان آیتوں میں نہ الجھنا۔ یہ نہیں کہ ان پر غور و فکر نہ کرنا۔ نہیں۔ ضرور کرنا۔ یہ سارا قرآن تمہارے لئے ہی ہے لیکن اتنا یاد رکھنا کہ ایسے مشکل مقامات پر جو کچھ تمہاری سمجھ میں آئے اسے حرف آخر نہ سمجھ لینا۔ ہم نے ان مشکل مقامات کے معنی کو اپنے پاس رکھا ہے، یا پھر کچھ صاحبانِ علم کے پاس محفوظ کر دیا ہے۔ ان صاحبان کا علم پختہ ہے، راسخ ہے۔ ان کا علم حالات اور واقعات سے بدلتا نہیں ہے۔ ان کو ہم نے علم دے کر

بھیجی ہے۔ وہ راسخون فی العلم ہیں۔ جو کچھ تمہاری سمجھ میں آئے اس کی ان شخصیتوں سے تصدیق کرالینا وہ تائید کردیں تو قبول کرلینا وہ رد کردیں تو تم اپنے غلط معنی سے دستبردار ہو جانا۔

اللہ نے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کی اسے عام لوگوں میں پھیلا کر۔ اور قرآن کے معنی کی حفاظت کی اسے خاص شخصیتوں میں محدود کر کے۔ نہ ہر خاص و عام کے پاس موجود قرآن کو، ان تمام لوگوں سے جدا کر کے ضائع کرنا ممکن ہے۔ نہ جو قرآن کی مشکل اور آسان، ہر منزل کا علم رکھتے ہیں ان کے علم کو لالچ سے، خوف سے یا طاقت سے تبدیل کرنا ممکن ہے۔ جنہیں اللہ نے قرآن کے معنی کا امین بنایا ہے۔ وہ قرآن کے معنی بدلنے نہیں دیتے۔ یزید نے جب مطالبہ بیعت کیا تھا تو حسین علیہ السلام کسی علاقے کے حکمران نہیں تھے کہ ان کی بیعت سے یزید کی سلطنت وسیع ہو جاتی۔ نہ حسین علیہ السلام عرب کے ایسے سرمایہ دار تھے کہ ان کی بیعت سے یزید کے خزانے میں مال و دولت کا اضافہ ہو جاتا۔ درحقیقت یہ صرف حسین علیہ السلام کی بیعت نہیں تھی جس کے لئے یزید اس قدر بے چین تھا۔ یزید، حسین علیہ السلام کی شکل میں معنی قرآن پر قبضہ چاہتا تھا۔ اس کی سیاسی فکر کے بزرگوں نے پچاس سال پہلے یہ اعلان کیا تھا کہ ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت ہے، نہ آل رسول کی حاجت ہے۔ ہمارے لئے تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔ یوں بظاہر تو قرآن کے دعویدار ہوگئے تھے۔ لیکن نہ تو قرآن ان کو اپنا وارث تسلیم کررہا تھا، نہ مسلمان ان کے معنی ماننے کے لئے تیار تھے۔

یزید قرآن کے حلال کو حرام اور قرآن کے حرام کو حلال بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس وقت تک یہ آرزو کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھی جب تک اسے قرآن کی تشریح و توضیح کرنے کا اختیار حاصل نہ ہوتا۔ اس اختیار کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ حسین علیہ السلام

تھے۔ اگر حسین علیہ السلام یزید کی بیعت کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب قرآن کے معنی بیان کرنے کا اختیار یزید کو حاصل ہو گیا۔ حسین علیہ السلام معنی قرآن کے خود ساختہ محافظ نہیں تھے۔ ان کو یہ منصب اللہ کی طرف سے سونپا گیا تھا۔ حسین علیہ السلام جان تو دے سکتے تھے لیکن قرآن کی حفاظت سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ حسین علیہ السلام نے گردن کٹانے کی راہ منتخب کی۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۸

حفظِ قرآن

قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود پروردگار عالم نے لی تو اس حفاظت کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا اللہ ''کن'' کہے گا اور قرآن محفوظ ہو جائے گا؟ اس نے دنیا کو دنیائے اسباب بنایا ہے۔ چنانچہ یہاں اس حفاظت کے ذرائع پیدا کیئے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ نے قرآن کی حفاظت کے کیا اسباب پیدا کیئے۔

تو کسی قول کو دو طریقوں سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ ایک تو صورت یہ ہے کہ قول کو حافظوں میں محفوظ کرلیا جائے۔ اسے زبانی یاد کرلیا جائے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا ریکارڈ تیار کرلیا جائے۔ ریکارڈ رکھنے کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ سب سے زیادہ جانی پہچانی صورت تو یہ ہے کہ قول کو لکھ لیا جائے۔ اسے تحریر کے جامہ میں ڈھال لیا جائے۔ اس کے علاوہ آج کے جدید دور میں ہم ویڈیو اور آڈیو کے ذریعہ بھی کسی بات کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کی فلم تیار کر لیتے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے قرآن کی حفاظت کے لئے یہ تمام طریقے استعمال کیئے۔ قرآن کو حافظے میں بھی محفوظ کیا گیا، اس کو تحریر بھی کیا گیا، اس کی فلم بھی بنائی گئی۔ لیکن اس وقت ہمارے موضوع میں صرف دو طریقوں پر بات کرنا شامل ہے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ قرآن کی حفاظت سے حفظ اور تحریر کا کتنا تعلق ہے۔

جس وقت قرآن نازل ہوا اس زمانے میں عموماً تمام عربوں میں، اور خصوصیت سے مکہ اور مدینہ کے رہنے والوں میں تحریر کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ اعلانِ اسلام کے وقت مکہ میں کل سترہ آدمی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مدینہ میں صورت حال اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہاں فقط گیارہ ایسے لوگ تھے جن کو پڑھا لکھا کہا جا سکتا تھا ویسے بھی عربوں کا حافظہ معمول سے زیادہ تیز تھا۔ کوئی شاعر لوگوں میں قصیدہ پڑھتا تو مجمع کے بہت سے افراد اسے صرف ایک مرتبہ سن کر دہرا دیتے۔ اپنے شجرے کا یاد ہونا تو عام بات تھی، بہت سے ایسے لوگ تھے جن کو بہت سے قبائل عرب کے شجرے حفظ تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد حضورؐ جو کچھ ارشاد فرماتے لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا۔ صرف چھوٹے چھوٹے اقوال ہی نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طویل خطبے اور مختلف موقعوں پر کی جانے والی تقریریں بھی لوگوں کو یاد ہو جاتیں۔ آج علم حدیث کا بڑا ذخیرہ، حضرت علی علیہ السلام کے خطبات، آئمہ معصومین علیہم السلام کے اقوال و ارشادات، پوری نہج البلاغہ، پوری صحیفۂ کاملہ، عرب کی ابتدائی تاریخ، علم الانساب یہ سب باتیں عربوں کے غیر معمولی حافظے سے ہی سفر کر کے ہم تک پہنچیں۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں حافظ کی اصطلاح ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتی تھی جن کو کم از کم بیس ہزار احادیث اپنے پورے متن اور راویوں کی فہرست کے ساتھ یاد ہوتی تھیں۔ اور جو لوگ حدیث کا درس دیا کرتے تھے ان میں سے اکثر حافظ ہوتے تھے۔

ایک طرف تو عربوں کے حافظے کا یہ حال تھا۔ دوسری طرف جب قرآن نازل ہوا تو وہ بھی اس طرح نہیں کہ پورا قرآن لوگوں تک ایک ساتھ پہنچ گیا ہو۔ بلکہ کوئی بڑی سورہ بھی ایک مرتبہ میں نہیں اتری۔ نزول قرآن کی صورت یہ تھی کہ عام طور پر ایک مرتبہ میں پانچ یا چھ آیات نازل ہوتیں۔ ایسی صورت میں ان کو زبانی یاد کر لینا آسان ہوتا تھا۔

چنانچہ جتنا قرآن نازل ہوتا، اسے اکثر مسلمان ذہن میں محفوظ کر لیا کرتے۔ اور شروع اسلام سے ہی بہت سے مسلمانوں کو قرآن مجید زبانی یاد تھا۔

لیکن میں آپ کو ایک اہم بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ حالات پوری طرح سازگار تھے، اور لوگ عمل بھی کر رہے تھے، اور پڑھے لکھوں کی کمی کی وجہ سے قرآن مجید کو کسی اور طریقے سے جمع کرنا بھی مشکل تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن اور صاحب قرآن، دونوں نے قرآن کو محفوظ کرنے کے لئے انسانی حافظے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ قرآن نے بار بار کہا مجھ پر غور کرو، فکر کرو، تدبر کرو۔ لیکن ایک مقام پر بھی نہیں ملتا کہ قرآن نے کہا ہو کہ مجھے زبانی یاد کر لو۔ بس ایک مقام پر ہلکا سا ایک اشارہ ملتا ہے کہ واجب نمازوں کے دوران جتنا قرآن پڑھا جائے گا اس کا زبانی یاد ہونا ضروری ہے۔ لیکن غور کیجیے تو یہ یاد کرنا بھی قرآن کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ نماز کی ضرورت تھی۔

حفظ پر انحصار نہ کرنے کا سبب

قرآن کو زبانی یاد کرنے پر کیوں زور نہیں دیا گیا؟ اس کی کئی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی اور اہم ترین بات تو یہی ہے کہ حافظہ غلطی کر سکتا ہے۔ آج بھی تراویح کے دوران ایک حافظ سے کام نہیں چلتا۔ بلکہ تلاوت کرنے والے حافظ کے ساتھ ایک اور حافظ اس کی پشت پر کھڑا کیا جاتا ہے۔ تاکہ قاری قرأت کے دوران کہیں بھول جائے، یا غلطی کر دے تو دوسرا حافظ اسے ٹوک دے۔ اسے لقمہ دے دے۔ ایک حافظ کا دوسرے حافظ کی تلاوت پر نظر رکھنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ حافظ کا حافظہ غلطی کر سکتا ہے۔ تو جب ہم ایک نماز کے دوران قرآن مجید کی جزوی تلاوت میں ایک حافظ کو قرآن کا محافظ نہیں سمجھتے تو قرآن مجید کی قیامت تک حفاظت کا کام حافظے کے سپرد کیسے کیا جا سکتا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک اور وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حافظے کے ذریعہ شاید قرآن مجید کے الفاظ تو محفوظ ہو جاتے لیکن قرآن کی روح باقی نہ رہتی۔ اس لئے کہ قرآن غور کرنے کی چیز ہے۔عمل کرنے کی چیز ہے۔ جب کہ حافظ جس وقت محض حافظے سے قرآن ادا کر رہا ہو تو اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا کہ وہ معنی پر توجہ دے سکے۔ اس وقت معنی پر توجہ دینے کی بجائے اس کا تمام تر دھیان اس بات کی طرف ہوتا ہے کہ لفظ کے بعد لفظ صحیح طرح سے ادا ہو جائے۔ ذرا سی توجہ ادھر سے ادھر ہوئی، اور پڑھنے والا بھٹک گیا۔ بلکہ رٹی ہوئی بات کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ جتنی زیادہ رٹی ہوئی بات ہوگی، اس کے معنی اسی قدر نگاہوں سے اوجھل ہوں گے۔ ہم نماز کے دوران جو کچھ زبان سے ادا کرتے ہیں وہ ہمیں بہت اچھی طرح یاد ہوتا ہے۔ اور نتیجے سے ہم سب واقف ہیں کہ زبان الفاظ ادا کر رہے ہوتے ہیں اور ذہن دنیا جہان کی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ کیفیت صرف ہماری نہیں جو عربی زبان سے ناواقف ہیں، عربی دان حضرات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ قرآن اگر جادو کا کوئی منتر ہوتا تو حافظے میں محفوظ لفظوں کا زبان سے جاری ہو جانا کافی ہوتا۔ لیکن یہ تو غور کرنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ اس لئے حافظہ اس کی روح کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔

پھر قرآن کو اگر مسلمانوں کے حافظے پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ ایک نسل جسے قرآن چار چار چھ چھ آیتوں کی شکل میں ملا تھا وہ نسل تو قرآن کو سن سن کر حفظ کر لیتی۔ لیکن اس کے بعد قیامت تک آنے والی نسلوں کو قرآن پڑھنے اور حفظ کرنے کے لئے پھر تحریری قرآن کی ضرورت ہوتی۔ گویا ذہن میں محفوظ قرآن ایک فرد کے لئے تو محفوظ ہو سکتا تھا۔ پوری انسانیت کے لیے ایسی حفاظت بیکار ہوتی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن دو چار افراد کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے

نازل ہوا تھا۔ اب اگر اسے حافظے کے ذریعہ محفوظ کیا جاتا تو قرآن صرف وہاں ہوتا جہاں حافظ ہوتا۔ اور جو مسلمان قرآن حفظ نہ کر پاتا اس کے لئے قرآن تک پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا قرآن جو انسانیت کی پہنچ سے دور ہو، جس تک اس کے اپنے ماننے والے عام مسلمان بھی نہ پہنچ سکتے ہوں، وہ انسانیت کی ہدایت کے اعتبار سے ہندوؤں کے مقدس ویدوں سے بھی زیادہ بے فیض اور بیکار ہوتا۔

ایک اور پہلو بھی پیش نظر رہے۔ کچھ مقامات پر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید کا پڑھنا ثواب ہے، اسے سننا ثواب ہے اور اسے دیکھنا ثواب ہے۔ اب اس وقت یہ بحث نہیں کہ ان تین باتوں کو ثواب کیوں قرار دیا گیا اور ان تینوں اعمال سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ سوالات اس وقت غیر متعلق ہیں۔ زیر بحث موضوع کے حوالے سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ قرآن کے ذریعہ انسان کو اپنے نامۂ اعمال میں ثواب کے اضافے کے تین ذرائع بتانے کے بعد اگر قرآن کو حفظ کے ذریعہ باقی رکھا جاتا تو انسانیت بے جرم و خطا ایک ذریعہ ثواب سے محروم ہو جاتی۔ کیونکہ ثواب کا وعدہ تو قرآن کو پڑھنے، سننے اور دیکھنے پر کیا گیا تھا۔ اب اگر کہا جاتا کہ یاد کر کے زبانی پڑھا کرو، تو پڑھنے والے کے لئے پڑھنے اور سننے کا ثواب تو مل جاتا لیکن قرآن کے دیکھنے کا ثواب حاصل کرنا اس کے لئے ناممکن ہو جاتا۔

چنانچہ ابتدائے اسلام میں قرآن کی آیات کے نازل ہوتے ہی انہیں اکثر مسلمان حفظ کر لیا کرتے تو اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قرآن ان حفاظ کے ذریعہ محفوظ کیا گیا تھا۔ یہ تو ان مؤمنین کی مجبوری تھی کہ لکھنا پڑھنا نہ جاننے کی وجہ سے وہ سوائے حفظ کے اور کسی دوسرے طریقے سے تلاوتِ قرآن کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان مسلمانوں کی مجبوری کو قرآن کی حفاظت کا ذریعہ سمجھ لینا ایک سنگین غلطی ہوگی۔

اس مقام پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ میری گفتگو سے یہ نتیجہ نہ اخذ کر لیا جائے کہ میں خدانا خواستہ یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن کو حفظ نہ کیا جائے۔ جی نہیں۔ ضرور حفظ کیجیے۔ لیکن حفظ کو قرآن کی حفاظت کا ذریعہ نہ قرار دیجیے۔ قرآن مجید کا حفظ کرنا سنت رسولؐ ہے، سنت علیؑ ہے، سنت اہل بیتؑ ہے۔ سنت ائمہؑ ہے، سنت اصحابؓ ہے۔ لیکن یہ قرآن کی حفاظت نہیں ہے بلکہ قرآن کے محفوظ ہو جانے کے بعد کا عمل ہے۔ پہلے قرآن کو محفوظ کر دیا گیا پھر اسے حفظ کیا گیا۔ یہ نہیں کہ جب حفظ کیا گیا تب محفوظ ہوا۔

قرأت قرآن متواتر ہے

ہاں۔ حفاظت قرآن کے ذیل میں ایک چیز ایسی تھی کہ جس کی حفاظت کے لئے حافظے ہی پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ اور وہ الفاظ قرآن نہیں، بلکہ الفاظ اور حروف کی ادائیگی، الفاظ کا تلفظ، اور آیت کا لہجہ تھی۔ وہ چیز جسے ہم قرآن کی قرأت کہتے ہیں۔ اس قرأت کی حفاظت حافظے ہی کے ذریعہ ممکن تھی اس لئے اسے حافظے ہی کے ذریعہ محفوظ کیا گیا۔ لیکن یہاں بھی حفاظت کا کام ایک دو حافظوں کے سپرد نہیں ہوا۔ بلکہ وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو قرآن کی حفاظت کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی قرأت قرآن کو بھی عوامی بنا دیا گیا۔

آنجنابؐ کے اصحابؓ جب پہلی مرتبہ آپؐ کی زبان مبارک سے قرآن کی آیات سنتے تو بار بار آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی تلاوت کرتے۔ آپؐ دوران تلاوت ان کی تصحیح فرماتے جاتے۔ جب وہ ان آیات کو بالکل درست طریقے سے پڑھنے لگتے تو آپؐ حکم دیتے کہ اب جا کر اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی اس کی تعلیم دو۔ (تاریخ قرآن، ڈاکٹر محمود رامیار۔ صفحہ ۲۱۳۔ بحوالہ کتاب المصاحف۔ ابن ابی داؤد) خود حضورؐ

ﷺ کبھی نازل ہونے والی آیات کو پہلے صحابہ کے مجمع میں اور پھر صحابیات کے مجمع میں قرأت فرماتے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ لوگ مسجد میں نماز کے دوران، یا بغیر نماز کے، قرأت کر رہے ہوتے، اور ایسے میں حضورؐ وہاں آ جاتے، یا پہلے سے تشریف فرما ہوتے تو غور سے اس کی سماعت فرماتے۔ اور اگر ضرورت محسوس فرماتے، تو کبھی فوراً اور کبھی بعد میں اس کی تصحیح فرما دیتے۔

صحابہ کرامؓ کی ایک طویل فہرست ہے جو قرآن مجید کی کئی کئی سورتیں براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھتے تھے۔ اور بعد میں اگر کسی لفظ کی ادائیگی میں صحابہ میں اختلاف ہو جاتا تو اس کی بات کو سند قرار دیا جاتا جس نے قرأت خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی ہوتی تھی۔

جب کوئی قبیلہ ایمان لاتا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شاگردوں میں سے قرأت سیکھ جانے والے صحابیوں کو ان نومسلموں کے پاس بھیجتے تاکہ وہ انہیں قرآن پڑھائیں۔ ان معلمین قرأت کو بعض اوقات تکلیف دہ اور ناخوشگوار حادثات کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔ ایک مرتبہ ماہ صفر سنہ ۴ ہجری میں دس صحابہؓ کی جماعت، عضل کے نومسلم عربوں کو قرآن کی تعلیم دینے جا رہی تھی کہ مکہ کے قریب، ایک کنویں، رجیع کے پاس کفار نے ان کو پکڑ لیا۔ اور تمام کے تمام قاریوں کو شہید کر دیا۔ اسی طرح جنگ احد کے بعد بنی عامر کے قبیلے کی تعلیم کے لئے انصار مدینہ کے ستر قاریان قرآن کی جماعت پر، مدینہ سے مکہ کے راستے میں، بیر معونہ کے مقام پر کفار نے حملہ کر دیا اور سب کو شہید کر دیے۔ اس واقعہ کے بعد ہی نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے شدید رنج پہنچا تھا۔ آپؐ روزانہ فجر کی نماز میں دعا مانگتے۔ اور اس دعا میں قاریانِ

قرآن کے قاتلوں پر نفرین کرتے۔ گویا اس معمول سے آپؐ نے جہاں دعائے قنوت کی سنت قائم فرمائی وہاں خدا، رسولؐ اور اسلام کے دشمنوں پر تبرا بھیجنے کی سنت بھی قائم کر دی۔ (واقدی، ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ابن کثیر، زاد المعاد، تاریخ خمیس، فتح الباری، بخاری وغیرہ۔ نقل حوالہ از تاریخ قرآن۔ ڈاکٹر محمود رامیار صفحہ ۲۱۱)

قرآن مجید پر غور و فکر کرنا تو قرآن کا ایک تقاضہ تھا ہی، لیکن قرأت قرآن کو بھی غلطیوں سے پاک رکھنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کو تیزی سے پڑھنے سے منع فرماتے۔ بعض پُر جوش صحابہ تلاوت کے لئے بیٹھتے تو پورا قرآن ایک دن میں ختم کر دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طریقے سے منع فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن مجید کو کم از کم تین دنوں میں ختم کیا کرو۔ اس سے کم مدت میں قرآن کو ختم کرنے والا، نہ تو قرآن پر غور کر سکتا ہے نہ اسے سمجھ سکتا ہے۔ خود قرآن نے بھی حکم دیا کہ:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ﴾۔ (القیامۃ، ۷۵، آیات: ۱۶، ۱۷)

یعنی اپنی زبان کو جلدی کی خاطر تیز تیز حرکت نہ دو۔ قرآن کو جمع کرنا اور اس کی قرأت کرانا ہمارا کام ہے۔ یہاں وہ لوگ ضرور غور فرمائیں جو اپنے حافظے اور حفظ کا کمال دکھانے کے لئے قرآن کے ایک ایک سیپارے کو آٹھ آٹھ منٹ میں ختم کرتے ہیں اور پھر اس تیز رفتاری پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔

خود سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی اکثر تلاوت فرماتے۔ اور دورانِ تلاوت ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کر پڑھتے۔ آپؐ کی قرأت ترتیل اور مد کے ساتھ ہوتی۔ جہاں ایسی آیت آجاتی جس میں اللہ کی پناہ کا ذکر ہوتا تو آپؐ اللہ کی پناہ طلب کرتے۔ حکم دعا پر رک کر دعا فرماتے۔ آیات رحمت پر اللہ سے رحمت مانگتے۔ اگر آیت تقاضہ

سوال کرتی تو آپ سوال فرماتے۔ آج جو ہم نماز میں، یا تلاوت کے دوران سورۃ الحمد پڑھ کر یا سن کر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کہتے ہیں، یا سورہ توحید کی تلاوت کے بعد ﴿كَذٰلِكَ اللّٰهُ رَبِّيْ﴾ کہتے ہیں، تو یہ حضورؐ ہی کی قائم کردہ سنت پر عمل کرتے ہیں۔

یہ تمام روایتیں، اور ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی ہی روایتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضورؐ نے قرآن کے حروف اور الفاظ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کو پڑھنے، اور اس کے الفاظ کو ادا کرنے کا بھی ایسا اہتمام فرما دیا تھا کہ خود آپ کی موجودگی میں قرآن کی صحیح قرأت مسلمانوں کے بچے بچے کی زبان پر جاری تھی۔ ہر فرد اس طرزِ ادا سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اور جب ہر فرد اس طرزِ ادا سے واقف بھی تھا اور اس پر پوری طرح عمل پیرا بھی تھا۔ تو یہ قرأت متواتر تھی۔ اور جو بات متواتر ہو، جسے ثابت کرنے کے لئے کسی کی شہادت کی ضرورت پیش نہ آئے، جسے بیان کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان سب کا کسی غلط بات پر متفق ہو جانا عقلاً محال ہو، اس کے درست ہونے کے لئے کسی سند، کسی اتھارٹی کی ضرورت نہ ہو، بلکہ وہ بات اتنی عام ہو جائے کہ خود اپنا معیار، اپنا پیمانہ بن جائے تو ایسی بات اپنی حفاظت کے لئے افراد کی محتاج نہیں ہوا کرتی۔ جس طرح قرآن مجید کے الفاظ متواتر ہیں اسی طرح قرآن مجید کی قرأت متواتر ہے۔ اور یہ تواتر خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیا ہوا ہے۔ یعنی جس طرح آپؐ نے بتایا کہ آپؐ کی زبان سے نکلنے والے کون سے الفاظ قرآن ہیں، اسی طرح آپؐ ہی نے بتایا کہ ان الفاظ کو کس طرح ادا کیا جائے۔ اور جس طرح آپ کا دیا ہوا قرآن بغیر رد و بدل کے، بغیر کسی کمی بیشی کے، جیسے دیا گیا تھا اسی طرح آج تک محفوظ ہے، بالکل اسی طرح آپ کی بتائی ہوئی قرأت بھی، آج چودہ سو سال کا سفر طے کرکے ہم تک اسی طرح پہنچی ہے جس طرح سکھائی گئی تھی۔ قرآن کے الفاظ بھی متواتر ہیں اور قرآن کی قرأت بھی متواتر ہے۔ اب اس جملے

کے کوئی معنی نہیں ہوں گے کہ قرآن سات یا دس قرأتوں میں نازل ہوا، یا بعد کے کسی حکمران نے مسلمانوں کو ایک قرأت پر جمع کیا۔ نہ قرآن کے الفاظ کی حفاظت میں کسی انسان کا دخل ہے، نہ قرآن کی قرأت کی حفاظت میں کسی انسان کا کوئی ہاتھ ہے۔ اللہ کے رسول نے اپنی امت کو جس قرأت پر جمع کرنا چاہا خود کیا۔ اور امت آج تک اسی قرأت پر پوری طرح قائم ہے۔ مجھے یہ تفصیل عرض کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عہد حاضر کے ممتاز عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کہا کہ خلافت ثالث میں قرآن تو نہیں جمع کیا گیا تھا البتہ اس عہد میں مسلمانوں کے قرأت کے اختلافات دور کرکے انہیں ایک قرأت پر جمع کیا گیا تھا۔ (بحوالہ خطباتِ بہاولپور۔ تاریخ قرآن مجید) ڈاکٹر صاحب موصوف نے مؤرخین کی پھیلائی ہوئی ایک غلط فہمی کو تو خود دور کردیا کہ قرآن تیسری خلافت کے زمانے میں جمع کیا گیا۔ میں باقی ماندہ دوسری غلط فہمی دور کرتے ہوئے عرض کررہا ہوں کہ جس طرح قرآن مجید خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگرانی میں جمع ہو چکا تھا، اسی طرح قرآن کی قرأت بھی خود حضور ہی نے تعلیم فرمادی تھی۔ نہ قرآن کے جمع کرنے کا کام آپؐ کے سوا کسی دوسرے نے کیا، نہ اس کی قرأت میں آپؐ کے سوا کسی دوسرے کا دخل ہے۔

قرأت۔ حضور کی ذمہ داری کیوں؟

یہاں ایک سوال کا جواب دے دینا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن کی قرأت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بجائے کسی اور نے رائج کی تو ایسا ماننے میں حرج ہی کیا ہے؟ تو میں گزارش کروں گا کہ اصولی طور پر پہلے یہ طے کرلیجیے کہ قرأتِ قرآن کی اہمیت کیا ہے۔ یعنی اگر صورت حال یہ ہے کہ قرأت کے اختلاف سے قرآن مجید کے معنی اور مفہوم پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قرأت کسی طرح سے بھی کی جائے قرآن

محفوظ رہتا ہے تو پھر مجھے اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کا جو دل چاہے کہتے رہیے۔ تاریخ اور شہادتیں آپ کا ساتھ دیں یا نہ دیں، آپ جس کے سر چاہیں قرأت کا سہرا باندھیں۔ کیونکہ اس طرح قرأت ایک غیر ضروری مسئلہ ہو جائے گی۔ لیکن جہاں آپ نے کہا کہ اگر قرأت پر اتفاق نہ ہوتا تو قرآن محفوظ نہ رہتا۔ تو یہاں اصولی اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ حفاظت قرآن سے تعلق رکھنے والی کوئی ذمہ داری کسی غیر معصوم کے سپرد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

اور ویسے بھی قرأت قرآن خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض نبوت کا اولین جزو تھی۔ بحیثیت خدا کے رسولؐ کے یہ آپؐ کی پہلی ذمہ داری تھی کہ آپ خود قرأت کی تعلیم دیں۔ سورۂ جمعہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ بقرہ میں فرائض نبوت کی جو فہرست دی گئی ہے، اور جس مسلسل یکساں ترتیب سے فرائض نبوت بتائے گئے ہیں، ان میں سب سے پہلا فرض یہ قرار دیا گیا ہے کہ:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِه﴾

یعنی آپؐ ہی قرآن کی آیات کی تلاوت کریں گے۔ اور تلاوت ہی قرأت ہے۔ یعنی آپؐ ہی قرأت کی تعلیم دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ قرأت قرآن کو خود رسولؐ کے سپرد کیوں کیا گیا۔ خیال رہے کہ قرآن کا پہنچانا اور قرآن کی تلاوت کرنا دو مختلف کام ہیں۔ قرآن کا پہنچانا یا اس کا ابلاغ یقیناً اسی ذات کا کام تھا جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔ لیکن جہاں تک قرآن کی تلاوت کا تعلق ہے وہ بہت سے خوش الحان قاری آج بھی کرتے ہیں، اور عہد رسالتؐ میں ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جو یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کر سکتے تھے۔ پھر کیوں ضروری تھا کہ یہ کام بھی خود آنجنابؐ ہی کے حوالے کیا جائے۔ تو بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی بات کے مطلب اور معنی کا دارومدار صرف

ان الفاظ پر نہیں ہوتا جن میں بات کی جائے۔ بلکہ بات کے معنی میں ایک اور چیز کا بڑا دخل ہوتا ہے جسے بات کا لہجہ کہتے ہیں۔ لہجہ بعض اوقات ہاں کو نہیں میں، اقرار کو انکار میں، سوال کو جواب میں بدل دیتا ہے۔ اب خدا کو اپنی بات انسانوں تک پہنچانی تھی۔ اگر لوگوں تک صرف الفاظ قرآن پہنچتے تو ممکن ہی نہیں یقینی تھا کہ وہ قرآن کے مفہوم سے نا آشنا رہتے۔ اس لئے ضروری تھا کہ قرآن جس کا کلام تھا اسی کے لہجے میں نازل ہوتا۔ لیکن لہجہ کیسے نازل ہوتا؟ کیونکہ لہجے کے لئے ضروری ہے کہ کلام کرنے والا اپنے مخاطب کے سامنے ہو۔ اب کلام تھا اللہ کا۔ وہ خود تو انسانوں کے سامنے آنے سے رہا۔ اس لئے کہ وہ سامنے آنے والا جسم رکھتا تو سامنے آتا۔ وہ تو جسم و جسمانیات سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی چہرہ کہ اسے دیکھ سکتے، نہ اس کی کوئی زبان کہ وہ کچھ کہتا اور ہم سن سکتے۔ تو اب ضرورت تھی ایک ایسے وسیلے کی جو اللہ سے اتنا قریب ہو کہ اس کے لہجے کو جان سکے، اور جو ایسا امانت دار ہو کہ اس لہجے کو بغیر کمی بیشی کے ہمارے لہجے میں منتقل کر کے ہم تک پہنچا سکے۔ یہ شرائط ایسی تھیں کہ سوائے ذات رسالتؐ کے اور کوئی یہ کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ یہ حکم خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا کہ وہ صرف قرآن کے الفاظ ہی نہ پہنچائیں بلکہ اس کی تلاوت بھی کر دیں۔ تاکہ مخلوق تک خالق کا کلام بھی پہنچے اور کلام کا مفہوم بھی پہنچے۔

اور اس واقعہ پر ایک اہم نتیجے کی طرف توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ قرآن مجید کی اور بہت سے آیات نہ ہوتیں اور صرف یہی ایک حکم تلاوت ہوتا تو یہی ایک حکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لہجے کی عصمت کی دلیل ہوتا۔ یعنی یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ کا رسولؐ جو کچھ کہتا ہے صرف وہی اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ جس لہجے میں کہتا ہے وہ بھی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن کو اس خصوصیت سے نازل کیا گیا کہ قدم قدم پر مسلمان قرآن سننے کے ساتھ ساتھ رسولؐ کی طرف دیکھتا جائے کہ وہ لفظ کو ادا کرتے ہوئے کیا عمل کر رہے ہیں۔ قرآن کہے کہ نماز قائم کرو تو مسلمان اپنے نبیؐ کی طرف دیکھے کہ نماز کیسے قائم کی جا رہی ہے۔ قرآن کہے کہ روزہ رکھو تو مسلمان دیکھے کہ حضورؐ کیسے روزہ رکھ رہے ہیں۔ قرآن کہے کہ اے حبیبؐ ہم نے آپ کے اہل بیتؑ کو اس طرح پاک رکھا ہے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے تو مسلمان پر واجب ہے کہ دیکھے کہ تلاوت کے وقت رسولؐ کن ہستیوں کو چادر میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ قرآن کہے کہ اللہ کے رسولؐ آپ اللہ کے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دیجیے، اگر یہ پیغام نہ پہنچا تو اب تک کی ساری تبلیغ بیکار جائے گی۔ تو اب مسلمانوں کی مجبوری ہوگی کہ وہ آنکھ کھول کر دیکھیں کہ اب رسولؐ کس کو بلند کر کے اس کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ الفاظ کے معنی بتانے ہی کی ضرورت تھی کہ قرآن نے کہا کہ اے رسولؐ ان کلمہ پڑھنے والوں سے کہہ دیجیے کہ اجر رسالت دینا ہے تو قربیٰ سے مودت کریں۔ تو اس فرمان کے ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ قربیٰ کون ہیں اور ان سے کس طرح مودت کی جائے۔

اور اللہ کے امانت دار رسولؐ نے قرآن کے ہر لہجے کو واضح کیا، ہر اشارے کا مطلب بتایا۔ انہوں نے پوری طرح سمجھایا کہ صلوۃ کیا ہے، صوم کیا ہے، اہل بیتؑ کون ہیں، آیۂ بلغ کا مصداق کون ہے، قربیٰ سے کون شخصیتیں مراد ہیں۔ کبھی نام لے کر بتایا، کبھی چادر میں لے کر بتایا، کبھی کاندھے پر چڑھا کر بتایا، کبھی اپنے بستر پر اپنی جگہ سُلا کر بتایا۔ کبھی یہ کہہ کر بتایا کہ یہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ کبھی اس طرح بتایا کہ ان کی رضا میری رضا سے ہے، ان کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ غرض ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قرآن کوئی اشارہ کرے اور رسولؐ اس اشارے کا مطلب نہ بتائیں، قرآن کی کی

صفت بتائے اور رسولؐ صاحب صفت کا تعارف نہ کرائیں۔ اگر رسولؐ نہ بتاتے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ مسلمان خاموش رہ جاتے۔ وہ مسلمان جو اللہ کے کسی حکم کو اپنی خواہش نفسانی کے خلاف پاکر یہ پوچھ لیا کرتے تھے کہ یہ حکم آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ مسلمان کیسے نہ پوچھتے کہ آیۂ تطہیر میں جن اہل بیتؑ کی مکمل طہارت کا ذکر ہے وہ غیر معمولی لوگ کون ہیں۔ اگر اہل بیتؑ کا مطلب نہیں پوچھا تھا تو آیۂ مودت کے قربیٰ کو تو ضرور پوچھتے اس لئے کہ ان کی مودت کا حکم دیا جا رہا تھا۔ اور مودت ہو ہی نہیں سکتی تھی جب تک یہی نہ معلوم ہو کہ مودت کے مستحق کردار کون سے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اللہ کے ان اشاروں کا مطلب نہیں پوچھا تو اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی دیر کی ہی نہیں۔ ادھر اللہ نے اشارہ کیا، ادھر رسولؐ نے اشارے کو اس کے مصداق تک پہنچا دیا۔ اب اگر مسلمان قرآن کے اشاروں کو سمجھنے سے انکار کر دیں تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں بتایا نہیں گیا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جان بوجھ کر حکم خدا پر عمل نہیں کرنا چاہتے تھے۔

بات یہ نہیں تھی کہ قربیٰ کے معنی نہیں معلوم تھے۔ اہل بیتؑ کا مطلب نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس، زمانے نے آل محمدؐ کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ اسی لئے تھا کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ ہستیاں کون ہیں، اور اسلام کی بقاء اور قرآن کی حفاظت میں ان کا کیا کردار ہے۔ وہ جو کل قرآن کو کافی کہہ کر قول رسولؐ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھے، اور جو آج اہل بیتؑ کے وجود کو مٹا دینا چاہتے تھے، وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ قرآن اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک وہ آل محمدؐ کے پاس ہے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ ماضی میں جب بھی کتاب الٰہی، اس کے وارثوں سے لاتعلق کر کے امت نے اپنے ہاتھوں میں لی تو کتاب کو کھلونا سمجھ لیا گیا۔ اس میں تحریف کی کوشش بھی کی گئی۔ اس میں لفظی رد و بدل

کبھی کرنے کی تمنا کا اظہار بھی کیا گیا، معنی کو بھی اپنی خواہشات کے تابع کیا جاتا رہا۔ چنانچہ جو یہ چاہتے تھے کہ قرآن بھی توراۃ بن جائے، انجیل بن جائے، انہوں نے ایک مرتبہ قرآن کو کافی کہہ کر اسے اہل بیت سے الگ کرنا چاہا۔ جب یہ ممکن نہ ہوا تو اہل بیت کے وجود کو ہی مٹا دینا چاہا۔ اس لئے کفر نے نفاق کا لبادہ اوڑھ کر، یہ ارادہ کیا کہ کتاب کے وارثوں کو کتاب سے الگ کر دیا جائے۔ یہ دشمنی آل محمدؐ سے نہیں تھی۔ یہ تو کفر کی اسلام سے وہ لڑائی تھی جو فتح مکہ کے بعد اب کربلا میں لڑی جا رہی تھی۔ یہ تسلسل تھا بدر کا، احد کا۔ اسی لئے تو یزید نے اپنے سامنے حسین علیہ السلام کے کٹے ہوئے سر کو دیکھ کر کہا تھا کہ کاش آج مقتولین بدر ہوتے تو دیکھتے کہ یزید نے ان کا انتقام لے لیا ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۹

قرآن ایک کتاب ہے

اللہ کا اعلان ہے کہ ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پروردگارِ عالم کا یہ اعلان انسان کے علم میں چودہ سو سال پہلے آیا۔ اس وقت سے آج تک انسان کا مشاہدہ ہے کہ اس عرصہ میں قرآن مجید ہر آفت، ہر تحریف، ہر ردوبدل سے محفوظ رہا۔ اپنے نزول کے بعد سے آج تک ہر عہد میں اس کے وجود میں تسلسل ہے۔ اس کی ترتیب میں تسلسل ہے۔ اس کی قرأت میں تسلسل ہے چنانچہ حفاظت کے تمام تقاضوں کے ساتھ اللہ کا یہ قول ایک زندہ صداقت کے طور پر ہمارے سامنے ہے کہ قرآن محفوظ ہے۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر یہ سوال نہیں کہ قرآن محفوظ ہے یا نہیں۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے کہ قرآن محفوظ ہے۔ ہم تو اس سلسلۂ گفتگو میں ان عوامل کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں جن کو اللہ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذریعہ بنایا اور اس سلسلے میں گزشتہ روز کے جائزے میں یہ اہم حقیقت سامنے آئی کہ نزولِ قرآن سے آج تک ہر چند کہ حافظوں کی ایک بڑی جماعت ہر زمانے میں موجود رہی جو قرآن مجید کو اپنے حافظے میں محفوظ کرتی رہی۔ لیکن خود قرآن مجید اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ان حافظوں کا احسان مند نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حافظوں نے جب بھی قرآن

مجید کو حفظ کیا تو کبھی قرآن کی حفاظت کی خاطر نہیں بلکہ جب بھی حفظ کیا تو اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے کیا۔ عام مسلمان نے جزوی طور پر قرآن کو یاد کیا۔ اس کی کچھ چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کیں تو اس لئے کہ اسے اپنی نماز کی ادائیگی کے لئے ان کی ضرورت تھی یا عہد رسالتؐ میں بہت سے لوگوں نے قرآن کو حفظ کیا تو اس لئے کہ وہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ اگر یاد نہ کرتے تو قرآن سے متعلق، برقرار نہ رہتا۔ آج حافظان قرآن کی بڑی تعداد ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو بینائی سے محروم ہیں بلکہ ہم تو بینائی سے محرومی اور حفظ قرآن کو اس طرح لازم وملزوم سمجھنے لگے ہیں کہ جہاں کوئی نابینا نظر آتا ہے اسے حافظ جی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ تو اگر ان حافظوں نے قرآن کو حفظ کیا ہے تو اپنی کسی ضرورت کے تحت۔ اس سے انکار نہیں کہ ہر دور میں مسلمانوں میں حفاظ کا ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جو بغیر کسی ضرورت کے، بغیر کسی مجبوری یا معذوری کے، محض عقیدت واحترام کے جذبہ کے تحت قرآن مجید کو حفظ کرتے رہے لیکن ایک تو ایسے حافظوں کی تعداد بہت کم رہی اور دوسرے ان کے حفظ کا مقصد بھی حفاظت قرآن نہیں بلکہ اپنی سعادتوں میں، اپنے اجر وثواب میں اضافہ کرنا تھا۔ چنانچہ قرآن جب اور جہاں حفظ کیا گیا، کبھی وہاں یہ حفظ کرنا حافظ کی مجبوری تھا۔ کبھی اس کی معذوری سبب بنی، کبھی ذریعۂ معاش کے لئے قرآن حفظ کیا گیا، کبھی اجر وثواب اور آخرت کے لئے قرآن حفظ کیا گیا۔ قرآن کبھی اس لئے حفظ نہیں کیا گیا کہ اگر حفظ نہ کیا گیا تو ضائع ہو جائے گا۔ ختم ہو جائے گا۔ گویا حفظ، قرآن کی حفاظت کا ذریعہ کسی دور میں بھی نہیں رہا۔

قرآن ایک کتاب ہے

تو اب سوال یہ ہے کہ قرآن ہزاروں لاکھوں افراد نے یاد کیا اور ہر دور میں یاد

گیا۔ کوئی عہد نہیں جو حفاظ کی ایک کثیر تعداد دنیا میں موجود نہ رہی ہو۔ اس کے باوجود حافظے میں موجود قرآن کو، قرآن کی حفاظت کی ضمانت نہیں سمجھا گیا۔

تو پھر قرآن نے اپنی حفاظت کے لئے کون سی صورت اختیار کیا یا کس شکل کو خود متعارف کرایا۔ تو اس بات کو جاننے کے لئے کسی غیر معمولی تلاش یا جستجو کی ضرورت نہیں۔ قرآن نے اپنے نزول کی ابتدائی منزل سے آخری آیت کے اترنے تک اپنے آپ کو کانوں سے سنی ہوئی اور یادداشت میں محفوظ بات کے طور پر کبھی پیش نہیں کیا۔ بلکہ یہ عجیب بات ہے کہ لکھنے پڑھنے کی صفت سے زیادہ تر محروم معاشرے میں قرآن مجید نے اپنی جتنی بھی تصویریں بنائیں، وہ ایک کتاب، ایک تحریر کی تھیں۔ اگر عالم ملکوت میں ذکر کیا تو وہاں بھی لوح محفوظ پر لکھی ہوئی تحریر کے طور پر اور زمین پر اتارا تو بھی ایک کتاب کہہ کر۔

کبھی ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ﴾۔ (بقرہ، آیت:۲)

ہر شک وشبہ سے بالاتر کتاب ہے۔

﴿قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا م بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتَابِ﴾۔ (سورہ رعد،۱۳، آیت ۴۳)

ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ رسالت کی گواہی کے لئے بس یہی دو کافی ہیں، ایک اللہ اور دوسرا وہ فرد جو علم کتاب رکھتا ہے۔

﴿قَدْ جَآءَ کُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ﴾۔

(سورۂ مائدہ، ۵، آیت ۱۵)

اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور آیا ہے اور ایک روشن

کتاب آئی ہے۔

غرض پورے قرآن میں الکتاب کا لفظ دوسوتیں (۲۳۰) مرتبہ آیا ہے اور ان تمام مقامات میں سے کم سے کم دوتہائی مقامات پر اس لفظ سے مراد قرآن حکیم ہی ہے بلکہ قرآن حکیم خود اپنا نام بتاتے ہوئے خود کو قرآن کم کہتا ہے اور الکتاب کے نام سے اپنا تعارف زیادہ کراتا ہے۔

کفار کا ایک اعتراض

قرآن مجید کے ایک کتاب ہونے کی اس سے بڑی شہادت کیا ہوگی کہ کفار اگر قرآن مجید پر کوئی اعتراض کرتے ہیں تو یہ کہہ کر کہ جو کچھ تم نے کہا ہے ہم اس قول کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ جب بھی قرآن پر اعتراض ہوا تو ایک تحریر، ایک کتاب قرار دیتے ہوئے اعتراض کرنے والوں نے اعتراض کیا۔ خود قرآن مجید نے بعض اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے۔

سورۃ فرقان، قرآن مجید کی پچیسویں سورہ، اس کی پانچویں آیت میں ارشاد ہوا:

﴿وَ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾۔

(کافر) کہتے ہیں کہ یہ تو پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں جسے پیغمبرؐ نے لکھوالیا ہے اور اسی کتاب سے روز پڑھ کر سناتے رہتے ہیں۔

اب انصاف کیجئے کہ عہد رسالتؐ میں قرآن کا دشمن تک مان رہا تھا کہ قرآن

ایک کتاب کی صورت میں موجود ہے اور مسلمان یہ کہہ رہا ہے کہ رسولؐ کے بعد بیس پچیس سال تک قرآن ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا اور اگر ہم اسے کتاب کی صورت میں جمع نہ کر لیتے تو بعد کی نسلیں قرآن سے محروم ہو جاتیں۔

کتاب خدا کی تعلیم فریضۂ نبوت ہے

اگر اب بھی نیک دل مسلمان اپنی عقیدتوں سے مجبور ہو کر یہی کہتا رہے کہ نہیں، قرآن کو کتابی شکل بعد میں دی گئی۔ عہد رسالتؐ میں تو یہ محض اجزائے پریشاں کی صورت رکھتا تھا تو میں اپنے مخلص بھائی کی توجہ اس طرف دلاؤں گا کہ اللہ نے اپنے نبیؐ کے ذمہ عہدۂ نبوت کیا تو فرائض عہدہ بھی بتا دیئے اور ہمیں بھی کم و بیش چار مقامات پر، کبھی حضرت ابراہیم ؑ کی دعا کے طور پر، کبھی دعا کی قبولت کا ذکر کرتے ہوئے، کبھی اپنی طرف سے اعلان کرتے ہوئے، اس نے واضح کر دیا کہ ہم نے نبیؐ کو کیوں بھیجا ہے۔ چاروں مقامات پر فرائض نبوت کی فہرست ایک ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم نے اپنے رسولؐ کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ ہماری آیات کی تلاوت کرے۔ ہمارے بندوں کے نفوس کی خرابیوں کو پاک کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ (سورۃ بقرہ ۲، آیات ۱۲۸ تا ۱۳۰، بقرہ ۲۰۔۱۵۲، آل عمران: ۳۔۱۵۶، جمعہ ۶۲۔۳) اب اگر نبیؐ کے سپرد کوئی کام کیا جائے اور نبیؐ وہ فریضہ ادا کیئے بغیر دنیا سے چلا جائے تو اس کا انتخاب ہی غلط ہوگا۔ نعوذ باللہ اگر حضورؐ قرآن کی آیات میں سے کچھ آیات کی تلاوت نہ کرتے اور دنیا سے چلے جاتے، کچھ برائیوں سے پاک ہونے کا نسخہ نہ بتاتے اور ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتے۔ تو نبوت تو ادھوری ہی رہتی، اللہ پر بھی الزام آتا کہ ایسے کو نبی کیوں بنایا جو اپنی ذمہ داری پوری نہ کر سکتا ہو... تو جس طرح نبیؐ اپنے سپرد ہونے

والے باقی فرائض کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ اس اہم فریضے کو کیسے ترک کر سکتے ہیں کہ ہمیں کتاب کی تعلیم دے کر جائیں اور اگر آپؐ نے اپنا یہ فرض ادا کیا اور اگر کا یہ سوال ہے آپ نے لازماً اپنا فرض ادا کیا۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر کتاب تھی ہی نہیں تو تعلیم کس چیز کی دی۔ اللہ کے نظام کو انسان کے نااہل تعلیمی اداروں کی کارکردگی سے تو نہ ملایئے کہ بچوں کا تعلیمی سال ختم ہو جائے اور ان کے سلیبس میں درج شدہ کتاب چھپ کر ہی نہ آئے۔ لازماً معلم قرآن کے ہاتھ میں قرآن بصورت کتاب تھا۔ تب ہی آپؐ نے اس کی تعلیم دی۔

حدیث ثقلین اور قرآن کا کتاب ہونا

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دوں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب کا مطلب ہمیشہ باقاعدہ شروع سے آخر تک مکمل، جلد بندھی ہوئی کتاب ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ صفحات بھی کتاب ہیں جو کوئی لکھنے والا، ترتیب دینے والا ابھی تک لکھ رہا ہے۔ میز پر چند ہاتھ سے لکھے ہوئے کاغذ رکھے تھے۔ پوچھنے والے نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' مصنف نے کہا: یہ میری نئی کتاب ہے رفتہ رفتہ دو ماہ تک مکمل ہو جائے گی۔ گویا کتاب بننے کے لئے پوری کتاب ہونا ضروری نہیں۔ اس کا جزو بھی کتاب ہی کہلائے گا۔ چنانچہ قرآن نے جب خود کو کتاب کہا تو اس کا مطلب یہی لینا چاہیے کہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ کتاب بنے ورنہ جب نازل ہو رہی تھی اس وقت کتاب نہیں تھی۔ بالکل درست بات ہے۔ قرآن نے بلا شک و شبہ اپنی نامکمل کیفیت کو بھی کتاب ہی کہا۔ اس نے جزو کتاب کو بھی کتاب کہا۔ جب قرآن مکہ میں نازل ہو رہا تھا۔ تو یقیناً ابھی کتاب نہیں بنا تھا۔ جب مکی سورہ، سورہ طور میں خود کو کتاب کہہ رہا تھا۔ اس وقت بھی مکمل کتاب نہیں تھا۔ جب مدینہ میں قرآن نازل

ہو رہا تھا تو وہاں نازل ہونے والی پہلی سورہ بقرہ کے بعد بھی بہت سا قرآن نازل ہونے والا تھا۔ لیکن سورہ بقرہ میں اس نامکمل جزو کو بھی کتاب کہا گیا۔ الغرض ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نزول قرآن کے ابتدائی دنوں سے قرآن کی آخری سورۃ کے نزول تک درمیان میں جب جب کتاب کا لفظ آیا تو اس وقت تک قرآن مکمل کتاب نہیں بنا تھا

بالکل درست۔ لیکن اب میری الجھن دور کیجیئے کہ پیغمبرؐ کی حیاتِ ظاہری کے آخری ایام ہوں۔ حضورؐ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنا آخری خطاب فرما رہے ہوں اس خطاب کی اہمیت اتنی زیادہ کہ کامیابی سے حج کا فریضہ ادا کر کے خوشی خوشی گھر جاتے ہوئے لوگوں کو راستے میں روک لیا جائے۔ تپتی دھوپ میں سب کو جمع کیا جائے۔ آگے گئے ہوئے اور پیچھے رہ جانے والوں کے بھی پہنچ جانے کا انتظار کیا جائے۔ سفر کرتے ہوئے اونٹوں کی پشت پر بندھے ہوئے ساز و سامان کے نیچے کسے ہوئے پالان کھولے جائیں۔ اور پھر ان پالانوں کو جمع کر کے ایک اتنا بلند ممبر تعمیر کیا جائے کہ ہر شخص کو خطاب کرنے والے کو دیکھ بھی سکے اور سن بھی سکے . . . اتنے بہت سے اہتمام کے بعد حضورؐ اس ممبر پر تشریف لے گئے اور خطاب شروع کیا۔ پہلے ہی کا اہتمام کیا کم تھا کہ اب آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ کہ لوگو! ممکن ہے میں زیادہ دیر تک تمہارے درمیان نہ رہوں۔ یہ آغاز ہی، مسلمان، ہر سچے مسلمان کے دل کو مضطرب کرنے کے لئے کافی تھا کہ اس پر اضافہ فرمایا۔ لوگو! گواہی دو کہ میں نے اللہ کا پیغام پوری طرح تم تک پہنچا دیا۔ گواہی دو کہ میں نے تمہاری ہدایت کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ سب بتا دیا . . پورے مجمع نے تصدیق کی۔ یہ تصدیق بتا رہی ہے کہ ہر شخص سمجھ رہا ہے کہ حضورؐ کا اس مجمع سے یہ آخری خطاب ہے۔ اب حضورؐ ہمارے درمیان زیادہ دیر تک نہیں رہیں گے۔ اس خیال کی تصدیق اگلے جملے سے ہو گئی جب حضورؐ نے فرمایا:

﴿انی تارکم فی کم ﴾

''میں تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں۔ یہ میرا ترکہ ہے''

اب اس ترکے کی تفصیل بتائی:

﴿الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اهلبیتی﴾

دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب اور دوسرے میرے اہل بیت۔

اور پھر مزید ارشاد فرمایا کہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ رہیں گے حتیٰ کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں اور اگر تم نے ان کا دامن تھام لیا تو تم گمراہ نہیں ہوگے

اب غور فرمایئے کہ ان مسلمانوں نے حضور کی بارگاہ میں اس لئے حاضری دی تھی۔ اس لئے اسلام قبول کیا تھا کہ وہ گمراہی سے بچ جائیں۔ اب حضورؐ دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ پہلے تو میرے پاس آتے تھے، اب گمراہی سے بچنے کے لئے ان کے پاس جانا جن کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اب آپ نے چھوڑی تو دو گراں قدر چیزیں تھیں۔ لیکن فی الحال میرا موضوع ان میں سے ایک ہی جزو ہے کہ حضور فرما رہے ہیں کہ گمراہی سے بچنا ہے تو کتاب سے اپنا رشتہ نہ توڑنا۔ اب کیا اس موقع پر بھی کتاب سے مراد ادھوری کتاب ہوگی؟ نامکمل کتاب ہوگی؟ اس وقت حضور کا لوگوں سے تصدیق کرانا کہ میں پیغام خدا پہنچا چکا ہوں۔ اس کے بعد فرمانا کہ اب یہ کتاب تمہارے درمیان چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اعلان اور پھر اس کی تصدیق اعلان کا واحد مطلب یہ ہوگا کہ اس کتاب کی بات ہو رہی ہے جو ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ اور جسے بطور کتاب کے ہر مسلمان پہچانتا ہے۔ ورنہ اتنے بڑے مجمع میں کوئی تو پوچھتا کہ حضورؐ وہ کتاب ہے کہاں جسے آپ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ نہ کسی پوچھنے والے نے پوچھا۔ نہ حضورؐ کے ارشاد پر کسی نے حیرت کا اظہار

کیا۔ یہ سب دلیل ہے کہ اس وقت قرآن ایک مکمل کتاب کی صورت اختیار کر چکا تھا اور تمام مسلمان اس کتاب سے پوری طرح واقف تھے۔

حدیث قرطاس اور قرآن کا کتاب ہونا

غدیر میں موقعہ تھا کہ اگر قرآن بصورت کتاب نہیں تھا تو مسلمان حضورؐ سے دریافت کرتے کہ وہ کتاب کہاں ہے جو آپ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ پھر اس کے چند روز بعد ہی ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ یہی سوال حضورؐ کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ یہ موقعہ اس وقت آیا جب آنجنابؐ نے بستر علالت پر مسلمانوں سے کہا کہ مجھے قلم دوات لا دو تا کہ ایسی بات لکھوا دوں کہ تم قیامت تک گمراہی سے بچ جاؤ۔ اس مرحلے پر قلم دوات فراہم کرنے سے اس بنیاد پر انکار کیا گیا کہ ﴿حسبنا کتاب اللّٰہ﴾ ''ہمارے لئے اللہ کی کتاب ہی کافی ہے۔'' (بحوالہ صحیح بخاری کم از کم سات جگہ:۔ کتاب العلم، باب کتابت العلم، کتاب الجہاد باب ھل یستشفع، کتاب الخمس باب اخراج الیہود، باب مرض النبیؐ دو جگہ، کتاب المرضی باب قول المریض، کتاب الاعتصام بالکتاب و السنۃ باب کراہۃ الاختلاف) اس موقع پر اگر قرآن کتاب نہ ہوتا تو کیا حضورؐ کی طرف سے یہ سوال نہ ہوتا کہ نا سمجھو! جس کتاب کو کافی سمجھ کر اب خود کو نبیؐ کے ارشاد سے بھی بے نیاز قرار دے رہے ہو۔ وہ کتاب ہے کہاں؟ لیکن اپنے وقت پر مسلمانوں نے نہیں پوچھا اور جب رسولؐ کو پوچھنا چاہئے تھا تو انہوں نے نہیں پوچھا۔ تو مان لیجیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو آگاہ تھے ہی۔ ہر مسلمان بھی جانتا تھا کہ قرآن مجید ایک مکمل کتاب کی صورت میں مسلمانوں کے درمیان موجود ہے۔

اور پھر سوال و جواب پر بھی ذرا غور کیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ قلم دوات لاؤ

تا کہ لکھوادوں۔ تو حضورؐ کے اس ارشاد کا یہ جواب کیسے ہوگا کہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ یہاں تو مناسب جواب یہ ہوتا کہ آپؐ بیمار ہیں۔ کچھ لکھوائیں گے تو زحمت ہوگی۔ آخر آج قلم دوات کا مطالبہ کیوں۔ اس سے پہلے آپؐ نے پورا قرآن زبانی سنایا اور ہم نے آپؐ سے سن کر اسے اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا۔ آپ کو جو کچھ فرمانا ہے فرما دیجیے ہم اسے بھی محفوظ کرلیں گے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قلم دوات طلب کرنے پر کسی حیرت کا اظہار نہیں۔ تحریری طور پر کچھ لکھ کر دینے پر کوئی تعجب نہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مسلمانوں کے لیے حضورؐ کی طرف سے قلم دوات کا طلب کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی یا تحریر دینا کوئی عجوبہ نہیں تھا بلکہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہدایت و رہنمائی کے ہر پیغام کو لکھوایا کرتے تھے۔ صرف مسلمانوں کے حافظے پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

ویسے بھی کتنی عجیب بات ہوتی کہ قرآن کو مسلمانوں کے حافظے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا۔ وہ مسلمان جو بھول جانے کے اتنے عادی ہوں کہ شریعت کے بتائے ہوئے ہر عمل کے قواعد میں ایک قاعدہ یہ بھی بتایا جائے کہ اگر بھول جاؤ تو کیا کرو۔ اگر نماز پڑھتے پڑھتے بھول جاؤ تو سجدہ سہو کرلو۔ اگر روزہ رکھنے کے بعد بھول کر کچھ کھا پی لو تو اللہ معاف کردے گا۔ حج کے دوران کچھ بھول جاؤ تو اس کا کفارہ دے دینا۔ غرض ہر عمل میں بھول جانے کے قوانین کی موجودگی میں اس بات کی دلیل ہے کہ خدا کے نزدیک انسان کا حافظہ بھول چوک کا نشانہ بن سکتا ہے۔ جب ایک ذرا سی نماز میں بھی بھولنے کا امکان موجود ہو تو اتنے بڑے قرآن کی حفاظت حافظے سے کیسے ہوسکتی تھی۔

غرض حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کے لیے حافظ صاحبان کے حافظے کو نہ کبھی وسیلہ بنایا نہ ایسا کیا جانا ممکن تھا۔ یہ تو ہماری فیاضی ہے کہ ہم قرآن یاد کرنے والوں کو حافظ قرآن کے محترم اور مقدس خطاب سے نواز دیں۔ ایسی

نوازش حافظ حضرات کی محنت اور قرآن مجید سے ان کے لگاؤ پر ہمت افزائی کا سرٹیفکیٹ تو ہوسکتی ہے لیکن خود ایک نام رکھ کر اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ جو حافظ قرآن ہوتا ہے وہی محافظ قرآن بھی ہوتا ہے، ایک کھلی ہوئی غلطی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

اپنی پسندیدہ شخصیتوں کو مبالغہ آمیز خطابات دینا ہمارا پرانا طرزِ عمل رہا ہے۔ اگر میں ایسے خطابات کی مثالیں دینے لگوں تو یقیناً ایسے کئی حوالے سامنے آئیں گے جن سے بہت سے لوگوں کے جذبات مجروح ہونے لگیں گے۔ اس لیے زیادہ وضاحتوں سے گریز کرتے ہوئے صرف ایک خطاب کا حوالہ دوں گا۔ ایک فقط امیر المؤمنین کے خطاب کو لیجیے اور دیکھیے کہ اسے ہم نے کہاں کہاں اور کیسی کیسی شخصیتوں کے لئے استعمال کیا۔ مؤمنین کا امیر تو وہی ہوسکتا تھا کہ جو اپنے ایمان میں کامل ہو۔ جس کا ایمان محض ہمارے کہنے سے نہیں بلکہ خود زبانِ رسالتؐ سے کُل ایمان کی سند پا چکا ہو۔ لیکن مسلمانوں نے چودہ سو سالہ تاریخ میں یہ الٰہی منصب عطا کرنے میں جس سخاوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے صاحبانِ خطاب کی عزت میں تو کوئی اضافہ نہیں کیا۔ البتہ اس محترم لقب کی شان گھٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چند سال پہلے میرے ملک میں ایک سربراہ مملکت کو بھی یہی خطاب دینے کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ملک و ملت کے سنجیدہ لوگوں نے تحریک کی شدید مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے مقدس لقب سے پکارنے کے لیے صاحب خطاب کے کردار اور عمل میں بلندی ہونا ضروری ہے۔ آج امیر المؤمنین کا خطاب دیتے ہوئے کسی معیار کا مقرر کرنا اور افراد میں اس معیار کا تلاش ہونا ایک اچھی علامت تھی۔ لیکن امیر المؤمنین کے لئے کسی معیار پر پورا اترنے کی قید ہم نے بہت دیر سے لگائی۔ کاش مسلمان اپنی تاریخ بیان کرتے ہوئے بھی اس لقب کے استعمال میں اتنی ہی احتیاط سے کام لیتا۔ سچ پوچھیے تو ذاتی طور پر مجھے اس تجویز سے مکمل اتفاق تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ

ضرور آج کے اس سربراہ کو امیر المؤمنین کہا جائے تا کہ ہم اسے دیکھ کر بخوبی سمجھ جائیں کہ اس سے پہلے جو لوگ امیر المؤمنین کہلاتے تھے وہ بھی ایسے ہی رہے ہوں گے۔

مسلمانوں کی یہی فیاض طبیعت تھی کہ یزید جیسا فاسق و فاجر تختِ حکومت پر بیٹھ تو اسے بھی امیر المؤمنین کہا گیا۔ اور نہ صرف یہ کہ کہا گیا بلکہ مان بھی لیا گیا اور جب اسے ایمان کا رہبر و قائد تسلیم کر لیا گیا تھا تو اب وہی حلال و حرام کا بتانے والا تھا۔ وہی احکام شریعت جاری کرنے والا تھا۔ اس لیے کہ اتفاق سے اس سے پہلے جو حکمران ہوتے رہے اسلامی معاشرہ ان کے احکام کو حکم خدا و رسولؐ قرار دیتا تھا۔ اب مسند بھی وہی ہے۔ لقب بھی وہی ہے۔ اس لیے اختیارات بھی وہی دیئے گئے جو اس سے پہلے کے حکمرانوں کو حاصل تھے۔ ہماری تاریخ کا یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ عہد رسالتؐ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی ارشادات پر مسلمان یہ سوال کریں کہ آپ کا یہ حکم آپ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے اور آج بھی یہ کہا جائے کہ حضورؐ جو کچھ فرماتے تھے۔ ان میں سے کئی باتیں بطور رسول کرتے تھے اور کئی باتیں بطور بشر کرتے تھے۔ اللہ رے مسلمان کی احتیاط کہ ترجمان وحی رسولؐ کے اقوال میں بھی یہ امتیاز قائم کرے اور اللہ رے مسمان کی بے احتیاطی کہ صاحب تخت و تاج کے ہر فرمان کو مکمل شریعت قرار دے دے۔

مسلمانوں کے مزاج کی یہی کج روی تھی کہ یزید یہ جرأت کر بیٹھا کہ حسین علیہ السلام سے مطالبۂ بیعت کرے اور مسلمانوں کو اسی سوچ کی اصلاح درکار تھی کہ حسین علیہ السلام نے اپنی جان قربان کر دی۔ یزید کا مطالبۂ بیعت ایک فرد کا دوسرے فرد کو اپنی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں تھا بلکہ یہ ایک غلط نظام کا اسلام کے حقیقی نظام کو غلام بنانے کا ارادہ تھا۔ یہ باطل کی طرف سے حق کو اپنا تابع بنانے کا عزم تھا۔ یہ ایک جھوٹ تھا جو سچ پر غلبہ پانا چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں نمائندۂ حق کے لیے، بلکہ کُل ایمان کے لیے کیسے ممکن

تھا کہ وہ تمام تر باطل کے سامنے سر جھکا دیتا۔ حسین علیہ السلام نے سر کٹا دیا تو اپنی خاطر نہیں۔ اپنا سب کچھ حسین علیہ السلام نے لٹا دیا تو مقصد یہ تھا کہ گلشن اسلام کی آبیاری اب لہو سے ہی ہو سکتی تھی اور لہو بھی حسین علیہ السلام کا نہیں بلکہ وہ تمام لہو جو اپنی پاکیزگی میں اسلام کے مزاج کے قریب ترین تھا، اسی لیے حسین علیہ السلام نے جس کو اسلام کی اصل روح سے سرشار دیکھا اسے ساتھ لیا جو ساتھ نہیں چل سکا تھا اسے خط لکھ کر بلوایا۔ دوسری طرف جہاں کوئی کمی نظر آئی، جہاں مزاج کا اختلاف نظر آیا اسے ساتھ لانے سے انکار کر دیا۔ اگر کوئی شوق ملک گیری میں ساتھ آنے لگا تو اسے واپس کر دیا۔ کیونکہ حسین علیہ السلام خود تو آیۂ تطہیر کے سند یافتہ تھے لیکن اپنے ساتھ اسی کو لانا چاہتے تھے جو طہارت کردار میں حسینی طہارت کے معیار پر پورا اترتا ہو۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۱۰

اسلام کا پرچم

حفاظتِ قرآن کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اب تک کی نشستوں میں بہت کچھ گوش گزار کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ موضوع کے بہت سے گوشے ابھی تشریح اور توضیح کے محتاج ہیں۔ صاحبانِ علم تو یقیناً ابھی بہت کچھ کہتے۔ لیکن میرے جیسے بے علم بھی بارگاہِ بابُ العلم سے وابستگی کے طفیل اتنی توفیق رکھتے ہیں کہ آٹھ دس مزید تقاریر کی بخوبی گنجائش ہے۔۔۔ لیکن ایامِ عزا کی ان تاریخوں کے اپنے تقاضے ہیں اور ان دنوں کی اہمیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی بھی موضوع سے انحراف کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں چنانچہ آج میں معذرت خواہ ہوں کہ سلسلۂ کلام جاری نہ رکھ سکوں گا اور کچھ دوسرے حوالوں سے بات کروں گا۔ البتہ بالکل ہی بے ربط ہونے سے بچنے کے لئے اپنے مسلسل موضوع سے تعلق رکھتا ہوا صرف ایک گوشہ پیش کروں گا۔

قرآن مجید بار بار اعلان کر رہا ہے کہ وہ ایک کتاب کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔ فرائضِ نبوت کی جو الٰہی فہرست قرآن میں آئی ہے۔ اس کے مطابق یہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری ہے کہ وہ امت کو ایک مکمل، ترتیب دیا ہوا، محفوظ قرآن دیں۔۔۔ تاریخ تصدیق کر رہی ہے کہ قرآن عہدِ رسالتؐ میں ہی کتابی حیثیت اختیار کر

چکا تھا   دوسری طرف قرآن کو عہدِ رسالتؐ میں جمع نہ کئے جانے کے نظریے کے اپنے خطرات ہیں۔ اگر یہ سمجھ لیں کہ قرآن بعد رسولؐ جمع کیا گیا تھا تو قرآن شکوک وشبہات کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اسلام اور قرآن، اسلام دشمنوں کے اعتراضات کی زد میں آ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو قرآن کے محفوظ ہونے کی وجہ سے دوسرے تمام مذاہب پر جو برتری حاصل تھی وہ ختم ہو جاتی ہے۔ ان سب منفی وجوہات کے باوجود آخر مسلمانوں کے ایک گروہ کو کیا سوجھی کہ وہ بڑے زور وشور سے کہہ رہا ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قرآن مجید کو منتشر حالت میں، غیر مرتب حالت میں، غیر محفوظ حالت میں چھوڑ گئے تھے اور اسے موجودہ شکل میں لانے کا کام بعد میں کیا گیا۔ ہر چند کہ قرآن کے بعد رسولؐ جمع ہونے کی بات کرنے والے کسی ایک بات پر متفق نہ ہو سکے۔ کسی نے کہا کہ قرآن حضورؐ کے فوراً بعد پہلی خلافت کے عہد میں جمع کیا گیا۔ کچھ نے کہا کہ دوسری خلافت میں یہ کام ہوا۔ کچھ نے جمع قرآن کا اعزاز تیسرے دور کے سر باندھا۔ پھر اس پر بھی اتفاق نہیں کہ جس نے قرآن جمع کیا، اس کا طریقہ کیا تھا۔ آیت اللہ ابوالقاسم الخوئی اعلیٰ اللہ مقامہ تفسیر قرآن لکھ رہے تھے۔ البیان کے نام سے۔ اس کے مقدمے میں انہوں نے جمع قرآن کی ۲۷ روایتوں کو جمع کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر روایت باقی چھبیس کو غلط ثابت کرتی ہے۔ ان روایتوں کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بات بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن کوئی بات بنتی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا غلط، بے بنیاد اور خطرناک دعویٰ کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ ان دعوؤں کی حقیقت کیا ہے۔ ان کا پس منظر کیا ہے اور کون سی روایت کیوں بیان کی گئی۔ ان سوالات کے جواب کے لئے ایک نشست بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لئے تو پورا سلسلۂ تقریر درکار ہوگا ...... اس وقت تو صرف ایک مثال بیان کروں گا۔ شاید یہ مثال یہ واضح کر دے کہ قرآن مجید بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جمع کئے

جانے کی حکایت بیان کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

میں جس سرزمین سے تعلق رکھتا ہوں، وہاں کا ایک صوبہ سندھ اپنی بہت سی خصوصیات میں انفرادیت رکھتا ہے۔ ان خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں پیری مریدی کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ بہت سے گھرانے ہیں جو اس حوالے سے پہچانے جاتے ہیں کہ وہ روحانی قیادت رکھتے ہیں۔ وہ محترم پیروں کے گھرانے ہیں۔ عام سندھی ان پیر صاحبان کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اپنے پیر کے لئے ہر طرح کی ایثار و قربانی کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ پیر صاحبان عزت و احترام کے بھی حقدار ہیں اور مال و دولت کے بھی مالک ہیں۔ ان میں مردان باصفا بھی ہیں اور اہل دنیا بھی۔ لیکن ان کا مرتبہ لوگوں کی نگاہ میں بہت بلند ہے۔ اب جہاں اختیار و اقتدار بھی ہو، احترام و عزت بھی ہو، مال و دولت بھی ہو وہاں اس مقام و حاصل کرنے کی آرزو بھی ہوگی۔ چنانچہ جب کوئی پیر صاحب دنیا سے گزر جاتے ہیں ان کا وصال ہو جاتا ہے۔ یا ہمارے علاقے کی زبان میں دنیا سے پردہ کر لیتے ہیں تو یہ فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیر صاحب کا سجدہ نشین، ان کا جانشین کون ہوگا۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ عام طور پر تین تبرکات ہیں جن کی موجودگی میں کسی کی جانشینی ثابت ہوتی ہے۔ کبھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ پیر صاحب نے اپنا خرقہ، اپنی چادر کسے عطا کی تھی۔ جسے مرحوم پیر کی چادر ملی وہی جانشین ہے یا پھر دیکھا جاتا ہے کہ کسی کو پیر صاحب نے اپنی پگڑی دی ہو۔ یا پھر وہ جانشین ہے جسے پیر صاحب نے اپنا نشان جھنڈا عطا کیا ہو۔ چنانچہ کسی کی جانشینی کے یہی تین ثبوت ہیں یا چادر ملی ہو، یا پگڑی ملی ہو یا جھنڈا ملا ہو۔ اب اس قاعدے سے جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا مسئلہ حل کرنا چاہیں تو چادر

شب ہجرت عطا فرمادی، پگڑی خندق کے دن باندھ دی اور جھنڈا خیبر میں دے دیا۔ تین تبرکات علی علیہ السلام کے حصہ میں آ گئے۔ اب اگر علی علیہ السلام کے سوا کوئی اور جانشین رسولؐ بننا چاہے تو اس کے پاس بطور دلیل کیا ہے؟ عام مسلمان کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ تو حضورؐ کے چھوڑے ہوئے ترکے میں کس چیز کو اپنا کہے۔ کس تبرک کو اپنی ملکیت قرار دے؟ شوق مسند نشینی میں جب کچھ ہاتھ نہ آیا تو سوچا ہم قرآن ہی کے مالک بن جائیں لیکن ثبوت ملکیت کے لئے قرآن سے کوئی تو تعلق ہو۔ قرآن اپنے اوپر نازل نہیں کرا سکتے تھے چنانچہ یہی کہہ دیا کہ اسے ہم نے جمع کیا ہے۔

احساس محرومی بہت خطرناک عارضہ ہے۔ یہ عجیب گل کھلاتا ہے۔ فرد میں پیدا ہو جائے تو اس کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے اور قوموں میں پیدا ہو جائے تو اس کے رویوں کو غیر فطری بنا دیتا ہے۔ یہ احساس محرومی۔ اگر اس احساس کی کارگزاریوں کو دیکھنا ہو تو صرف ایک مثال دیکھ لیجیے۔

پوری دنیا کا دستور ہے کہ ہر قوم اپنے قومی پرچم کا۔ اپنے نشان کا بہت زیادہ احترام کرتی ہے۔ اپنے جھنڈے کو اپنی عزت سمجھتی ہے۔ اسے سلامتی دیتی ہے اس کی بہت تعظیم کرتی ہے۔ جب پرچم لہرایا جائے تو تعظیماً کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنے پرچم کو سر بلند رکھنے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتی۔ کتنے افراد ہیں کہ صرف اپنے جھنڈے کو اونچا رکھنے کے لئے جان قربان کرتے رہے ہیں..... لیکن ہم مسلمان عجیب وغریب قوم ہیں۔ ایک طرف تو دنیا کی دوسری اقوام کی پیروی میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں یکم محرم کو نو روز منانا چاہیئے۔ ساری قومیں نیو ائیرس ڈے مناتی ہیں۔ سال کے پہلے دن خوشیاں مناتی ہیں۔ ہمیں بھی پہلی محرم کو جشن مسرت منانا چاہیئے.. ایک طرف تو اقوام عالم کی تقلید کا اس قدر شوق دوسری طرف پرچم کے بارے میں اقوام عالم کے رویہ کے بالکل برعکس

کیفیت یہ ہے کہ ادھر اسلامی پرچم سامنے آیا۔ ادھر بدعت، بدعت کے نعرے لگے۔ ہم سے کہا گیا۔ یہ کیا کرتے ہو۔ ایک بانس، اس پر لگا ہوا کپڑے کا ٹکڑا۔ یہ بھی کوئی تعظیم کی چیز ہے۔ یہ تو کھلی ہوئی بت پرستی ہے۔ خود علم بنایا، خود احترام کرنے لگے میں جب بعض مسلمانوں کا یہ ردعمل دیکھتا ہوں تو کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ احساس محرومی کا نتیجہ ہے۔ اگر اس دن علم مل جاتا جس دن اس کی آرزو میں پوری رات، جاگ جاگ کر، کروٹیں بدل بدل کر، دعائیں مانگ مانگ کر گزری تھی تو آج وہ بھی احترام ہی احترام کرتے۔ اب تو ادھر علم سامنے آیا۔ خیبر کی محرومی نے دل میں چٹکی لی اور پھر منہ میں جو آیا۔ علم کے خلاف کہنے لگے۔ آیئے تعصب کی عینک اتار کر آیئے اور پھر دیکھیئے یہ علم کیا ہے۔ اس علم کی تاریخ کیا ہے۔

میں عرض کروں کہ خیبر کا علم محض ایک پرچم نہیں تھا بلکہ صداقت رسولؐ کا ترازو تھا۔ اس دن کا علم معیار نبوتؐ بن گیا تھا۔ روزِ خیبر اگر علیؑ میدان سے کامیاب نہ پلٹیں تو اس میں علیؑ کا کوئی نقصان نہیں۔ بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ مجھ سے پہلے، مجھ سے زیادہ تجربہ کار، زمانے کے سرد و گرم کو مجھ سے زیادہ دیکھنے والے ناکام آ گئے تو میں کم سن بھی۔ کم تجربہ بھی۔ اگر بغیر فتح کے واپس آ گیا تو کون سی بڑی بات ہے لیکن دوسری طرف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ علمدار فاتح ہوگا۔ اب فتح علی علیہ السلام کی ذمہ داری نہیں رہی۔ خدا کے رسولؐ کی ذمہ داری ہوگئی۔

مزید وضاحت کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ایمان لاؤ۔ بہت سے لوگ ایمان لے آئے۔ کہا: اسلام کے لئے جان و مال قربان کر دو۔ مسلمانوں نے قربانی دی۔ ارشاد ہوا: نمازیں پڑھو، روزے رکھو، مسلمان نماز روزہ کرتے رہے۔ فرمایا: حقدار کو حق دو۔ مسلمان حقوق ادا کرتے رہے آخر یہ سب کیوں ہو رہا تھا۔ کیا محض ان احکام پر عمل

کر کے۔ تو جواب یہ ہے کہ نبیؐ کے احکام مانو گے تو جنت ملے گی۔ آخرت میں شفاعت ملے گی۔ تمہاری بخشش ہو جائے گی۔ پل صراط سے گزر جاؤ گے یعنی حکم مانو یہاں اور نتیجہ ظاہر ہوگا حشر میں۔ جو کچھ بھی ملے گا قیامت کے بعد ملے گا۔ کوئی ایک وعدہ بھی آج کا نہیں جتنے بھی وعدے ہیں وہ قیامت سے ادھر تو رکتے ہی نہیں۔ اب ملاحظہ فرمایئے مسلمان نے اسلام قبول کیا تو اسی یقین پر کہ حضورؐ جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔ یہ سب سچ ہے۔ حضورؐ کا وعدہ سچا ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ کوئی دلیل؟ کوئی ثبوت؟ کہ جنت ملے گی یا نہیں۔ ہے بھی یا نہیں۔ کوئی دلیل نہیں۔ کوئی مشاہدہ نہیں۔ بس یہ یقین ہے کہ جو یہ باتیں بتا رہا ہے وہ سچا ہے۔ اس کا قول کبھی غلط نہیں ہوتا۔

اب جو رسولؐ کے ہر قول، ہر وعدے کو اس لئے مانا تھا کہ وہ کبھی غلط نہیں کہتے۔ آج وہی رسولؐ ایک ایسا وعدہ فرما رہے ہیں جو قیامت کے بعد نہیں اگلی صبح کا وعدہ ہے۔ آج جو خبر دے رہے ہیں اس کی تصدیق کے لئے صرف ایک رات درمیان میں ہے۔ اب مسلمان تو قیامت کے بعد ظاہر ہونے والی باتوں کو بھی مان رہا تھا۔ ان کی تصدیق تو ممکن ہی نہیں تھی لیکن پہلی مرتبہ ایک ایسا وعدہ تھا جو قیامت سے پہلے ہی نہیں اگلی صبح کو ظاہر ہو جاتا۔ اب اگر بفرضِ محال اگلی صبح میدان میں جانے والا ناکام آجائے، شکست کھا جائے تو اس کا نقصان ہو یا نہ ہو، رسولؐ کی رسالت باقی نہیں رہتی کہ جس کی ایک رات بعد کی خبر درست نہیں نکلی اس کا قیامت کے بعد کا قول کیسے درست ہوگا۔ گویا آج علیؑ کو علم نہیں مل رہا۔ نبوت کی سچائی کی سوئی دی جا رہی ہے مجھے کہنے دیجئے کہ تاریخ انسانیت میں کبھی، کوئی علم اتنا اہم، اتنی شان والا نہیں تھا جیسے خیبر کا علم تھا۔

علم اسلام کی معنوی تعبیر

پرچم قوم کے اندازِ فکر کا ترجمان ہے۔ پرچم فتح وظفر کا پیغامبر ہے۔ پرچم حریت وآزادی کی علامت ہے۔ پرچم غیرت وحمیت قومی کا مظہر ہے۔ پرچم امتیاز وانفرادیت کا عکاس ہے۔ غرض وہ واحد علامت ہے جو رزم سے لے کر بزم کی رونقوں تک، میدان جنگ سے لے کر زمانۂ امن تک، مصائب وکشائش کے دور سے لے کر ترقی وسربلندی تک، غرض قومی زندگی کے ہر میدان میں کسی قوم کا ترجمان ہے اس کی سربلندی قوم کی سربلندی۔ اس کا سرنگوں ہونا قوم کا مبتلائے مصیبت ہونا، اس کی عزت قوم کی عزت اس کا تحفظ قومی آزادی اور بقا کا تحفظ۔ چنانچہ تاریخیں بتاتی ہیں کہ قوموں نے اپنے پرچم کو بلند رکھنے کے لئے گردنیں کٹائیں مال وزر قربان کیا۔ خطرات جھیلے۔ مصیبتیں اٹھائیں۔ جرأت کے کارنامے کیئے۔ غیرت کے مظاہرے کیئے۔ جانیں دے دیں۔ جیسے بھی بن پڑا اپنے پرچم کی حفاظت کی۔

ہر قوم کا پرچم اپنے دامن میں قوموں کے مذاق اور اندازِ فکر کو سمیٹے ہوئے ہے کوئی پرچم جغرافیہ کو سمیٹے ہوئے ہے کوئی علم اپنے میں تاریخ کو سجائے ہوئے ہے۔ بعض پرچم اپنی قوم کے کارناموں کو بیان کرتے ہیں۔ کسی پرچم پر مستقبل کی امیدوں اور آرزوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ کوئی پرچم قوم کے نصب العین کا مظہر ہے گویا ہر قوم کا پرچم اپنے علمبرداروں کے مزاج کا مظہر ہے۔ اور ہمارا پرچم ایک طرف ہماری تاریخ ہے کہ اس کے پھریرے پر بکھرا ہوا سرخ رنگ آج بھی دنیا کو بتا رہا ہے کہ ہمارا علم خون میں نہا نہا کر بلند ہوا ہے۔ ہمارا علم کارناموں کا ترجمان بھی ہے کہ اس میں لگی ہوئی تلواریں بتاتی ہیں کہ جب ہم راہِ حق میں قربانی دینے کے لئے نکلیں تو کبھی میدان سے واپس نہیں آئے

ہمارے مجاہدین کا جسم قتل گاہ میں رہ گیا۔ اوران کا اسلحہ جنگ علم میں لٹکا کر واپس لایا گیا۔ علم میں آویزاں سوکھی مشک اور اس میں پیوستہ تیر آج بھی صاحبانِ نظر کو دعوت فکر دے رہے ہیں کہ ایک طرف ہمارا کردار دیکھو کہ ہم پیاسوں کی پیاس بجھانے کے لیے جان پر کھیل گئے اور دوسری طرف ہمارے دشمن کا کردار دیکھو کہ ننھے ننھے بچوں کو پانی دینے کا بھی روادار نہیں تھا۔ اور ہمارا علم ہمارے قومی نصب العین کا بھی ترجمان ہے۔ ہم مؤمن و مسلم ہیں اور اس اعتبار سے ہم دنیا میں فساد برپا کرنے نہیں آئے کشت وخون کرنے نہیں آئے بلکہ ہم تو اہل زمانہ کے لئے امن وسلامتی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ یقین نہ آئے تو ہمارے علم پر لگے ہوئے پنجے کو دیکھو۔ یہ پنجہ تمہیں ان ہاتھوں کی کہانی سنائے گا جو لڑنے کے لئے نہیں نکلے تھے جو خون بہانے کے لئے نہیں بڑھے تھے۔ اگر جنگ کے لئے نکلتے تو ہاتھ میں کوئی اسلحہ ہوتا، ہاتھ خالی نہ ہوتے۔ یہ خالی ہاتھ کہہ رہا ہے کہ یہ تو مصیبت زدہ انسانوں کی پیاس بجھانے کے لئے بڑھے تھے۔ ایک چھوٹے سے گروہ انسانی کی مصیبت کا ازالہ کرنے کے لئے جو ہاتھ قلم ہوئے ان کی یادگار آج بھی دنیا سے کہہ رہی ہے کہ دیکھو قیام امن کے لئے ہم نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔

اگر ہمارے علم کے اس سب سے سربلند نشان اس پنجے کا مفہوم تاریخ سے سمجھ میں نہ آئے تو پھر فکر کی روشنی میں دیکھو۔ نفسیات انسانی کے حوالے سے دیکھو۔ یہ دنیا بھر کا فطری طریقہ ہے کہ اگر کوئی جماعت مصروف فساد ہو کہیں ہنگامہ ہو رہا ہو۔ تو وہ شخص جو امن چاہتا ہے جو سکون چاہتا ہے تو وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر دوڑے گا۔ کہ ٹھہرو ہنگامہ نہ کرو۔ ٹھہرو فساد نہ کرو۔ ٹھہرو لڑائی نہ کرو۔ گویا نہتے ہاتھوں کا بلند ہونا امن کی علامت ہے۔ راحت اور سکون کی علامت ہے۔ فساد سے نفرت کی علامت ہے۔ ہم نے اس علامت کو اپنے علم پر سجالیا۔ چنانچہ ہمارا علم آج ساری دنیا سے کہہ رہا ہے کہ ہم دنیا سے فساد کو مٹانے

اٹھے ہیں اور اس وقت تک بلند رہیں گے جب تک فساد ختم نہیں ہو جاتا۔

علم کی تاریخ

ہمارا علم کہاں سے آیا۔ کن ہاتھوں نے اسے بلند کیا۔ تاریخیں بتاتی ہیں کہ تاریخ میں سب سے پہلا علم اللہ کے اس خلیل نے بنایا۔ جو نمرود کی حکومت سے ٹکرانے اٹھا تھا۔ اور پھر خدا کے اس حبیبؐ نے جو ابراہیمؑ خلیل اللہ کی تمام سنتوں کو زندہ کرنے آیا تھا اس پیغمبرؐ نے کہ جس نے خانہ کعبہ کے معمار کے اعمال و افعال کو اپنی امت کے لئے لازمی قرار دے دیا تھا۔ وہی وارث خلیلؑ جب داخل مدینہ ہوا تو ایک شخص بریدہ کو حکم دیا کہ وہ علم بنائے۔ بریدہ نے علم بنایا اور پھر اٹھا کر مدینہ کی گلیوں میں پھرتا اور زبان سے لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگاتا جاتا۔ زمانہ امن میں بنوایا جانے والا یہی علم بعد ازاں مسلمانوں اور اسلام کا امتیازی نشان بن گیا اور جنگوں کے دوران یہی علم پہچان بنتا تھا کہ لشکر اسلام وہ ہوگا جہاں یہ علم ہوگا۔ اب ابراہیمؑ کی سنتوں کو زندہ کرنا حبیب اللہ کی ذمہ داری تھی اور حبیبؐ کی سنتوں کو زندہ کرنا امت رسولؐ کی ذمہ داری تھی۔ یہ تاریخ کا عجب فیصلہ ہے کہ ہر چند ملت اسلامیہ کی ہر جماعت نے خود کو وابستہ رسول قرار دیا۔ ہر گروہ نے خود کو وارث اسلام قرار دیا۔ لیکن وہ خصوصی علامت کہ جو مسلمانوں کی پہچان تھی اسے اٹھانے کی تمام ذمہ داری صرف ہم نے قبول کی۔ اب امتیاز میں کوئی دشواری نہ ہو۔ بس ایک ذرا نظر اٹھا کے دیکھو جہاں علم رسول نظر آئے وارثانِ اسلام بھی وہیں ہوں گے۔

عہد رسالتؐ میں علم کی دو شکلیں تھیں۔ ایک وہ جو لواء کہلاتا تھا۔ اور ایک رایت کہلاتا تھا۔ لواء وہ پرچم تھا جو نیزے کی انی کے نیچے کپڑا لگا کر بنایا جاتا تھا۔ جو ارشادِ رسولؐ کے مطابق حشر میں لواء الحمد کی شکل میں علی ابن ابی طالب کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور ایک اور

حدیث میں ارشاد ہوا کہ ﴿انت صاحب الوائی فی الدنیا و الاخرۃ ﴾ کہ اے علی تو دنیا اور آخرت میں میرے لواء کا حامل ہے، میرا علمدار ہے۔ اس حدیث نے توثیق کی کہ دنیا کے ہر معرکے میں رسولؐ کا علم خاص علی ابن ابی طالب کے پاس رہا اور حدیث رسولؐ کی تصدیق تاریخ نے کر دی۔

چنانچہ تاریخ نے بتا دیا کہ جنگ بدر میں جبکہ رسولؐ نے ہر گروہ کے الگ الگ پرچم بنائے تو انصار کا علم سعد ابن عادہ انصاری کے سپرد ہوا۔ لواء مصعب ابن عمیر کو دیا۔ اور اپنا پرچم خاص علی ابن ابی طالب کو دیا۔ جنگ احد میں جہاں بریدہ کا بنایا ہوا علم حضرت حمزہؓ کے سپرد ہوا اور وہ علمداری کی حالت میں شہید ہوئے۔ وہاں اپنا علم پھر حضرت علی علیہ السلام کو دیا۔ بلکہ رایت اور لواء کو جمع کر کے ایک ہی پرچم بنا لیا اور یہ متحد پرچم علی علیہ السلام کے سپرد کیا گیا۔

برادرانِ اسلامی نے چاہا کہ علی علیہ السلام کی فضیلت علمبرداری منفرد نہ رہے۔ چنانچہ یہ دعویٰ کیا گیا کہ ایک انصاری بزرگ سعد ابن عبادۃ رسولؐ کے علمبردار رہے۔ لیکن حقیقت چھپائی نہ جا سکی اور کامل ابن اثیر جذری نے اسد الغابہ میں شیبہ ابن ابی مالک کی ایک روایت سے صورت حال سے پردہ اٹھا دیا۔ کہ جب رسولؐ زمانۂ امن میں قیام پذیر ہوتے تو علم سعد کے سپرد رہتا۔ اور جب میدان جہاد و قتال میں جانے کا وقت آتا تو یہ علم علی کے سپرد ہو جاتا۔ گویا سعد کا فرض علمداری نہیں بلکہ محض حفاظت علم تھا علمدار افواج رسولؐ صرف اور صرف علی کی ذات تھی۔

بزرگانِ گرامی! ابوطالبؑ نے اسلام کے لئے جو خدمتیں سرانجام دیں ان کے احترام میں آج بھی ملت اسلامیہ کی گردنیں خمیدہ ہیں۔ آج بھی انصاف پسند طبیعتیں حقائق کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ بقائے اسلام کے لئے ابوطالبؑ کی مشقتوں کا اعتراف

کریں۔ ابو طالب علیہ السلام کی کاوشوں کو تسلیم کریں۔ لیکن یہ خصوصی فضیلت بھی ابو طالب علیہ السلام ہی کا سرمایۂ افتخار تھی کہ علم اسلام کو سربلند کرنے میں جو غیر معمولی کارنامے اولادِ ابو طالبؑ نے سرانجام دیے ان کی مثال پوری دنیا کی تاریخ میں نہ مل سکی۔ 6 شوال 3 ہجری کو جنگ احد میں ابو طالب علیہ السلام کے بیٹے علی علیہ السلام نے وہ مثال قائم کی کہ جب داہنا ہاتھ دورانِ جہاد شدید زخمی ہو گیا تو علم اسلام کو گرنے نہیں دیا بلکہ بائیں ہاتھ میں تھام لیا پھر 8 ہجری میں جنگ موتہ کے دوران جب زید ابن حارثہ شہید ہونے لگے اور علم ان کے ہاتھ سے گرنے لگا تو اس سنت علویؑ پر عمل کیا علیؑ کے برادر بزرگ جعفرؑ ابن ابو طالبؑ نے۔ داہنا ہاتھ قطع ہوا تو علم بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور بایاں ہاتھ بھی کٹا اور جعفر طیارؑ شہید ہو گئے تو عبداللہ ابنِ رواحہ نے علم لیا وہ بھی شہید ہو گئے۔

علم کی سربلندی کے لئے علیؑ اور جعفرؑ کی خدمات ہی کیا کم تھیں کہ ابو طالبؑ کے پوتے نے فریضہ علمداری کو اس طرح سرانجام دیا کہ جب کبھی زبان پر علمدار کا لفظ آتا ہے تو ذہن میں کربلا کے علمدار عباس غازی علیہ السلام کی تصویر آ جاتی ہے۔

قصۂ علم نامکمل رہتا ہے۔ اگر اس قصہ میں اس علم کا ذکر نہ آئے جو علم نہیں رہا تھا بلکہ صداقت رسولؐ کے لئے ترازو بن گیا۔ وہ علم جو کشتی اسلام کا مستقبل بن گیا تھا وہ علم جو صداقت اور جھوٹ کا خط امتیاز بن گیا تھا۔ ہر چند کہ نہ علم نیا تھا نہ علمدار نیا تھا۔ نہ علم کو دینے والا نیا تھا لیکن یہ علم کچھ اس نئے انداز سے اٹھا کہ کتاب جرأت عشق کا عنوان جدید بن گیا۔ وہ علم کہ جس کے لئے غرض مندوں نے رت جگے کئے، یہ وہ علم تھا کہ جس کے لئے بہانے کئے گئے۔ کہ پرانے علمدار کی تو آنکھیں دکھ رہی ہیں شاید اس طرح کسی نئے کو علم مل جائے۔ لیکن کسی اور کو علم ملتا کیسے کہ آج کی علمدار مشروط ہو گئی تھی اور شرط بھی یہ کہ: ﴿لاعطین الرائت غداً رجلاً کراراً غیر فراراً﴾ جس کے سینے پر مردانگی کا

تمغہ ہو۔ کراریت کی سند ہو غیر فراریت کا اعزاز ہو جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہو۔ جس کے سر پر اللہ اور رسولؐ کی محبت کا تاج ہو جس کی قسمت میں یقینی فتح ہو جس کے داہنی طرف جبرائیل ہوں جس کے بائیں طرف میکائیل ہوں اب اتنی شرطیں پوری ہوں تو علمداری ملے۔

اب سب تو نہیں ہاں ایک تھا کہ شرطیں بڑھ بھی جاتیں تو پوری ہوتیں چنانچہ بڑھ کر علم نہیں لیا، مانگ کر نہیں لیا، جب بلا کر دیا گیا تو لیا اور جب علم لے یا تو اس شان سے لیا کہ ابھی فوج کمر ہی کس رہی تھی کہ علمدار نے بابِ خیبر اکھاڑ کر آنے والی فوجوں کے لئے فتح کا دروازہ کھول دیا۔

علم علی علیہ السلام کو ملا اور علی علیہ السلام نے ہمیشہ اس علم کو سر بلند رکھا۔ جہاں جہاں علمدار گیا فتح قدم چومتی گئی اور جب علم کے دینے والے رسولؐ نہ رہے اور صاحب علم علیؑ بنے تو جنگ جمل میں یہ علم محمد حنفیہ کو دیا گیا۔ جنگ صفین میں ہاشم بن عتبہ کو ملا، جنگ نہروان میں ابو ایوب انصاریؓ کو ملا اور حتیٰ کہ یہ علم کربلا میں پہنچا۔ کربلا میں حسین علیہ السلام نے 12 چھوٹے علم بنائے، تاریخ میں تفصیل نہیں ملتی کہ یہ علم کس کس کو دیئے گئے البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ میمنہ کا علم زہیرؓ ابن قین کو عطا ہوا۔ میسرہ کا علم حبیبؓ ابن مظاہر کو ملا، قلب لشکر کا مخصوص علم عباس علمدار علیہ السلام کو سونپا گیا۔

یقیناً ہم کربلا میں بھی زبانِ حسینؑ سے علمدار کے متعلق وہی جملے سنتے جو خیبر میں زبانِ رسالتؐ سے ان کے علمدار کے لئے ارشاد ہوئے تھے۔ لیکن یہاں کوئی غیر کرار ہوتا تو حسین علیہ السلام، عباس علیہ السلام کی کراریت کی بات کرتے یہاں کوئی فرار ہوتا تو حسین علیہ السلام عباس علیہ السلام کی غیر فراریت کی بات کرتے۔ یہاں جو تھا مردِ میدان تھا یہاں تو جو میدان میں گیا۔ واپس نہیں آیا۔

کربلا کا علم تاریخ میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ کربلا میں بڑوں کی تقویت علم تھا۔ بیبیوں کا وارث علم تھا۔ بچوں کی ڈھارس علم تھا۔ حسینؑ کی قوت بازو علم تھا اور یہ علم اس وقت اور اہم ہوگیا جب ننھی سکینہ نے اس پر اپنا سوکھا ہوا مشکیزہ آویزاں کر دیا۔

ادھر خیمہ سے علم نکلا، ادھر ننھی سکینہ نکلی اور اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر نکلی کہ آؤ بچو اب میرا علمدار چچا پانی لینے جا رہا ہے۔ اب میں تمہیں پانی پلاؤں گی۔ بچو آؤ اپنے ساتھ خالی کوزے بھی لے آؤ۔ اب کربلا میں کوئی پیاسا نہیں رہے گا۔ سکینہ نے دیکھا، اور سکینہ کے ساتھ بچوں نے دیکھا کہ خیمہ سے علم نکلا، زرہ پوشوں کی بنائی ہوئی لوہے کی دیوار میں داخل ہوا اور ساحل فرات پر پہنچ گیا گویا کمان سے تیر نکلا اور نشانے پر پہنچ گیا۔

سکینہؑ نے دیکھا کہ صبا کی رفتار سے بڑھتا ہوا علم دور جا کر ٹھہر گیا ہے۔ سکینہؑ نے خوش ہو کر کہا بچو دیکھو میرے چچا مشکیزہ بھر رہے ہیں۔ علم پھر مڑا واپس خیمہ کی طرف چلا، سکینہؑ بولی: لو چچا آنے والے ہیں۔ اچانک علم ڈولا، علم ڈولا تو سکینہ کا دل بھی ڈوبا، سکینہؑ کا دم رکنے لگا، ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ گئے۔ میرے اللہ میرے سقہ کی حفاظت کرنا۔ ایک مرتبہ گرتا ہوا علم تھا، علم کے ساتھ سکینہؑ کا دل تھا۔ علم رک کر آگے بڑھا اک مرتبہ علم پھر ڈولا اور اب جو ڈولا تو سکینہؑ دیکھتی رہ گئی، علم لشکروں کے ہجوم میں کہیں کھو گیا۔ بے ساختہ چلائی سکینہؑ۔ بابا ذرا جلدی جایئے علم کو کچھ ہوگیا ہے۔ حسین علیہ السلام کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولے: بیٹی کیسے جاؤں میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔

حسین علیہ السلام گئے، اور واپس آ گئے، کس شان سے، کہ ایک ہاتھ میں تیر سے چھلنی مشکیزہ ہے، دوسرے ہاتھ میں خون میں نہایا ہوا علم ہے۔ داخل ہوئے خیمہ میں اور آواز دی اے زینبؑ بہن ادھر آؤ۔

لو! اب نشانی شہ دلدل سوار لو
پٹکا علم سے کھول دو، پنجہ اتار لو
جس دم سنا علم کے بڑھانے کا سب نے نام
سر، اٹھ کر پیٹنے لگیں، سیدانیاں تمام
رائت لٹا کے خاک پہ کہنے لگے امامؑ
لو، الوداع! اے حرم سید الانامؐ
پیاسے گلے پہ خنجر خونخوار چاہیے
ہم کو نہ اب علم، نہ علمدار چاہیے

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے بھائی کا کلام سنا۔ ایک مرتبہ بولی: بھائی دو گھڑی ٹھہر جاؤ زینبؑ کو اپنا فرض ادا کر لینے دو۔ یہ کہہ کر آواز دی، ''رقیہ، ام کلثوم، رباب، ام لیلی ذرا سروں کی چادریں اتار کر مجھے دے دو۔ بیبیوں نے چادریں اتاریں۔ زینبؑ نے چادروں کو دونوں ہاتھوں پہ اٹھا کر ایک مرتبہ رخ کیا فرات کی جانب اور آواز دی بھائی عباسؑ مجھے تیرے خون کی قسم، تیرے کٹے ہوئے بازؤں کی قسم، زینبؑ تیرے علم کو سرنگوں نہیں ہونے دے گی۔ اب زینبؑ اپنے سروں کی چادروں سے تیرے علم کا پھریرا بنائے گی۔

آؤ جوانو! زینبؑ کی قسم کو پورا کرو اور عباسؑ کے علم کو بلند کرو۔ سر بلند رکھو۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

چند سوالات کا تجزیہ

سلسلۂ کلام سے آپ حضرات واقف ہیں۔ آج اس سلسلہ کی آخری گفتگو ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم ہی قرآن مجید کے نازل کرنے والے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس ارشادِ الٰہی پر بات کرتے ہوئے ہم آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اس لئے آج صرف بعض وہ اہم پہلو جو سلسلۂ کلام کو مکمل کرنے کے لئے درکار ہیں اور کچھ وہ سوالات جو اب تک کی گفتگو کے دوران میرے محترم سامعین کے ذہنوں میں ابھرے ہیں اور جو مجھ تک پہنچے ہیں ان کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

حضرت علی علیہ السلام اور جمع قرآن

تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید عہد رسالتؐ میں جمع ہو چکا تھا اور جس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے، اس طرح قرآن حکیم کو خود مرتب فرما چکے تھے اور آج ہم جس قرآن سے واقف ہیں یہ بالکل وہی ہے جو خود آنجنابؐ نے چھوڑا تھا۔ تو اب اس روایت کی کیا حیثیت ہے کہ زمانۂ خلافت اول میں جب حکومت نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ حضرت علی علیہ السلام دربار میں آئیں

اور حکومت کی بیعت کریں۔ تو تاریخوں نے جناب امیر علیہ السلام کا یہ جواب نقل کیا کہ میں اس وقت تک گھر سے باہر نہیں نکلوں گا، اس وقت تک اپنے کاندھوں پہ چادر نہیں ڈالوں گا جب تک قرآن کو جمع نہ کرلوں۔ اور پھر تقریباً چھ ماہ کے بعد آپ جب اپنا جمع کیا ہوا قرآن لے کر حکومت کے سربراہ کے پاس آئے اور اسے حکومت کی تحویل میں دینا چاہا تو یہ جواب ملا کہ ہمیں اس قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر جناب امیر علیہ السلام اپنے لائے ہوئے قرآن کو یہ کہہ کر واپس لے گئے کہ اب تم اس مجموعہ کو اس وقت تک نہیں دیکھ سکو گے جب تک ہمارا آخری فرد ظہور نہ کرے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن مجید اپنی موجودہ شکل میں خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں جمع ہو چکا تھا تو حضرت علی علیہ السلام کے قرآن جمع کرنے کا کیا مطلب ہوا۔ آپ چھ ماہ تک جو کام کرتے رہے وہ کیا تھا اور اگر یہ قرآن وہی قرآن تھا جو آج ہمارے پاس ہے تو حکومت نے اسے قبول کرنے سے کیوں انکار کر دیا۔ اور پھر حضرت علی علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ تم اسے ظہور مہدی علیہ السلام تک نہ دیکھ سکو گے۔ اس کا کیا مطلب ہوا۔ کیونکہ اگر یہ وہی قرآن تھا جو آج ہمارے گھروں میں موجود ہے تو ہم اس کی روز زیارت کرتے ہیں تو ان تمام سوالات کا تفصیلی جواب دینا اس وقت ممکن نہیں ہے۔ میں جزئیات کو زیر بحث لانے کی بجائے براہ راست نتیجہ عرض کر دوں کہ جناب امیر المومنین علیہ السلام نے جو قرآن جمع کیا تھا وہ متن کے اعتبار سے بالکل یہی قرآن تھا جو آج ہے۔ یہ درحقیقت قرآن کا پہلا تفسیری ایڈیشن تھا یعنی ہر آیت کے ساتھ یہ وضاحت کر دی گئی تھی کہ اس کی شانِ نزول کیا ہے۔ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ کس موقع پر نازل ہوئی۔ ان آیات میں سے محکم کون سی ہیں متشابہ کون سی ہیں اور جو متشابہ ہیں ان کا حقیقی مقصود کیا ہے۔ ان میں سے ناسخ کون سی ہیں، منسوخ کون سی ہیں اور جو آیات منسوخ ہو چکی ہیں وہ اب کیوں جزوِ قرآن ہیں۔ غرض حضرت علی علیہ السلام نے

قرآن کے ساتھ ہر وہ تشریحی بات درج فرما دی تھی جو آج ہمیں قرآن فہمی کے لئے درکار تھی اور اگر آج قرآن مجید کی یہ تفسیر ہمارے درمیان ہوتی۔ تو آج ملت اسلامیہ تفسیر اور معنی قرآن پر بھی اسی طرح متفق ہوتی جس طرح قرآن کے الفاظ اور ترتیب پر متفق ہے۔

میں نے حضرت علی علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن کے متعلق جو کچھ عرض کیا۔ اسے میرا قیاس یا اندازہ نہ سمجھیے گا۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ اصحاب امیر المومنین میں ایک شخصیت ہیں سلیم ابن قیس ہلالی۔ انہوں نے جناب امیر علیہ السلام سے، اور جنابؑ کے کئی محترم اصحاب سے، جو احادیث براہِ راست سنیں ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیا۔ اور آج دنیائے حدیث میں، احادیث کے جتنے مجموعے ملتے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم مجموعہ، جو آج بھی دستیاب ہے، وہ سلیم ابن قیس کی کتاب ہے۔ سلیم ابن قیس ہلالی کو بارگاہِ رسالتؐ میں حاضری کا موقع تو نہیں ملا۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام سے ضرور قربت حاصل تھی۔ چنانچہ انہوں نے خود کچھ احادیث جناب امیرؑ سے سنیں۔ کچھ ابوذرؓ، سلمانؓ اور اس پایہ کے دوسرے اصحاب سے سنیں۔ اور اصحاب سے جو حدیثیں سنیں، ان کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک کسی دوسرے صحابی نے اس کی تصدیق نہ کر دی۔ ان شرائط پر پوری اترتی ہوئی جو احادیث ملیں ان کو ایک کتاب میں جمع کر لیا۔ اس طرح یہ علم حدیث کی قدیم ترین موجود کتاب ہے۔ سلیم ابن قیس ہلالی نے امام محمد باقر علیہ السلام تک پانچ معصومین علیہم السلام کی زیارت کی ہے۔ اور ان کی جمع کردہ روایات کو امام زین العابدین علیہ السلام سے قبولیت کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔ ان کی کتاب، کتاب سلیم ابن قیس کوفی کے نام سے مشہور ہے ویسے اس کا نام کتاب سقیفہ بھی ہے۔

اس کتاب میں ایک واقعہ بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ خلافت امام کے

زمانہ میں مولائے کائناتؑ ایک دن مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس دوران لوگ قبائل عرب اور ان کی نامور شخصیتوں کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ جناب امیر علیہ السلام خاموش تھے۔ جب دیر ہوئی اور آپ خاموش ہی رہے تو لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ بھی اپنے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔ اس پر جناب امیر علیہ السلام نے ایک تفصیلی خطبہ دیا۔ وہ خطبہ فضائل علیؑ و اہل بیتؑ کا ایک بحر بیکراں ہے۔ اس خطبے کے اختتام پر طلحہ ابن عبید اللہ نے جناب امیرؑ سے پوچھا کہ میں اسی دن شریک مجلس تھا جب آپ قرآن لے کر ارباب حکومت کے پاس آئے تھے۔ اور حکومت نے اس قرآن کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد ارباب اقتدار کے بہت سے لوگ یہ کہتے بھی سنے گئے کہ فلاں سورۃ کی اتنی آیتیں تھیں اب اتنی رہ گئی ہیں۔ یا ایک کہنے والے نے یہ کہا کہ حکومت نے جو قرآن جمع کیا تھا اس کا ایک چوتھائی بکری کھا گئی تھی۔ ایسی صورت میں بتایئے کہ آپ کا قرآن کیا تھا اور اس قرآن کی کیا حیثیت ہے۔ تو جناب نے فرمایا تھا کہ آج جو قرآن ہے۔ یہ پورے کا پورا قرآن ہے۔ اس میں کوئی کلام مخلوق شامل نہیں ہوا۔ اور اس قرآن میں ہر وہ بات موجود ہے جو نوع انسانی کو ہدایت پانے اور گمراہی سے بچنے کے لئے درکار ہے

آپ نے اپنے مجموعے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لکھوائی ہوئی ہر بات موجود ہے اور آپؐ نے ہر حلال، حرام اور ہر وہ حکم لکھوا دیا تھا جو امت کی ضرورت تھی یا ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ اس میں خراش تک کے تاوان کا ذکر ہے۔ اگر امت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد میری بات مان لیتی تو اسے زمین و آسمان ہر دو طرف سے رزق فراہم ہوتا۔ اس پر طلحہ نے پھر کہا: آپ کے قرآن میں حلال و حرام کا جو علم بیان ہوا ہے اس کی تعلیم دے دیجیے۔ تو آپؑ نے فرمایا کہ اب یہ علم اور یہ قرآن میرے جانشینوں کے سپرد ہے۔ حتیٰ کہ اس جماعت طیب و طاہر کا آخری فرد آئے گا اور

میرے لکھے ہوئے قرآن کے ساتھ حوض کوثر پر ہمارے پاس پہنچے گا۔

اس جواب سے یہ ظاہر ہے کہ اولاً آج نظر آنے والا قرآن حقیقی قرآن ہے پھر یہ کہ جناب امیر علیہ السلام نے آیاتِ قرآنی سے اخذ ہونے والے تمام فقہی احکامات اپنے جمع کیے ہوئے قرآن میں درج کر دیئے تھے اور ظاہر ہے کہ فقہ اہل بیتؑ میں ان تمام احکامات کا علم امام زمانہؑ کو حاصل ہے۔ اسی لئے تعبیر وتفسیر قرآن میں امامؑ کا ارشاد یقینی اور حتمی تفسیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تاویل یا فقہ کے کسی اختلاف میں ہم قولِ معصومؑ کی طرف جاتے ہیں کیونکہ ان کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ قرآن کے حقیقی مفہوم کو بیان کریں۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اگر عام لوگوں کے قرآن کو اپنے جمع کیے ہوئے قرآن سے مختلف پاتے تو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی مصلحت، کوئی لالچ حضرت علی علیہ السلام کو حق بات کہنے سے نہ روک سکتی۔ وہ علیؑ جس نے تاج وتخت اس لئے ٹھکرا دیا ہو کہ حکومت لینے کے لئے علیؑ سے خدا اور رسولؐ کے احکام کی پیروی کے ساتھ سابقہ حکمرانوں کی پیروی کا بھی اقرار کرایا جا رہا تھا۔ تو جس علیؑ نے حکومت میں خدا اور رسولؐ کے سوا کسی کی رائے کی شمولیت کو قبول نہیں کیا۔ وہ بھلا قرآن میں مخلوق کے کلام کی ملاوٹ دیکھتے اور خاموش رہتے۔ یہ ناممکن تھا۔

اور پھر جناب امیر علیہ السلام نے قرآن حکیم کی عظمت بیان کرتے ہوئے طویل خطبے دیئے۔ نہج البلاغہ نمبر 196 قرآن کے فضائل پر مبنی ہے۔ علامہ مجلسی نے یہ خطبہ بحار الانوار میں بھی نقل کیا ہے۔ اس خطبے میں آپ نے قرآن حکیم کو نور کی نہ بجھ سکنے والی قندیل قرار دیا۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ کتاب سرتا سر عزت اور غلبہ ہے۔ اس کے مددگار کبھی شکست نہیں کھاتے۔ وہ سراپا حق ہے۔ وہ اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ وہ ایسا چشمہ ہے کہ پانی بھرنے والے اسے ختم نہیں کر سکتے۔ وہ ایسی منزل ہے کہ جس کی راہ میں کوئی راہ

رونستا نہیں۔ یہ ایسی دوا ہے جس سے کوئی مرض نہیں رہتا۔ ایسا نور ہے جس میں تیرگی کا نام نہیں۔ ایسی زنجیر ہے جس کے حلقے مضبوط ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس خطبے کا ایک ایک جملہ قرآن مجید کے شک و شبہ سے بالاتر ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب خطاب عام مسلمانوں سے ہو رہا ہے تو اس قرآن موضوع گفتگو ہوگا جو تمام مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ اگر علی علیہ السلام کا قرآن الگ ہوتا تو لازماً آپ اعلان فرماتے کہ یہ فضائل تمہارے قرآن کے نہیں بلکہ اس قرآن کے ہیں جو میرے پاس ہے۔ لیکن آپ کی طرف سے اشارتاً بھی ایسی کسی بات کا ذکر نہ ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کا قرآن وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے پاس تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آپ کے نسخے میں وہ تمام تفسیری نکتے بھی جمع کر دیے گئے تھے۔ کہ اگر ملت ان سے استفادہ کرتی تو آج قرآن، معنی و تفسیر میں بھی ان اختلافات سے بچ جاتا جن کا اس وقت شکار ہے۔

قرآن مجید کے قدیم نسخے

اور اس بحث میں ایک جیتی جاگتی دلیل قرآن مجید کے وہ قلمی نسخے ہیں جو آج بھی دنیا کے مختلف مقامات پر موجود ہیں۔ امام رضا علیہ السلام کے روضہ مبارک میں، مشہد مقدس میں بہت سے ادارے ہیں جو امامؑ کے نام پر قائم ہیں۔ ان اداروں میں ایک مرکز قرآن بھی ہے۔ یہ مرکز، قرآن مجید کے قلمی نسخوں کا انتہائی نادر اور منفرد ذخیرہ ہے۔ یہاں آپ کو پہلی صدی ہجری اور دوسری صدی ہجری کے لکھے ہوئے متعدد قرآن ملیں گے۔ ان نوادرات میں دو نسخے وہ ہیں جو امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے دست مبارک سے، خط کوفی میں تحریر کیے ہیں۔ یہیں آپ کو امام حسن علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا

ہوا قرآن بھی ملے گا۔ امام زین العابدین علیہ السلام کا تحریر کردہ قرآن بھی ملے گا۔ امام رضا علیہ السلام کا لکھا ہوا قرآن بھی دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ توپ کاپی کے عجائب گھر میں، ترکی میں، نواب رام پور کے کتب خانے میں، ہندوستان میں، مرشد آباد کے شاہی عزاخانے میں بھی قرآن کے قلمی نسخے موجود ہیں جو حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان میں بھی ایک قرآن جناب امیر علیہ السلام کے ہاتھ سے لکھا ہوا موجود ہے۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کو اس نسخے کی خاص طور پر زیارت کرائی جاتی ہے۔ دہلی کی شاہی مسجد میں بھی ایک قرآن موجود ہے جس کو حضرت علی علیہ السلام سے نسبت ہے۔ سنا ہے شاہی مسجد لاہور میں بھی ایک قرآن تبرکاً رکھا ہے جو حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ غرض کہ دنیا میں کم از کم پندرہ ایسے قرآن مَیں شمار کر چکا ہوں جو آج بھی موجود ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کے لکھے ہوئے ہیں۔ مولائے کائناتؑ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن میں اور آج ہمارے درمیان موجود قرآن میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ نہ آیات میں، نہ سورتوں میں، نہ ترتیب میں، اب اگر مولا علی علیہ السلام وہی قرآن لکھتے رہے جو آج ہمارے پاس ہے تو اب کسے یہ حق پہنچتا ہے کہ یہ کہے کہ علیؑ کا قرآن مختلف تھا۔ اور پھر جناب امیر المؤمنین علیہ السلام نے اتنے بہت سے نسخے کب لکھے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ زندگی کے آخری چار سال میں تو ممکن نہیں کیونکہ اس وقت زمانۂ خلافت کی مصروفیات تھیں۔ اس مختصر سے عرصہ میں آپؑ کو تین جنگیں، جمل، صفین اور نہروان لڑنی پڑیں۔ ان میں سے صفین کی لڑائی تین ماہ تک ہوتی رہی۔ اس کے بعد حکمین کے معاملے تک مزید چھ ماہ تک آپؑ محاذِ جنگ پر ہی رہے۔ اس کے علاوہ آپؑ کو مسلم معاشرہ جس تباہ حالت میں ملا تھا۔ اس کی اصلاح میں فرصت کہاں سے ملتی۔ چنانچہ عقل کہتی ہے کہ آپ نے اگر صرف وہی پندرہ نسخے ہی لکھے ہوں جو آج دستیاب ہیں تو ان کی

تحریر اس چھبیس سال کے عرصہ میں ہوئی ہوگی جب آپ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے، یعنی فوراً بعدِ رسولؐ سے اپنی خلافت کے آغاز تک۔ آپ نے قرآن لکھنے کا کام فوراً بعدِ رسولؐ شروع کر دیا تھا۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے۔ چنانچہ ان موجود پندرہ قرآنوں میں سے کچھ پہلی خلافت کے زمانے میں لکھے گئے، کچھ دوسری خلافت کے دور میں، کچھ تیسری خلافت کے زمانے میں۔ اب ہم سے کہا گیا کہ موجودہ قرآن تو تیسری خلافت میں جمع کیا گیا تھا، اگر یہ بات درست ہو تو پہلی اور دوسری خلافت میں جو قرآن لکھے گئے وہ بالکل اسی طرح کے کیسے ہو سکتے ہیں جو آج ہمارے درمیان موجود ہے۔

چنانچہ یہ ماننے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ قرآن اپنی موجودہ شکل میں خود عہد رسالتؐ میں خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے مطابق، خود آپؐ کی نگرانی میں ہی تیار ہو چکا تھا اور رائج بھی ہو چکا تھا۔ خصوصیت سے ہم جو ائمہؑ کو اپنا راہبر و راہنما مانتے ہیں۔ جو انہیں معصوم مانتے ہیں۔ ان کے لئے تو اور کوئی صورت ہی نہیں کہ قرآن کو عہد رسالتؐ میں جمع شدہ مانیں۔ جب ہمارے امامؑ اسی قرآن کو مکمل حقیقی اور منجانب اللہ مانتے رہے تو ہمارے مسلک میں گنجائش ہی نہیں رہ جاتی کہ اس کے کسی غیر معصوم ذریعہ سے جمع ہونے کا تصور بھی کر سکیں۔

یہ روایت، یہ قرآن کو بعد رسولؐ جمع کیئے جانے کی کہانی تو ان کے ذہنوں کی تخلیق ہے جو ہر فضل و کمال سے محرومی کے بعد، خود کو قرآن سے منسلک ثابت کرنا چاہتے تھے اور چونکہ یہ کہنا تھا کہ قرآن ہم نے جمع کیا اس لئے پہلے یہ کہنا پڑا کہ قرآن عہد رسالتؐ میں جمع نہیں ہوا تھا۔ اگر اسے پہلے سے جمع شدہ مانتے تو پھر جمع کرنے کی داستان کیسے سنائی جا سکتی تھی۔

عہد رسالتؐ میں جمع قرآن کا فقہی ثبوت

لیکن کوئی اور جو چاہے کہتا رہے۔ ہم پابند ہیں کہ تسلیم کریں کہ یہ قرآن عہد رسالتؐ میں تحریری صورت میں۔ کتاب کی صورت میں جمع ہو چکا تھا۔ اور اس کی موجودہ ترتیب خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاتھوں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ماننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ قرآن کے متعلق فقہ کے بہت سے احکام ہیں اور ان احکام سے بھی عہد رسالتؐ میں قرآن کے لکھے جانے اور ترتیب دیئے جانے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

فقہ کا ایک حکم ہے۔ تمام مسلمانوں میں متفقہ حکم۔ ہر مسلک اس حکم سے اتفاق کرتا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور حروف کو بغیر وضو کے، اور اگر ضرورت ہو تو بغیر غسل کے چھونے کی اجازت نہیں ہے۔ جو شرائط طہارت نماز کے لئے درکار ہیں وہی قرآن کو چھونے کے لئے درکار ہیں۔ فقہ کے اس حکم کا ماخذ قرآن مجید کی آیت بھی ہے اور احادیث بھی۔ احادیث کے ذیل میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی ہوگا کہ جب یمن کے لوگ ایمان لائے تو حضورؐ نے ان کو قرآن پڑھانے کے لئے مدینہ سے ایک صحابی عمرو ابن حزم کو بھیجا اور بھیجتے ہوئے ضروری ہدایات پر مشتمل ایک خط بھی دیا۔ اس خط میں ایک ہدایت یہ تھی کہ قرآن کو وہ شخص ہاتھ نہ لگائے جو پاک نہ ہو یہ تو تھا ارشادِ پیغمبرؐ۔ اب ملاحظہ فرمایئے قرآن کی آیت۔ سورۂ واقعہ قرآن مجید کی ۷۹ ویں سورۃ ہے۔ اس کی مشہور آیت ہے۔ جو اکثر قرآن مجید کے نسخوں کے سرورق پر لکھ دی جاتی ہے:

﴿لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾

اس کتاب کو نہیں چھوتے سوائے پاک لوگوں کے۔

اب مس کرنا، چھونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قرآن تحریر شدہ صورت

میں نہ ہو۔ ظاہر ہے حافظے کے قرآن کو مس تو نہیں کیا جا سکتا۔ تلاوت کے ذریعہ زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو چھوا تو نہیں جا سکتا۔ یہ تو اسی وقت ممکن تھا جب قرآن کتابی صورت میں موجود ہو اور چونکہ ارشادِ رسولؐ بھی، اور ارشاد خداوندی بھی، دونوں عہد رسالتؐ میں ہوئے ہیں اس لئے ماننے کہ عہد رسالتؐ میں قرآن ترتیب پر ایک کتاب کی شکل پا چکا تھا۔

سورتوں کی ترتیب پر ایک نظر

یہ تو تھا ایک اجمالی بیان یعنی عہد رسالتؐ میں قرآن تحریری شکل میں موجود تھا۔ لیکن اس کی شکل کیا تھی۔ کیا اسی طرح مختلف سورتوں پر مشتمل تھا اور کیا وہ سورتیں ایسی ہی تھیں ان ہی آیات پر مشتمل تھیں، جیسی آج ہیں؟ تو اس کے لئے پہلے تو قرآن کے اعلانات سن لیجئے۔ کفار نے قرآن کو الزام لگایا کہ یہ تو خود حضورؐ نے (نعوذ باللہ) گھڑ لیا ہے تو سورۃ ہود (گیارہویں سورۃ) کی تیرہویں آیت میں کفار کو چیلنج کیا گیا:

﴿قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ﴾

کہ ان سے کہہ دو کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب انسانی کام ہے۔ تو پورا قرآن ایک طرف یہ صرف دس سورۃ ایسی بنا کر دکھائیں یہاں تو دس سوروں کا مطالبہ تھا لیکن سورہ بقر کی ۲۳ ویں آیت میں معاملہ اور آسان کر دیا گیا۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ﴾

اگر تم کو اس کلام کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں شک ہے تو چلو اس کی کسی ایک سورہ ہی کی مثال گھڑ لاؤ۔

اب قرآن کا بار بار سوروں کا تذکرہ کرنا بالکل واضح طور پر اس بات کا اظہار ہے کہ خود قرآن مجید کے نزدیک قرآن مجید کی اکائی، اس کا یونٹ، سورۃ ہے۔ اور یہ تمام سورتیں اللہ ہی کی طرف سے اس شکل میں لائی گئی ہیں۔ یعنی جس سورہ میں جتنی آیتیں ہیں اور جس ترتیب سے ہیں یہ سب اللہ ہی کا فرمان ہے۔ بندوں نے نہ سوروں میں آیتیں جمع کیں اور نہ ترتیب دی۔ ہر سورہ اگر ایک مکمل مجموعہ نہ ہو۔ INTACT نہ ہو تو اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی بنیاد پر فریق مخالف کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اور اس مرحلے پر فقہ کا ایک اور حکم۔ یہ مسئلہ اوروں کے ہاں نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں ہے۔ واجب نمازوں کی پہلی رکعتوں میں، سورۂ حمد کی تلاوت کے بعد کچھ اور تلاوت درکار ہے۔ چنانچہ ہمارے اہلسنت بھائیوں کی فقہ میں اجازت ہے کہ کوئی سی تین آیتیں پڑھ لیں، اور اگر آیت طویل ہو جیسے آیت الکرسی، تو صرف ایک آیت پڑھ لیں۔ لیکن فقہ اہلبیتؑ میں ضروری ہے کہ سورۃ الحمد کے بعد کوئی سورہ پوری پڑھی جائے۔ اب یہ ہماری مرضی کہ مختصر ترین سورہ، سورۂ کوثر پڑھ لیں یا طویل ترین سورۃ بقر پڑھیں لیکن پڑھنی پڑے گی پوری سورہ۔ ایک سورہ پڑھتے پڑھتے اگر بھول جائیں، یاد نہ رہے، تو اس کی جگہ دوسری سورہ بسم اللہ سے شروع کر کے آخر تک پڑھنی پڑے گی ورنہ واجب نماز ادا نہیں ہوگی۔ پھر عرض کر دوں کہ قید نہیں ہے جو سی چاہیں سورہ پڑھیں۔ ۱۱۴ سورتوں میں سے کوئی سی پڑھیں لیکن پوری پڑھنا شرط ہے۔ اس حکم پر عمل ہو ہی نہیں سکتا جب تک قرآن مجید کی تمام سورتوں کو مکمل نہ سمجھیں۔ اس کی ترتیب کو درست نہ مانیں۔ ورنہ اگر یہ گمان ہو کہ کسی سورہ کی کچھ آیتیں، کسی اور جگہ سے وہاں لا کر رکھ دی گئی ہیں، یا جزو قرآن نہیں ہیں، تو اس عقیدے کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ پھر ماننا پڑے گا کہ جس سورہ کی آیت کم ہیں وہ کمی کی

وجہ سے ناقص ہے، اور جس میں بڑھائی گئی ہیں وہ اضافہ کی وجہ سے ناقص ہے۔ اور جب یہ بھی معلوم نہ ہو کہ یہ کمی زیادتی کہاں کی گئی ہے۔ کہاں سے آیات نکال کر کہاں رکھی گئیں ہیں، تو اب قرآن کی تمام سورتیں مشکوک ہو جائیں گی۔ اب ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ کچھ سورتیں نامکمل ہیں لیکن یہ پتہ نہیں کہ کون سی نامکمل ہیں۔ تو اب کوئی سورہ بھی پڑھی جائے نماز ادا نہیں ہوئی۔ کیونکہ پتہ نہیں کہ یہ مکمل والی تھی یا نامکمل والی۔ چنانچہ کسی کا عقیدہ کچھ ہو۔ وہ جانے اور اس کا عقیدہ جانے۔ لیکن ہم پورے قرآن کو، قرآن کی ہر سورہ کو، ہر سورہ کی ہر آیت کو مکمل جانتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ یہ قرآن جس شکل میں ہے یہ شکل خود رسولؐ کی دی ہوئی ہے۔

یہ تو تھا ہمارا عقیدہ۔ لیکن کیا یہ عقیدہ صرف اس لئے تھا کہ فقہ کے بعض مسائل ایسے ہیں کہ ان کی ادائیگی کے لئے یہ مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب خدا اور اس کے رسولؐ کے ذریعہ ہوئی یا اس کی تائید کچھ اور ذرائع سے بھی ہوتی ہے؟ تو یہ بھی عرض کر دوں کہ قرآن مجید کے اندر داخلی شہادتیں بھی ہیں، روایات سے بھی ثابت ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ قرآن مجید آج جس شکل میں ہے۔ یہ شکل، یہ ترتیب خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے چکے تھے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ عرض کر دوں کہ مسلمانوں میں ایک اصطلاح رائج ہے۔ ''ختم قرآن'' کی یہ اصطلاح آج رائج نہیں ہوئی۔ یہ الفاظ خود عہد رسالتؐ میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ حضورؐ کی احادیث میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ آپؐ کا ایک ارشاد ہے کہ جو تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کرتا ہے وہ اسے سمجھتا نہیں ہے۔ قرآن مجید کو ایک رات میں ختم کرنے سے منع فرمایا گیا۔ بہت سے صحابہ کے متعلق بھی ہمیں اطلاعات ملی ہیں کہ فلاں صحابی قرآن کو سات دن میں ختم کرتا تھا۔ فلاں دس روز میں اور فلاں صحابی

ایک ماہ میں۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ایک غیر مرتب، منتشر کتاب کے ختم کرنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ ختم تو وہی کتاب ہو سکتی ہے جس کا ایک آغاز ہو اور ایک مقررہ اختتام ہو۔ پہلی آیت سے شروع کریں اور آخری آیت تک پڑھ ڈالیں تب کہا جائے گا کہ قرآن ختم کیا۔ اگر آغاز وانجام ہی مقرر نہیں تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ فلاں دن کتاب شروع کی اور فلاں دن ختم کر دی۔ چنانچہ ختم قرآن کی اصطلاح بتاتی ہے کہ جب سے یہ اصطلاح رائج ہے اس وقت سے قرآن کی ترتیب موجود ہے۔

اسی طرح حافظ کی اصطلاح ہے۔ قرآن بہت سے لوگوں کو زبانی یاد تھا۔ عہد رسالتؐ کے فوراً بعد جنگ یمامہ میں سات سو، چار سو یا چالیس حافظان قرآن شہید ہو گئے تھے۔ اب یہاں بھی وہی سوال اٹھتا ہے کہ اگر قرآن میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ آیات منتشر تھیں۔ نہ کوئی سورہ تھی، نہ ان کی کوئی ترتیب تھی، تو یہ کیسے معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو قرآن حفظ ہے یا نہیں۔ کسی کو غالبؔ کے سینکڑوں شعر یاد ہوں لیکن اس کے حافظ ہونے کا پتہ تب ہی چل سکتا ہے جب وہ ابتداء سے شروع کرے اور آخری شعر تک زبانی سنا دے، یعنی ضرورت ہے کہ ابتداء انتہا سب طے ہو۔ چنانچہ حافظ موجود تھے تو قرآن بھی مرتب تھا۔ ورنہ یہ کیسے معلوم ہوتا کہ کب آدھا قرآن پڑھ لیا۔ کب پورا ہو گیا اور جو کچھ پڑھا ہے وہ مکمل ہے بھی یا نہیں۔ سینکڑوں صفحے کی کتاب قرآن مجید کو اگر اس طرح پڑھا جائے کہ کبھی ایک آیت ابتداء سے پڑھ لی جائے، دوسری درمیان سے، اور تیسری آخری حصہ سے تو شاید آج کمپیوٹر تو بتا سکے، انسانی حافظ نہیں بتا سکتا کہ پورا قرآن پڑھا گیا یا نہیں۔ پھر پڑھنے والا حافظے سے بھی پڑھے تو کوئی نہ کوئی ترتیب لازماً ہوگی۔ اور کچھ پڑھنے والوں میں اگر یہ ترتیب ایک ہی انداز سے ہو تب ہی اس سارے گروہ کو ایک نام سے یعنی حافظ کہہ کر پکارا جائے گا۔ اب پھر وہی استدلال ہے کہ حافظ کا وجود جب سے

مانیئے گا، قرآن کو اس وقت سے ترتیب شدہ ماننا پڑے گا۔ اور چونکہ عہد رسالتؐ میں حافظوں کا وجود ثابت ہے۔ اس لئے عہد رسالتؐ ہی میں قرآن کا ترتیب پایا جانا ثابت ہے۔

پھر میں اب تک عرض کرتا آ رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کے لئے یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن بکھری ہوئی حالت میں تھا، فلاں صاحب نے جمع کیا تھا۔ یا قرآن سات قرأتوں میں نازل ہوا تھا تو فلاں شخصیت نے باقی قرأتوں کو ختم کر کے، صرف ایک قرأت باقی رکھی۔ ان دعوؤں میں صداقت کتنی ہے اس کا ذکر تو الگ رکھیے۔ جب یہ دعوے کئے جا رہے تھے تو کوئی یہ دعویٰ بھی کرتا کہ قرآن کی موجودہ ترتیب فلاں خلیفہ کی دی ہوئی ہے، یا فلاں صحابی نے تمام ترتیبوں کو ختم کر کے ایک ترتیب دی جو رائج ہوگئی۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ قرآن کو ترتیب دینے کا دعویٰ کسی نے نہیں کیا۔ کہیں یہ روایت ہی مل جاتی کہ فلاں بزرگ نے یہ تجویز پیش کی کہ قرآن کو اس کے نزول کے مطابق جمع کرو یا یہ کہا گیا ہوتا کہ چھوٹی سورتوں کو پہلے رکھ لو بڑی سورتوں کو بعد میں رکھ لینا۔ اگر ترتیب دینے کا کام کوئی ہم جیسا کر رہا تھا۔ تو دوسرا ہم جیسا اس پر اعتراض ضرور کرتا اور جہاں اس قسم کے تمام اعتراضات کتابوں میں موجود ہیں کہ فلاں سورہ عہد رسالتؐ میں زیادہ تھی اب کم ہوگئی ہے یا فلاں سورہ کی اتنی آیتیں تھیں، اب اتنی رہ گئی ہیں۔ عہد رسالتؐ میں بہت سے لوگوں نے تحریری طور پر قرآن مجید کے نسخے اپنی ضرورت کے لئے تیار کیئے تھے۔ چنانچہ یہ جملہ آپ کو اکثر تفسیروں میں مل جائے گا کہ عبداللہ ابن مسعود کا صحیفہ مکمل نہیں تھا۔ یا فلاں کے پاس یہ سورہ مکمل نہیں تھی تو جب ہر ایک کے پاس موجود قرآن مجید کی ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت پر بات کی گئی، تو کوئی تو اس پر سوال اٹھاتا کہ یہ ترتیب اس طرح کیوں دی جا رہی ہے۔ ایسا کوئی سوال نہ ہونا دلیل بات ہے اس بات کی

کہ یہ ترتیب ان ہاتھوں سے ہوئی تھی جن پر اعتراض کیا ہی نہیں جا سکتا تھا اور ایسے ہاتھ سوائے رسولؐ کے ہاتھوں کے اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔

موجودہ ترتیب انسانی کارنامہ نہیں ہو سکتی

اور پھر انسان کی ذہنی سطح، انسان کے سوچنے کے انداز کا اختلاف دیکھئے تو کہنا پڑتا ہے کہ اگر قرآن مجید کی ترتیب بعد کے مسلمانوں نے دی ہوتی تو کبھی اس کی ایک شکل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ جب مختلف منتشر چیزوں کو جمع کیا جائے تو جمع کرتے ہوئے، کوئی نہ کوئی قاعدہ، کوئی نہ کوئی اصول بنایا جاتا ہے۔ یہ اصول، یہ قاعدہ، ہر شخص کے نزدیک مختلف ہوتا، لیکن ہوتا ضرور۔ کسی کے نزدیک بہترین صورت یہ ہوتی کہ قرآن کو تاریخی طور پر جمع کیا جائے یعنی جس ترتیب سے آیات نازل ہوئیں اسی ترتیب سے جمع کی جائیں۔ کوئی کہتا کہ بڑی سورہ پہلے رکھو، چھوٹی اور اس سے چھوٹی بعد میں۔ کوئی صاحب اس ترتیب کو الٹ دیتے، کہتے کہ سب سے چھوٹی سورہ سے شروع کرو اور سب سے بڑی پر ختم کرو۔ کوئی صاحب مکی مدنی کی ترتیب قائم کرتے، کوئی مشکل آسان کی، لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ موجودہ قرآن میں ان میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ نہ موجودہ ترتیب بہ اعتبار نزول ہے۔ نہ چھوٹی بڑی کی ترتیب سے، نہ بڑی چھوٹی کی، نہ مکہ مدنی کی، نہ مشکل آسان کی، تو پھر موجودہ ترتیب کو کیا سمجھا جائے؟ ایک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض حادثہ ہے، اتفاق ہے کہ قرآن کو اس طرح مرتب کر لیا گیا لیکن ایسا ہوتا تو کوئی تو اعتراض کرتا، کوئی تو اختلاف کرتا، احتجاج کرتا، لیکن پوری تاریخ کی خاموشی بتا رہی ہے کہ یہ حادثہ نہیں ہے۔ اتفاق نہیں ہے۔ پھر کیا ہے تو اب یہی صورت رہ جاتی ہے کہ قرآن جس پر نازل ہوا تھا اسی نے اسے ترتیب دے دی اور اب چونکہ موجودہ ترتیب صاحب

کتاب نے دی ہے، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دی ہے اس لئے کسی کو اختلاف کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہر دور میں قرآن مجید کی ایک ہی ترتیب کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ جس نے قرآن کی حفاظت کی ہے اس نے ترتیب کی حفاظت بھی کی ہے۔

ترتیب قرآن پر خود قرآن کا موقف

غرض دلائل کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب خود حضورؐ نے فرما دی تھی لیکن گفتگو طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے میں یہاں ترتیب کے سلسلہ میں ان ارشادات کو بیان نہیں کروں گا جو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمائے ہیں ائمہؑ کے اقوال اور اصحابؓ کی رائے بھی نقل نہیں کروں گا۔ صرف قرآن مجید کے ایک ارشاد پر اس بحث کو ختم کر دوں۔ تمہیداً یہ عرض کر دوں کہ قرآن مجید کی چھوٹی سورتوں کے علاوہ باقی تمام سورہ ایک مرتبہ میں نازل نہیں ہوتی تھیں۔ چار چار، پانچ پانچ آیتیں ایک وقت میں نازل ہوتی تھیں اور یہ آپؐ خود ارشاد فرماتے تھے کہ ان آیات کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد رکھ دو۔ یا فلاں آیت سے پہلے رکھ دو۔ کبھی اس طرح کچھ آیات سورہ کے شروع میں آ جاتیں، کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں۔ اس طرح سورہ کی ساخت میں تبدیلی ہوتی رہتی۔ اس پر کفار نے اعتراضات شروع کیئے کہ یہ ردو بدل، یہ ترتیب کو بدلنا ظاہر کرتا ہے کہ قرآن خود حضورؐ بناتے ہیں۔ کفار کے اعتراضات سے خود کچھ کمزور ایمان نومسلم بھی شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں، قرآن مجید کی سولہویں سورۃ کی آیات ۱۰۱ اور ۱۰۲ میں، اس اعتراض کا جواب دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ

اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥۔

اور جب ہم نے ایک آیت کے مقام کو دوسری آیت سے بدل دیا، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ نازل کرتا ہے، تو ان (کافر) لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ آپ خود قرآن گڑھتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے اکثر جاہل ہیں اس کے بعد ارشاد ہوا کہ آپ کہہ دیں کہ اس کو تمہارے پروردگار کی طرف سے روح القدس نے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کو ثابت قدم رکھے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہو۔ اب مکان آیت بدلنے کا مطلب یہی ہوگا کہ کسی آیت کو درمیان میں لے آیا جائے، درمیان والی آخر میں کر دی جائے۔ آخر کو شروع میں کر دیا جائے۔ اور اسی بات کا دوسرا نام ترتیب دینا ہے۔ چنانچہ اس ترتیب کو اللہ مسلمانوں کے لئے ثابت قدمی کا امتحان قرار دے رہا ہے اور کافروں کے اعتراض کو جاہلانہ اعتراض کہہ رہا ہے اور اعتراض تھا بھی جاہلانہ، اس لئے کہ آیت کا مقام خود اللہ بدلنے والا ہے جو ترتیب دے۔ خدا قرآن کو نازل کرنے والا ہے، وہ جب نازل کر رہا ہے تو فیصلہ کرنا بھی اسی کا کام ہے کہ کس آیت کا کیا مقام ہو کسی اور کو حق ہی نہیں پہنچتا کہ اعتراض کرے۔ تو یہاں اللہ سند دے رہا ہے کہ یہ ترتیب ہم خود دلوا رہے ہیں۔ یہ تقدیم و تاخیر ہمارے فرمان سے ہو رہی ہے ... اب جب ایک مرتبہ اللہ ایک ترتیب کو اپنی ذمہ داری قرار دے رہا ہے تو ہم پابند ہو گئے ہیں کہ قرآن جس شکل میں ہم تک پہنچے ہم اس کو اللہ کی طرف سے سمجھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی کہے کہ جب یہ سند دی گئی اس وقت تک ترتیب اللہ کی طرف سے تھی لیکن بعد میں کچھ آیتوں کو لوگوں نے اپنے طور پر اپنی جگہ سے ہٹا دیا۔ تو میں کہوں گا کہ اللہ نے جب سند دے دی کہ یہ ترتیب ہماری طرف سے ہے تو اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ بعد میں بھی ترتیب میں کسی انسان کا دخل نہ ہونے دے۔ کیونکہ سند کی موجودگی میں ہم ہر

ترتیب کو اللہ کی طرف سے سمجھنے کے پابند ہو گئے۔ اب اگر کسی انسان کو اس میں مداخلت کا موقع مل گیا تو ہماری گمراہی کا سبب اللہ کی سند ہو گی اور اللہ پر واجب ہے کہ وہ ہماری ہدایت تو کرے لیکن گمراہ نہ کرے۔ چنانچہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ کی تصدیق کے بعد کوئی قرآن میں ردو بدل کر سکے۔

قرآن کی ترتیب نزولی نہ ہونے کا سبب

اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن کو نازل بھی اللہ نے کیا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اس نے خود لیا ہے اور یہ صرف الفاظ یا آیات کی نہیں، بلکہ اس ترتیب کی بھی حفاظت کی گئی جس میں صاحب کتاب نے کتاب کو رکھنا چاہا، تو یہ مان لینے کے بعد کہ یہ کتاب اللہ کی ہے اور اس کی ترتیب بھی اسی کی منشاء، اسی کے حکم سے ہے تو ہمارا یہ کام نہیں رہا کہ کہیں قرآن میں آیات کی ترتیب ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہم اسے کسی بدنیت کی بدنیتی قرار دیں۔ بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ اس مصلحت کو جاننے کی کوشش کریں جس کو سامنے رکھ کر موجودہ ترتیب قائم کی گئی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ بعض اہم مقامات پر جہاں آیات کی ترتیب ہماری توقعات کے مطابق نہیں ہے جہاں بظاہر ایک تذکرے میں دوسرا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والا غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان مقامات کو سمجھنے کی کوشش کروں لیکن یہ بعد کی بات ہے اس وقت صرف ایک الجھن پر چند جملے عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

الجھن یہ ہے کہ آج قرآن مجید جس شکل میں ہمارے پاس ہے۔ اس میں ایک بات بہت واضح ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب اس ترتیب سے بالکل مختلف ہے، جس سے یہ نازل ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سب سے پہلے سورہ علق کی پانچ آیتیں نازل

ہوئی تھیں۔ چنانچہ قرآن کا آغاز ان آیتوں سے ہونا چاہئے تھا۔لیکن یہ آیتیں تیسویں پارے میں ہیں۔سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات میں ایک آیت ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ کی آیت ہے لیکن یہ سورہ مائدہ میں ہے جوموجودہ ترتیب میں پانچویں پارے میں ہے پھر مکہ میں نازل ہونے والی سورتیں پہلے اتریں۔ مدنی سورتیں بعد میں نازل ہوئیں۔لیکن پہلے پارے میں سورۃ الحمد کے بعد قرآن کی طویل ترین مدنی سورۃ، سورہ بقرہ ہےاور اکثر مکی سورتیں قرآن کے آخری حصہ میں ہیں۔خصوصاً تیسواں پارہ زیادہ تر مکی سورتوں پر مشتمل ہے اور صرف یہی نہیں۔ایسا بھی ہے کہ مدنی سورہ میں وہ آیتیں شامل ہیں جو مکہ میں نازل ہوئی تھیں یا سورہ مکی ہے اور اس میں مدینہ میں نازل ہونے والی آیتیں شامل ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ آخر قرآن کو اسی طرح کیوں نہیں جمع کیا گیا جس طرح نازل ہوا تھا۔

تو اس سلسلہ میں اگر صرف ایک پہلو پیش نظر رہے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید پوری نسل انسانی کی ہدایت کے لئے آیا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ ہر انسان کو یکساں طریقہ سے ہدایت نہیں دی جا سکتی۔انسانوں کی ذہنی اور عملی حالت مختلف ہے۔اسی اعتبار سے ان کی ہدایت کا انداز مختلف ہوگا۔ایک وہ گروہ ہے جو نہ خدا کو مانتا ہے، نہ رسول کو مانتا ہے، نہ اس کے نزدیک اس زندگی کے بعد کوئی زندگی ہے۔ اس کے نزدیک عمل کی دنیا میں نہ کچھ ناجائز ہے، نہ حرام ہے وہ اپنے مفاد کے علاوہ کسی اعلیٰ اصول زندگی کا قائل نہیں ہے۔اب اس جماعت کو اگر سیدھے راستے پر لانا ہے تو پہلے اسے خدا کے وجود کا قائل کیجیے، اسے وحدانیت کا سبق پڑھائیے، اسے رسولؐ کی رسالت کا یقین دلایئے، جب یہ مرحلے طے ہو جائیں تب بتایا جائے کہ منشائے خدا کیا ہے۔ وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ پھر بتایا جائے کہ اللہ کی عبادت کیسے ہوتی ہے، نماز کیسے

پڑھی جائے، روزے کیسے رکھے جائیں، معاشرت کے قاعدے کیا ہیں، وراثت کے قوانین کیا ہیں۔ تو اب یہ دیکھیں کہ جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو ہر طرف کفار کا دور دورہ ہے۔ ہر طرف شقاوت اور ظلم ہے۔ خانۂ خدا، تین سو ساٹھ بتوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ اب اس جماعت کی ہدایت کا طریقہ کیا ہوا؟ ایک دن میں تو یہ لوگ نہیں بدل جائیں گے۔ انہیں بتدریج بدلا جائے گا۔ پہلے ذہن کی اصلاح ہوگی، عقائد درست کیئے جائیں گے، نظریات ٹھیک کیئے جائیں گے۔ چنانچہ قرآن جب نازل ہونا شروع ہوا تو پہلے زیادہ تر عقائد کی بات کی گئی۔ جو لوگ اس کے پہلے مخاطب تھے ان کی ضرورت کے پیش نظر پہلے اسلام کے اصول سکھائے گئے۔ چنانچہ اب مکہ میں نازل ہونے والی سورتیں دیکھ لیں۔ تمام چھوٹی چھوٹی سورتیں۔ ان سب میں زیادہ تر عقائد کی بات ہوئی ہے۔ کبھی وحدانیت کا تذکرہ ہے۔ کبھی یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ کبھی بتایا جا رہا ہے کہ ایک دن قیامت آئے گی، تمام مردے زندہ کیئے جائیں گے، ان کا حساب ہوگا۔

اب مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ ایک پورا شہر مدینہ، تقریباً سارے کا سارا، مسلمان ہو گیا۔ تو اب یہ احکام نازل ہو رہے ہیں کہ نماز کیسے پڑھی جائے۔ روزہ کیسے رکھا جائے۔ حج کیسے کیا جائے۔ جنگ کے قواعد کیا ہیں۔ امن اور صلح کے اصول کیا ہیں۔ شادی بیاہ کیسے ہو۔ اولاد کی تربیت کیسے ہو۔ ہمسائے کے کیا حقوق ہیں۔ دوست کون ہے۔ دشمن کون ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مجمع عقائد کی حد تک اصلاح پا چکا ہے۔ اب اسے اپنے عقائد کی روشنی میں زندگی بسر کرنی ہے۔ تو اسے عمل کی جزئیات معلوم کرنی ہیں، زندگی گزارنے کے اصول جاننے ہیں۔ چنانچہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتیں تفصیلی ہیں۔ ان میں جزئی احکام ہیں۔ معاشرت، عبادت، سیاست،

حکومت اور اطاعت خدا و رسولؐ کے قوانین ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ نزول کی ترتیب ان خاص حالات کا نتیجہ تھی جو ظہورِ اسلام کے وقت موجود تھے۔ کتاب خدا کا جزو اول یعنی مکہ میں نازل ہونے والا قرآن کافروں کو مسلمان بنانے کے لئے تھا۔ مدینہ میں نازل ہونے والا حصہ مسلمانوں کو باعمل اور بہتر مسلمان بنانے کے لئے نازل ہوا۔

اب آج پورا قرآن بدستور پوری دنیا کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے لیکن اس کا زیادہ استعمال ان کے لئے ہے، اس کی قدم قدم پر ضرورت ان کو ہے جو پیدائشی مسلمان ہیں۔ جو ہدایت کی پہلی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ ان کو خدا اور رسولؐ پر یقین ہے چنانچہ ان کے لئے تو ان کی ضرورت کے سوالوں کا جواب چاہیے، اور وہ وہی سوال ہیں جو مدینہ والوں کے سامنے تھے۔ چنانچہ اب قرآن کو ہم اس لئے پڑھیں گے کہ اسلام کے احکام جان سکیں۔ چنانچہ قرآن نازل ہوا تھا تو اس وقت اس کے پہلے مخاطب کافر تھے۔ آج قرآن کے پہلے مخاطب مسلمان ہیں۔ مخاطب کے فرق کی وجہ سے ترتیب بھی مختلف تھی۔ نزول کی ترتیب وہ تھی کہ کافر مسلمان بن سکیں۔ آج کی ترتیب وہ ہے جس سے مسلمان اپنے عمل کی اصلاح کر کے، اور اپنے علم میں اضافہ کر کے، بہتر مسلمان بن سکیں... آج کی ترتیب وہ ہے کہ جس سے مسلمان پہلے زندگی کے اصول سیکھ سکیں، شریعت کے قانون جان سکیں۔

ہمارے لئے، مسلمانوں کے لئے یہی ترتیب مناسب ہے، موزوں ہے، بہترین ہے جس میں آج قرآن ہمارے سامنے موجود ہے۔ البتہ ترتیب نزول کو بھی جان لیا جائے تا کہ یہ معلوم رہے کہ جب کافر کو اسلام کی طرف بلانا ہو تو طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ غیر مسلم کو اسلام سے متعارف کرانا ہو تو پہلے کس بات کی طرف دعوت دی جانی چاہیے۔

یوں کہوں کہ جب ہم اجنبی سے ملتے ہیں تو پہلے اپنا نام بتاتے ہیں۔ سماجی، معاشرتی حیثیت بتاتے ہیں۔ اپنے ذاتی مسائل، اپنے گھر کی باتیں نہیں شروع کر دیتے۔ لیکن جب اجنبیت دوستی میں بدل جاتی ہے تو اب دل کی ساری بات بے تکلف ہوکر بیان کر دیتے ہیں۔ قرآن کی بھی یہی صورت ہے۔ پہلے، جب وہ نازل ہو رہا تھا تو ہر طرف اجنبی تھے۔ ان سے اپنا تعارف کرا رہا تھا۔ اسلام کا تعارف کرا رہا تھا۔ اب قرآن دوستوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان سے گھر کی باتیں، گھر والوں کی باتیں کرتا ہے۔

اگر آج قرآن کی ترتیب دیکھیے تو سب سے پہلے سورہ حمد ہے۔ اس سورہ میں براہ راست خود انسان کی زبان سے، وحدانیت، قیامت، اللہ پر ایمان رکھنے کا اعتراف ہے۔ اس کی امداد کا اقرار ہے۔ اس کی ہی عبادت کا عزم ہے۔ اس سے ہی عطائے ہدایت کی دعا ہے۔ غرض جو سورۂ حمد پڑھ رہا ہے، وہ اپنے مکمل مسلمان ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ یہ اقرار بتا رہا ہے کہ اب یہ کتاب ماننے والوں کے لئے ہے۔ ان کی ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اور پھر سورۂ حمد کے فوراً بعد سورہ بقرہ ہے جس میں سورۂ حمد کے جواب میں، ہدایت کی دعا کے جواب میں، قرآن کہہ رہا ہے کہ ہدایت تو ملے گی، لیکن اس ہدایت سے وہی فیض اٹھا سکیں گے، جو متقی ہوں گے۔ جو ایمان کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے گویا اب جو ترتیب قرآن ہے وہ مؤمنین کی، متقین کی ضرورت کے پیشِ نظر ہے۔ جو گروہ مؤمنین سے ہوں گے، جماعت متقین سے ہوں گے، انہیں اس ترتیب سے فیض اٹھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

حصہ دوم

ترتیبِ قرآن

حفاظتِ قرآن : ۱۲

ترتیب قرآن

قرآن حکیم کے نزول اور حفاظت کے موضوع پر ایک طویل سلسلۂ تقریر کے بعد اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا یقیناً سماعتوں پر بار ہوگا۔ لیکن یہ بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ سلسلۂ گفتگو نے سماعت اور فکر کو جو ایک سمت، ایک جہت دی ہے اسے اچانک منقطع کر کے ایک بالکل مختلف عنوان پر بات شروع کر دی جائے۔ ممکن ہے ایسا کوئی عمل اب تک کاوشوں کو ضائع کرنے کے برابر ہو جائے۔ اس لئے ایک طرف تو فکری تسلسل برقرار رہے، دوسری طرف جدت موضوع کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے آج سے حفاظت قرآن کا مسئلہ ایک مختلف زاویہ سے زیر بحث لانا چاہتا ہوں۔ اس طرح جس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے کچھ نئے پہلو بھی سامنے آ جائیں گے اور حفاظت قرآن کے بارے میں ذہنوں میں موجود بعض اہم شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ہو سکے گا۔

قرآن کا منفرد اندازِ بیان

چنانچہ موضوع کی وضاحت سے پہلے کچھ اصولی باتوں کا تذکرہ ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید سراپا علم ہے، حکمت ہے، انسان کو شعور بھی عطا کرتا ہے اور حقائق سے آگاہی بھی۔ لیکن ان باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک واضح بات ہے کہ قرآن مجید کا مقابلہ یا موازنہ دنیا کی کسی دوسری کتاب سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دنیا کی ہر کتاب کسی خاص علم، کسی خاص مسئلے یا کسی خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ اور پھر اگر موضوع وسیع ہو تو کتاب کا ہر باب اپنے طور پر ایک ضمنی عنوان کی تشریح کرتا ہے۔ اس کا ہر جزو کسی خاص حوالے سے تحریر کیا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کا کوئی ایک موضوع نہیں ہے۔ نہ اس میں کسی ایک علم کا بیان ہے۔ بات کو اور واضح کر دوں کہ ایک فزکس کی کتاب، فزکس کے ذیلی موضوعات پر مشتمل ہوگی، ایک علم کیمیا کی کتاب کیمسٹری کے مختلف مسائل پر بحث کرے گی۔ لیکن فزکس کی کتاب میں سیاست کے کسی مسئلے پر اظہار خیال نہیں ہوگا۔ کیمسٹری کو اخلاقیات یا معاشیات سے بحث نہیں ہوگی۔ اس کا ہر باب کیمسٹری کے ہی عنوانات پر، اس علم کے مخصوص نقطۂ نظر سے تحریر ہوگا۔ لیکن قرآن مجید، تمام تر علم ہوتے ہوئے، اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فزکس کی کتاب ہے یا اکنامکس کی کتاب ہے۔ یا تاریخ کی کتاب ہے۔ اچھا اگر پورے قرآن کا ایک موضوع نہیں تو اس کے مختلف ابواب اس کے Chapters ہی اپنی اپنی جگہ کسی ایک عنوان پر مسلسل مضمون ہوتے لیکن یہ صورت حال بھی نہیں ہے۔ دو چار چھوٹی سورتوں کے علاوہ کسی سورہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فلاں موضوع پر ہے۔ یوں تو ہر سورہ کا کم از کم ایک نام بھی ہے لیکن یہ نام صرف شناخت کے لئے ہے۔ یہ سورہ کا عنوان یا موضوع نہیں ہے۔ اکثر نام تو سورہ میں صرف ایک مرتبہ آ جانے والے لفظ پر مشتمل ہیں۔ اور ضروری نہیں، بلکہ اکثر جگہ وہ لفظ پوری سورہ میں کوئی بنیادی مقام نہیں رکھتا۔

قرآن کے انداز بیان کی اس کیفیت کو ظاہر کرنے لئے شاید ہمارے پاس کوئی

ایک مناسب لفظ نہ ہو۔ عام حالات میں ایسے طرزِ کلام کو بے ربط کہا جاتا۔ لیکن یہ محض عقیدتاً نہیں، بلکہ حقیقتاً عرض کر رہا ہوں کہ ایک موضوع پر نہ ہوتے ہوئے بھی قرآن کے قاری کو کہیں بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا۔ الگ الگ علوم، الگ الگ مسائل پر بات ہوتے ہوئے بھی قرآن کی ہر آیت دوسری آیت سے منسلک ہے اور سمجھ کر پڑھنے والے کو ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر منتقل ہوتے ہوئے، ایک مسئلہ کے بعد دوسرے مسئلہ کی طرف جاتے ہوئے کبھی جھٹکا نہیں لگتا۔ کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ابھی بات تو کچھ اور ہو رہی تھی اب یہ جملہ کہاں سے آ گیا۔

اس انداز کو کیسے سمجھیں؟ اس کو کیا نام دیں؟ تو میں عرض کروں گا کہ قرآن مجید کسی علم کی، کسی فن کی کتاب نہیں ہے۔ یہ کتاب درحقیقت کتابِ زندگی ہے اور زندگی ہر لمحہ، ہر آن اک نئے انداز سے نمایاں ہوتی ہے۔ ایک لمحہ خوشی اور راحت کا ہے تو دوسرا رنج و الم کا، ایک وقت عقل و خرد کا ہے تو دوسرا جذبات و احساسات کا، ایک گھڑی دل کے لئے محبت کی دھڑکن عطا کرتی ہے تو دوسری نفرتوں کے سیلاب میں بہا لے جاتی ہے۔ غرض ہر آن دوسری آن سے جدا، ہر لمحہ دوسرے لمحے سے الگ۔ لیکن یہ الگ الگ لمحے، یہ جدا جدا پل، مل کر ایک ہی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں چنانچہ جس طرح زندگی کے لمحات بدلتے رہتے ہیں، قرآن کے موضوعات بدلتے رہتے ہیں۔ اور لاکھ تبدیلی کے باوجود ایک فرد کی زندگی، ایک زندگی ہوتی ہے، اس میں ایک وحدت موجود ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کے موضوع بدلتے رہنے کے باوجود ان میں ایک داخلی ربط موجود رہتا ہے۔ کبھی اس کا تسلسل ٹوٹنے ہی نہیں پاتا۔

میری بات میں ابہام نہ رہ جائے اس لئے ایک مثال سے واضح کردوں۔ فرض کیجئے میرے سامنے سوال یہ ہے کہ میں اپنے بچے کو تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔ اچھی تعلیم کے

لئے اچھا اسکول چاہیے۔ لیکن صرف اچھے تعلیمی ادارے کے مل جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس ادارے میں بچے کو داخل کرانے کے لئے مالی وسائل کی ضرورت ہوگی مالی وسائل کا انحصار اس بات پر ہے کہ مجھ میں حصول معاش کے لئے کون کون سی صلاحیتیں ہیں۔ اور پھر ان صلاحیتوں کو استعمال کرنے والے، ان کی قیمت ادا کرنے والے بھی موجود ہیں یا نہیں۔ اور اس بات کا انحصار ملک کے جغرافیہ، اس کی سیاسی حالت، اس کے معاشی وسائل سے ہے۔ صنعتی معاشرے میں معاش کے بہتر وسائل ان کو حاصل ہوں گے جو فنی اور تکنیکی ماہر ہوں گے۔ زرعی معاشرے میں خوشحالی کا ذریعہ زمین کی مقدار ہوگی۔ غرض ایک بچے کی تعلیم کا مسئلہ ملکی اور معاشرتی مسائل سے مل جاتا ہے۔ یہ سب الگ الگ موضوعات ہیں لیکن بچے کی تعلیم پر ان سب موضوعات کا اثر پڑے گا۔ ان سب کو زیر بحث لایا جائے گا۔ اب قرآن کے پیش نظر پوری انسانیت کی تعلیم ہے چنانچہ یہ مسئلہ فرد و عمل کے مسائل سے شروع ہوتا ہے۔ تو پہلے یہ ذکر ہوگا کہ صحیح فکر کیا ہے، عقائد کیا ہوں، وحدانیت پر بات ہوگی، رسالت پر بات ہوگی، اس دن سے باخبر کیا جائے گا جس دن انسان اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا، حساب و جزا و سزا کا تصور واضح کیا جائے گا۔ اور عمل کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ پیدا ہو کر مرتے دم تک مسلسل جاری ہے۔ بلکہ بہت سے اعمال اپنے نتائج کے حوالے سے مرنے کے بعد بھی جاری رہیں گے۔ اعمال کی اس وسیع دنیا میں سیاست بھی ہے، معاشیات بھی ہے، اخلاقیات بھی ہے، باہمی رشتے اور رابطے بھی ہیں، ذات بھی ہے، معاشرہ بھی ہے، خاندان بھی ہے، ملک اور دنیا بھی ہے، اور پھر ان سب سے تعلق رکھنے والی دوستیاں بھی ہیں، دشمنیاں بھی ہیں، راحت و آرام کے مرحلے بھی ہیں، تکلیف اور مصیبت کی گھڑیاں بھی ہیں، اس میں علم کی بھی ضرورت ہے، جرأت کی بھی ضرورت ہے کبھی، خوف کی بنیاد پر عمل ہوگا، کبھی فائدے اور شوق کے تحت عمل ہوگا۔

چنانچہ یہ سب قرآن میں موجود ہے۔ یہ تمام تذکرے ہیں۔ اور اسی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں جیسے زندگی میں ایک دوسرے سے ربط رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہی ربط قرآن میں بھی ہے۔ اس کی آیات میں بھی اور سورتوں میں بھی۔ یعنی ہر آیت اپنے سلسلۂ کلام سے جڑی ہوئی ہے اور ہر سورہ اپنے سے پہلے اور بعد کی سورتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ پہلی پہلی نظر میں اس تعلق کو سمجھ بھی جائیں۔ سمجھنا تو ہر شخص کی اپنی اپنی ذہنی سطح پر مشتمل ہے۔ انسان تو بعض اوقات انسان کی گفتگو میں موجود ربط کو نہیں سمجھ پاتا تو وہ اللہ کے کلام کے ربط کو فوراً کیسے سمجھ جائے گا۔ لیکن جب اصول کے طور پر مان لیا جائے، اس بات کو عقل تسلیم کرے کہ اللہ کے کلام میں ربط ہونا چاہیئے، تو جب یہ تسلیم کر لیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ بکھرے ہوئے، منتشر جملوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مربوط کلام ہے۔ اور اب یہ ہماری ذمہ داری ہوگی کہ اس موجود ربط کو تلاش بھی کریں. اسے سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔

ایک مثال۔ سورۃ الحمد کا ربط

بات کی وضاحت کے لئے ایک مثال دوں۔ قرآن مجید کی پہلی سورہ، سورہ حمد ہے۔ اب اس سورہ میں پہلی آیت سے اللہ کی حمد شروع ہوتی ہے۔ ایک اعتراف یہ ہے کہ اس کے نام سے شروع کر رہا ہوں۔ جس کی صفت اول یہ ہے کہ وہ رحمان و رحیم ہے۔ پھر تمام تعریفوں کا حقدار وہی ہے۔ پھر ایک مرتبہ اس کی رحمت کے فراواں ہونے کا ذکر ہے اس کے بعد اس کے یوم حساب، یوم جزاء کے مالک ہونے کا بیان ہے حمد کی ان چار آیات کے بعد بندے کی طرف سے اپنے مالک حقیقی سے جو تعلق ہے، اس کا تذکرہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد ایک دعا ہے۔ اب بظاہر سورہ حمد کی سات آیات تین

الگ الگ ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ حمد ایک جزو، خالق و مخلوق کا تعلق دوسرا جزو، دعا تیسرا جزو، یہ تینوں اجزاء ایک دوسرے سے الگ موضوع ہیں۔ لیکن ان ساتوں آیت میں اتنا گہرا ربط ہے کہ اگر ان میں سے کوئی آیت اپنی جگہ سے ہٹا دی جائے تو بات الجھ جائے گی، ادھوری رہ جائے گی۔

سورہ شروع ہوئی، پڑھنے والے نے اپنے ایک عمل کی بنیاد بتائی۔ اس اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں یا زیادہ درست ترجمہ یہ ہوگا کہ اس اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ اب کیا شروع کر رہے ہیں؟ یا اللہ کے نام سے آغاز کیوں؟ تو ان سوالوں کا جواب بعد میں ہوگا پہلے تو یہ واضح ہو جائے کہ اسے رحمان و رحیم کیوں کہا ہے۔ دونوں الفاظ کا مطلب ایک ہی تھا۔ رحم کرنے والا تھا۔ تو آخر یہ ایک ہی صفت کے لئے دو لفظ کیوں؟ تو پہلے یہ کہا کہ تمام حمد تمام تعریف کا حقدار وہ اللہ ہے جو عالمین کی پرورش کرتا ہے اور وہی ہے جو اس پوری کائنات کے انجام کا مالک ہے یعنی آغاز بھی وہی، انجام بھی وہی، اس دنیا میں بھی وہی اور آخرت میں بھی وہی۔ اس دنیا سے اس کا تعلق پرورش کا، پالنے کا، ربوبیت کا ہے۔ اور آخرت سے اس کا تعلق ملکیت کا، مکمل مظاہرۂ اختیار کا ہے۔ اب دونوں دنیاؤں کے اس ذکر کے دوران پھر پہلی آیت میں کہی گئی صفات کا بیان کہ وہ رحمان و رحیم ہے۔ رحمان رحمتیں نازل کرنے والا۔ رحم کرنے والا۔ اور رحیم بھی رحم کرنے والا۔ فرق کیا ہے رحمان اور رحیم میں؟ تو رحمان وہ ہے جو رحم کرتا ہے بغیر کسی حق کے۔ کوئی فرمانبردار ہے یا نافرمان، کوئی اسے مانتا ہے یا نہیں مانتا، کوئی مؤمن ہے یا کافر، ان سب باتوں سے اس کے رحم پر فرق نہ پڑے، بس وہ اپنی عطا جاری رکھے۔ اس سے بحث نہیں کہ جس پر عطا ہو رہی ہو اس کا طرز عمل کیا ہے۔ ایسا رحم کرنے والا تو رحمان ہے اب رہ رحیم۔ تو یہ رحم کرنے کا وہ انداز ہے جب دیتے ہوئے دیکھا جائے کہ لینے والا مستحق

بھی ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے کو رحمت کا حقدار ثابت کیا ہے یا نہیں۔ اب اللہ رحمان ہے اس دنیا میں جہاں وہ اپنی نعمتیں دیتے ہوئے کافر و مؤمن میں فرق نہیں کرتا، شکر گزار اور ناشکر گزار میں امتیاز نہیں کرتا۔ سب کو دیتا ہے۔ زندگی، محبت، دولت، اولاد سب کچھ، سب کو عطا کرتا ہے۔ اور پھر رحیم ہے آخرت میں جہاں دینے سے پہلے حساب کرے گا، پوچھے گا کہ میرا حکم مانا تھا کہ نہیں، میرے فرمان پر عمل کیا تھا یا نہیں۔ پھر اطاعت گزاروں کو نعمتیں عطا کرے گا، نافرمان کو سزا دے گا، محروم رکھے گا ... اب دنیا ہو یا آخرت ہو اس کا تعلق مخلوق سے رحمت کا ہے۔ اس لئے عالمین اور یوم الدین کے درمیان الرحمٰن الرحیم کہہ کر رحمت کو دونوں دنیاؤں کا پل بنا دیا۔ یہاں بھی رحمت سایہ فگن، وہاں بھی رحمت جلوہ نما۔ چونکہ پہلے ذکر عالمین کا تھا اس لئے رحمان کا لفظ پہلے آیا، عالمین کے ساتھ جڑا۔ پھر رحیم آیا، مالک یوم الدین کے ساتھ، یعنی عالمین میں اس کی رحمت رحمان کی حیثیت سے ہے۔ ہر ایک پر یکساں ایک فرد کے لئے فراواں..... اور آخرت میں اس کی رحمت رحیم کی صورت میں ہے کہ جو اپنے کو اس کی رحمت کا حقدار ثابت کرے گا صرف اسے رحمت ملے گی۔

اور اللہ رے بلاغت قرآن! اتنے مختصر لفظوں میں یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ فرق کیوں ہے، یہاں رحمان کیوں ہے؟ وہاں رحیم کیوں ہے؟ رحم کے یہ دو انداز کیوں ہیں؟ تو وجہ دو اور صفات کے ذریعہ بتائی گئی۔ عالمین کے ساتھ اس نے کہا وہ رب ہے عالمین کا۔ رب کے معنی ہیں پرورش کرنے والا، تربیت کرنے والا، پالن ہار۔ اب تربیت کرنے والا تربیت کرتے ہوئے، استاد شاگردوں کو تعلیم دیتے ہوئے، والدین اولاد کو پروان چڑھاتے ہوئے، ایک کو کچھ دیں اور دوسرے کو نہ دیں، یہ تو ناانصافی ہے۔ ابھی تو انسان دنیا میں آیا ہے۔ ابھی تو کسی نے بھی، کسی بھی طرح، خود کو کسی بات کا حقدار ثابت نہیں

گیا۔ ابھی موقع ہی کہاں ملا کہ ہم کہیں کہ اسے یہ حق ہے یا نہیں ہے۔ ابھی تو ہر ایک کو ملے گا، بغیر حق کے ملے گا۔ ایسے مرحلے پر اگر ایک کو ملے دوسرے کو نہ ملے تو اس تفریق کا، اس امتیاز کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔ اس لئے یہاں پالنے والا اپنی مخلوق سے یکساں سلوک کرتا ہے۔ سب کو ایک انداز سے دیتا ہے۔ یہاں اس کی رحمت سب کے لئے ہے۔ اب اس دنیا میں یکساں مسائل، یکساں ذرائع، یکساں مہربانیوں کے ساتھ تربیت کا ایک جیسا موقع ملا لیکن کسی نے ان عنایتوں کا فائدہ اٹھایا اور وہ کچھ بن گئے جو پالنے والا چاہتا تھا۔ کچھ نے تمام مواقع گنوا دیئے۔ اور ان راہوں پر جا نکلے جو پالنے والی ذات کی مرضی اور منشاء کے خلاف تھیں۔ تو اب ایک دن ہر ایک کی تربیت کا حساب مانگا گیا۔ یہ یوم الدین تھا۔ آج حساب بھی وہی لے رہا ہے جس نے کل پرورش کی تھی لیکن آج وہ اپنا تعارف مالک کی حیثیت سے کرا رہا ہے، رب کی حیثیت سے نہیں۔ پالنے والے کی حیثیت سے نہیں بلکہ صاحب اختیار کی حیثیت سے... چنانچہ مالک ہوتے ہوئے، صاحب اختیار ہوتے ہوئے، آج ضرورت ہے کہ فرمان بردار کو انعام ملے۔ نافرمان کو سزا ملے

استاد تعلیم دیتے وقت ایک طالب علم کو تو بہت سی باتیں بتائے اور دوسرے کو بے خبر رکھے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ لیکن وہی استاد اگر طالب علموں کا امتحان لے رہا ہو، ان کی قابلیت، ان کے سیکھنے کا حساب کر رہا ہو تو یہاں لائق کو کامیاب نہ قرار دے اور نالائق کو اگلی جماعت میں ترقی دے دے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ رب نے ربوبیت کی تو رحمان بن کر اور مالک نے حساب لیا تو رحیم بن کر۔

لیجئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں جو رحمان اور رحیم کہا گیا تھا اسے واضح کر دیا گیا لیکن ابھی ابتدائی لفظ کا ربط سامنے نہیں آیا۔ وہ جو کہا تھا بسم اللہ، اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام سے... تو اس ''با'' کا کیا مطلب تھا؟ یعنی حمد کی چار آیتوں کے بعد بھی ابھی

بات نامکمل ہے۔ یعنی بات شروع ہوئی تھی اس ادھورے جملے سے کہ اس اللہ کے نام سے اس کے بعد ہم عرض کرتے رہے تھے کس اللہ کے نام سے وہ جو ہماری ابتدا بھی ہے ہماری انتہا بھی ہے۔ وہ جو یہاں بھی رحمت کرتا ہے وہاں بھی رحم کرتا ہے اس تشریح کے بعد اب جملہ مکمل ہوا۔ کہ اللہ وہ جو ایسا ہے، اس کے ایسے ہونے کا لازمی تقاضہ ہے کہ اب اطاعت ہو تو اسی کی ہو، حکم تسلیم ہو تو اسی کا ہو، عبادت ہو تو اسی کی ہو، اور جب اس کی اطاعت کریں گے، اس کے فرمان پر عمل کریں گے، تو اس عمل کے راستے میں کوئی دشواری آئے تو اس کو دور کرنا بھی اسی کا کام ہوگا چنانچہ وہی مدد کرے گا اور ہم اسی سے مدد مانگیں گے۔

جب وہ مسلسل رحمتوں سے نواز رہا ہے۔ اپنی عطا سے مالا مال کر رہا ہے تو اب اس کی کسی اور مدد کی کیا ضرورت؟ اب اس سے کس بات کی استعانت مانگی جائے۔ تو یہ مدد اس لئے نہیں کہ پہلے عطا میں کمی تھی بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ وہ تو سب کو عطا کر رہا تھا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سمجھ لیں کہ جب وہ نافرمانوں کو بھی دیتا ہے تو فرماں برداری کا کیا فائدہ چنانچہ اب ہم نے وضاحت کی کہ استعانت کس معاملے میں چاہیئے۔ پروردگار! ہمیں سیدھے راستے پر رکھنا کہیں ہر خاص و عام پر تیری رحمتوں کی بارش دیکھ کر ہم نافرمانوں میں نہ شامل ہو جائیں، بھٹک نہ جائیں تو اے اللہ ہمیں گمراہ ہونے سے بچا لینا۔ ہمیں تیری بے پناہ رحمت گستاخ نہ بنا دے۔ بے راہ رو نہ کر دے۔ حق کے راستے سے ہٹا نہ دے۔

اور جب صراطِ مستقیم پر ثبات قدم کی دعا مانگی تو یہ نہیں کہ موضوع بدل گیا، کلام کا ربط ٹوٹ گیا، چنانچہ فوراً کہا: وہی صراط مستقیم جس پر چلنے والوں پر تیری نعمتیں نازل ہوئیں، جس راستے کے راہ رو تیرے انعام کے مستحق قرار پائے، ان لوگوں کی راہ نہیں

جن پر تیرا غضب نازل ہوا۔ یہ کون سی نعمتیں ہیں؟ یہ کون سا غضب ہے؟ ... دنیا میں تو سب ہی انعمت علیہم ہیں۔ سب کو نعمتیں عطا ہو رہی ہیں۔ تو یہ صاحب انعام کون ہیں؟ وہ جو صراط مستقیم پر چلنے کے نتیجہ میں نعمتیں پاتے ہیں۔ یعنی حقیقی صاحب انعام وہ ہیں کہ یہاں جب رحمتیں عام تھیں، سب کو ملتی تھیں تو یہاں کی رحمتیں بھی سمیٹتے تھے۔ لیکن جب روز حساب حق کی بنیاد پر نعمتیں عطا ہوئیں تو بھی وہ انعام کے مستحق ہوئے۔ ہمیں بھی اسی راستے پر چلانا جس پر بندہ چل کر تیرے انعام کا حقدار ہو جاتا ہے اور اس راستے پر نہ چلانا جس پر چلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیری رحمتوں کے حقدار نہ رہیں۔ یعنی بسم اللہ میں جو رحمان اور رحیم کہا تھا، آخری آیت تک اسی کا تسلسل ہے کہ اے اللہ ہم پر رحمان بن کر بھی رحمتیں نازل فرما، اور رحیم بن کر بھی رحمتوں کا حقدار بنا۔ اس دنیا میں بھی نعمتیں عطا فرما آخرت میں بھی انعام سے سرفراز فرما۔

گویا ذرا سی توجہ نے یہ بتایا کہ پوری سورۂ حمد، اس کی تمام آیات، تمام الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ نہ ترتیب بدلی جا سکتی ہے، نہ کمی کی جا سکتی ہے، نہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ بس یہی صورت حال پورے قرآن مجید کی ہے۔ پورا قرآن مربوط اور مسلسل ہے۔

قرآن مجید میں بعض مقامات کا ربط واضح نہیں

غرض قرآن مجید مختلف موضوعات پر کہی گئی بہت سی باتوں کا مجموعہ ہے لیکن یہ الگ الگ موتیوں کا ڈھیر نہیں بلکہ ایک دھاگے میں پرویا ہوا ہار ہے۔ یہ وہ تسبیح ہے جس کا ہر دانہ الگ بھی ہے اور ایک تار، ایک رشتے سے ایک دوسرے سے منسلک بھی ہے لیکن کہیں کہیں۔ کبھی کبھی یہ رشتہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے ایسا

محسوس ہوتا ہے گویا ایک جملہ، ایک بات اس طرح اچانک کہہ دی گئی ہے جیسے وہ اس جگہ سے مناسبت نہیں رکھتی۔ خاص طور پر کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں اہل بیتؑ رسولؐ کی مدح کی گئی ہے یا ان کے کسی خاص حق کا تذکرہ کیا گیا ہے ایسے کچھ مقامات ہر آیت کا، سیاق و سباق ان کا CONTEXT ان آیات کے ساتھ بظاہر ربط نہیں رکھتا۔ ایسے دو مقامات کا حوالہ دے دوں۔ تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی۔ اس وقت تمہیداً اس طرف توجہ دلا دوں۔

ایک اہم مقام تو وہ ہے جہاں آیت تطہیر ہے۔ سورہ احزاب، قرآن مجید کا ۳۳ واں سورہ ہے۔ اس کی آیات ۲۸ سے ۳۴ تک، مسلسل سات آیات میں ازواج رسولؐ سے گفتگو ہے۔ گفتگو کا رخ یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ ازواج رسولؐ اپنی اصلاح کریں۔ اپنی بعض خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کریں۔ آیات کا لب ولہجہ ہی سخت ہے۔ آغاز کلام ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ اے حبیبؐ اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں دنیا کی زیب و زینت عزیز ہے تو تمہیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جائے گا۔ پھر سمجھایا گیا کہ تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تمہیں اللہ نے اپنے حبیبؐ سے وابستہ کر کے بہت بڑا مقام دیا ہے۔ اس مقام کا تقاضا ہے کہ تم میں زمانۂ جاہلیت کی برائیاں نہ رہیں۔ تمہارا لب ولہجہ پر وقار ہو۔ تم کوئی گناہ کرو گی تو دوگنی سزا ملے گی۔ غرض ۲۸ سے ۳۲ ویں آیت تک نصیحتیں ہیں، دعوت اصلاح ہے، غلطیوں پر ٹوکنا ہے۔ پھر ۳۳ ویں آیت شروع ہوئی یہاں بھی وہی سلسلۂ کلام جاری ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے گھروں میں بیٹھو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ یہاں پہنچ کر کوئی نئی آیت نہیں بلکہ اسی ۳۳ ویں آیت میں ازواج رسولؐ سے گفتگو کرتے ہوئے ایک جملہ آیا کہ ''اے اہل بیتؑ رسولؐ! یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ ہر برائی کو تم سے دور رکھے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھا ہے جیسے پاک رکھنے کا حق ہے۔'' اس جملے کے بعد پھر چونتیسویں آیت

شروع ہوئی تو وہی پہلی گفتگو کہ اے ازواج رسول تمہارے گھر میں جو آیت کی تلاوت کی جاتی ہے اسے یاد رکھو۔ اب دشواری یہ ہے کہ ایک طرف تو ازواج کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ ان کو اصلاح احوال کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس گفتگو کے دوران اہل بیتؑ کے لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ کوئی برائی ان کے قریب آ ہی نہیں سکتی اور یہ تو ایسے پاک ہیں جیسے کوئی کامل طور پر پاک ہو سکتا ہے۔ اب اگر یہ خامیاں ان میں نہیں تھیں تب بھی آیات بتا رہی ہیں کہ ان میں ان برائیوں کے ہونے کا امکان موجود ہے۔ دوسری طرف اللہ خود اپنی ضمانت دے رہا ہے کہ جن کا تذکرہ ہے ان تک برائی پہنچ ہی نہیں سکتی اور وہ تو ہر عیب سے پاک ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتی اور اگر یہ کہا جائے کہ ازواج اور ہیں اور اہل بیتؑ رسول اور ہیں، تو سوال یہ ہے کہ دو مختلف کرداروں کو ایک تذکرے میں کیسے جمع کر دیا گیا۔ ازواج کی بات میں اہلبیتؑ کے بیان کو کیسے شامل کر دیا گیا۔ یہ بے ربطی کیوں ہے۔

یہ تو تھا ایک مقام۔ اب ذرا ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے۔ سورۂ مائدہ قرآن مجید کی چوتھی سورہ ہے۔ اس کی پانچویں آیت بہت مشہور و معروف ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾۔

آج کے دن، آج کے خاص دن ہم نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور آج ہی تم پر اپنی نعمتوں کی آخری قسط بھی عطا کر دی اور اللہ نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین کے منتخب کر لیا۔ بڑے معرکۃ الآرا اعلانات ہیں۔ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی عید، بہت خوشی کا موقع ہے لیکن ذرا اس آیت کا مقام دیکھیے۔ اس آیت سے پہلے ایک بڑی تفصیلی آیت ہے۔ اس میں گیارہ قسم کے گوشت بتائے گئے ہیں۔ جنہیں شریعت نے حرام قرار

دیا۔ مردار حرام ہے، جانوروں کی باہمی لڑائی میں اگر کوئی جانور مر جائے تو حرام ہے، بلندی سے گر کر مر جائے تو حرام ہے، جس پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو حرام ہے، وہ جو بتوں پر چڑھاوا چڑھایا جائے حرام ہے، وہ جو جوئے کے تیر چلا کر مارا جائے حرام ہے۔ غرض عرض کیا کہ گیارہ قسم کے جانوروں کا گوشت حرام قرار دیئے جانے کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ آج کے دن کافر اس بات سے مایوس ہو چکے ہیں کہ اسلام کو تباہ کیا جا سکتا ہے اور آج کے دن دین مکمل ہو گیا ہے۔ آج نعمتیں تمام ہوگئی ہیں اور آج اللہ نے اسلام کو قیامت تک کے لئے انسانیت کا دین قرار دے دیا ہے۔ اب حلال و حرام کے ایک عام مسئلے کے ساتھ اتنے اعلانات کا ہونا بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ کیا گوشت کی کچھ قسموں کو حرام کر دینے کے نتیجہ میں اسلام کو دنیا کے تمام مذاہب پر ترجیح مل جائے گی۔ کیا ان فقہی فتوؤں سے اسلام واحد مکمل دین ہو جائے گا۔ اور پھر خاص طور پر الیوم، آج کے خاص دن کا تذکرہ اور بھی حیران کن ہے۔ یعنی حرام گوشت کی فہرست بنانے سے اس دن کو خصوصیت حاصل ہوگئی۔ اس قسم کا اعلان تو ظاہر کرتا ہے کہ جس دن آیت اتری ہے اس روز میں کوئی بہت بڑا، بہت عظیم واقعہ رونما ہوا ہے۔ اتنا عظیم کہ اس واقعہ کی وجہ سے اسلام کو تمام مذاہب پر ترجیح حاصل ہوگئی۔ اتنا بڑا واقعہ کہ جس سے اسلام کو فوقیت حاصل ہوگئی..... یہ کوئی ایسا واقعہ ہے کہ اس کی مثال دوسرے مذاہب میں نہیں تھی کیونکہ دین تو سب اللہ کی طرف سے تھے۔ اب اگر کسی دین کو مکمل اور دوسروں کو نامکمل کہا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اضافی صفت ایسی پیدا ہوگئی ہے جس نے اس دین کا مقام دوسرے ادیان سے بلند کر دیا ہے۔ اور یہ صفت صرف یہ نہیں ہو سکتی کہ آج کے دن گوشت کی کچھ قسموں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور میں یہ بھی عرض کروں گا کہ جب گوشت کا تذکرہ کیا گیا تو وہ بھی اس انداز

سے کہ صرف یہ بتایا گیا کہ خبردار فلاں گوشت نہ کھانا اور فلاں نہ کھانا۔ اگر گیارہ اقسام کے گوشت کو حرام قرار دینے کی بجائے دس بارہ قسمیں حلال گوشت کی بتائی جاتیں اور اس کے بعد کہا جاتا کہ آج ہم نے اپنی نعمتیں تمام کر دیں تو شاید گوشت سے رغبت رکھنے والے لوگوں کے لئے یہ اطلاع خوشخبری ہوتی اور اس حوالے سے ہم سمجھتے کہ آج اتمام نعمت کا اعلان کیا گیا ہے، یہاں تو عالم یہ ہے کہ جیسے جیسے آیت آگے بڑھتی جا رہی ہے، ویسے ویسے مسلمان کے دسترخوان سے ایک ڈش اٹھتی جا رہی ہے اور جب گیارہ قسم کے گوشت اٹھا دیئے گئے تو کہا گیا: ہم نے تم پر نعمتوں کی مکمل بارش کر دی ہے۔

غرض یہاں بھی یہی مسئلہ ہے کہ آیۂ تکمیل دین کے عظیم الشان اعلانات میں اور گوشت کی بعض اقسام کے حرام ہونے میں کوئی ظاہری ربط نظر نہیں آتا۔

اس الجھن کا بعض لوگوں نے یہ حل نکالا کہ درحقیقت ان آیات کا اصل مقام کوئی اور تھا۔ انہیں کسی دوسری سورہ میں یا اسی سورہ میں کسی اور مقام پر رکھا گیا تھا لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی ایک جماعت نے قرآن مجید جمع کیا تو ان کو اپنی جگہ سے ہٹا کر ان جگہوں پر رکھ دیا جہاں وہ آج ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے خیال کی تائید میں یہ دلیل دی کہ یہ بے ربطی وہاں نظر آ رہی ہے جہاں کوئی آیت مدح اہل بیتؑ میں ہے۔ اور چونکہ بعض لوگوں کو اہل بیتؑ کی کسی صفت اور کسی حق کے تذکرے سے سیاسی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لئے ان مخصوص آیات کی حد تک کچھ الٹ پھیر ضرور کیا گیا ہے، اور جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔

ترتیب آیت میں بندوں کا دخل نہیں

اب اس بظاہر بے ربطی کا یہ جواز قابل قبول ہو سکتا ہے یا نہیں، یا اس خیال میں

کتنا وزن ہے اس پر کچھ کہنے سے پہلے، اسی مقام پر یہ واضح کر دوں کہ آج سے جو سلسلۂ گفتگو شروع ہو رہا ہے اس کا موضوع ایسی ہی آیات، بلکہ صرف یہ دو آیات یعنی آیۂ تطہیر اور آیۂ تکمیل دین کے سیاق و سباق کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔ میں صرف اس Context کو سمجھنا چاہتا ہوں، جن میں آیات بیان ہوئی ہیں۔

اور یہ کوشش اسی وقت ہونی چاہیئے جب یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کی آیات میں ربط ہونا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ مانتے ہوں کہ قرآن کی ترتیب میں بھی کسی مسلمان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہی تسلیم شدہ نہیں تو پھر کوئی بات، کوئی آیت کہیں بھی ہو سکتی ہے، پھر تو کسی بحث کی نہ تو گنجائش رہتی ہے اور نہ ضرورت، جو آیت جہاں ہو وہیں اس کا مطلب نکالیئے اور مطلب نہ نکلے تو صبر کیجیے۔ ظاہر ہے کہ ہم یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتے چنانچہ تمہید کے اس مرحلہ پر سب سے پہلے اس خیال پر گفتگو کر لی جائے کہ کسی نے فقط شانِ اہلبیتؑ کو کم کرنے کے لئے یا ان کے اصل مقام کو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے ان آیات کو ایسی جگہ رکھ دیا ہے جس سے غلط فہمی ہو سکے۔

تو اس سلسلہ میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ اس خیال کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کو کتاب بنانے کا کام خدا اور اس کے رسولؐ نے نہیں کیا بلکہ یہ کام بعد کے مسلمانوں نے کیا ہے، اور گزشتہ پورے عشرے کی گفتگو میں ہم قرآن، تاریخ اور عقلی بنیادوں پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کو جمع کرنے کا کام، اسے ایک مکمل کتاب کی صورت دینے کا کام خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں مکمل ہوا۔ تو ایسی صورت میں یہ امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بااختیار کیوں نہ ہو وہ خدا اور رسولؐ کی منشاء کے خلاف کسی آیت کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ سکے۔

اور پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ کہنے والوں کے مطابق مقام آیت اس لئے بدلا گیا کہ اہل بیتؑ کی عظمت پر پردہ ڈالا جا سکے یا آیۂ تکمیل کو خم غدیر کے واقعہ سے الگ کیا جا سکے۔ تو میں سوال کروں گا کہ جن لوگوں نے جس خطرے کے پیش نظر ان آیات کو ان کے اصل مقام سے ہٹا کر غیر موزوں جگہ رکھ دیا، آخر انہوں نے ایسی زحمت ہی کیوں کی۔ اگر ان کا قرآن پر اتنا ہی بس چلتا تھا تو وہ، اپنے خیال میں، اپنے مفادات کے لئے خطرناک نظر آنے والی ان آیتوں کو قرآن سے بالکل ہٹا دیتے۔ اگر کوئی شخص کسی آیت کو اس کی اصل جگہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا اور اسے کسی نے کچھ نہیں کہا تو اب کیا ضرورت ہے کہ وہ اسے کسی اور جگہ پر رکھے بھی۔ وہ اگر ہٹا سکتا تھا تو یقیناً غائب بھی کر سکتا تھا۔

میں ترتیب آیات کے خدا اور رسولؐ سے ہونے کے بارے میں تفصیلی گفتگو گوش گزار کر چکا ہوں۔ اب تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بحث میں اضافے کے طور پر اتنا مزید عرض کروں گا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ دو آیتیں، یا ان کے علاوہ اور کچھ آیتیں اپنے اصل مقام پر نہیں ہیں، تو یہ نقطۂ نظر ایک ایسا مفروضہ ہوگا جو بہت سی عقلی دشواریوں اور فکری مسائل سے دوچار کر دیتا ہے۔ ایک اصولی بات تو یہی ہے کہ اگر قرآن مجید کی ایک یا دو آیتوں کے متعلق ہم نے یہ سمجھ لیا کہ یہ اپنی اصل جگہ پر نہیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ اور تمام آیتیں اپنے اصل مقام پر ہیں۔ دو آیتوں کی جگہ بدلنے سے اس بات کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ اور مقامات پر بھی ایسا کیا گیا ہوگا اور اگر کسی عبارت میں الفاظ وہی رہیں لیکن کہنے والے نے جہاں جو لفظ استعمال کیا تھا وہاں سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دیا جائے تو ایسی صورت میں عبارت کا مفہوم بدل جائے گا۔ دنیا کی کوئی عبارت ہو یا کسی جملے کے الفاظ ہوں، اگر ان کے الفاظ اور جملوں کی جگہ بدلنے کی اجازت مل

جائے تو ہر عبارت اور ہر جملے سے ایسے معنی حاصل کیئے جا سکتے ہیں جو کہنے والے کی منشاء کے بالکل برعکس ہوں۔

ایک عبارت کے ایک جملے کو، اس عبارت سے نکال کر کسی بالکل دوسری جگہ رکھ دینا تو بڑی بات ہے، اگر دو جملوں میں پہلے کہی ہوئی بات کو بعد میں رکھ دیا جائے اور بعد میں کہی جانے والی بات پہلے آ جائے، تب بھی معنی سلامت نہیں رہتے۔ والد محترم نے دیکھا نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ بیٹے نے نماز نہیں پڑھی۔ ادھر دسترخوان پر کھانا لگ چکا ہے۔ بیٹا کھانا شروع کرنا چاہتا ہے۔ والد نے کہا: ''بیٹا پہلے نماز پڑھو، پھر کھانا کھاؤ''۔ ہم نے ایک لفظ بدلے بغیر صرف یہ کہا کہ ''پہلے'' کے بعد دوسرے جزو کو لگا دیا اور ''پھر'' کے بعد پہلے جزو کو، جملہ ہو گیا ''پہلے کھانا کھاؤ پھر نماز پڑھو'' کوئی لفظ نہیں بدلا لیکن بات کا تقاضہ، حکم کا مقصد بالکل الٹ گیا۔

الفاظ یا جملے بدلنے سے اگر کسی وقت معنی نہ بدلیں تب بھی کم سے کم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بدلا ہوا قول، کہنے والے کا قول نہیں رہتا۔ میں اگر کہوں کہ مؤمن خان مؤمن نے کہا ہے: ''ہم تو کل خواب عدم میں ہوں گے، شب ہجراں تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے''۔ یقین کیجیے الفاظ کے اس طرح ادا کرنے سے مؤمن کے اصل شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہر صاحب ذوق کہے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے۔ یہ شعر ہی نہیں، مؤمن کا کلام ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ ایک شعر شاعر کا کلام تب ہی ہوگا جب اسے اس ترتیب سے پڑھا جائے جو ترتیب شاعر نے دی ہے۔ تو اب اگر ایک شاعر کے کلام کی ترتیب بدل جائے تو وہ کلام شاعر نہیں رہتا، تو اللہ کے کلام کی ترتیب بدل دی جائے تو وہ اللہ کا کلام کیسے رہے گا۔

اور خصوصیت سے جب صورت حال یہ ہو کہ کچھ آیات اپنے اصل سے

دوسرے مقام پر نہ صرف اس لئے منتقل کی گئی ہوں کہ آیات کا حقیقی مفہوم نہ معلوم ہو سکے، یعنی قرآن کے الفاظ کے وہ معنی نہ نکل سکیں جو اللہ تعالیٰ بیان کر رہا ہے، تو اس نیت سے کی گئی ہر تبدیلی، خواہ کامیاب ہو یا ناکام، قرآن مجید میں کھلی ہوئی تحریف ہوگی۔ اور ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ قرآن ہر تحریف سے پاک ہے۔ تو اس مفروضے کو کیسے مانا جا سکتا ہے کہ یہ آیتیں اپنے اصل مقام سے ہٹا دی گئی ہیں۔

ترتیبِ آیات کے متعلق معصومینؑ کا طرزِ عمل

اور پھر مسلکِ جعفریہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے، ہمارے لئے دوسرے کسی مسلمان کے مقابلے میں، یہ ماننا بہت دشوار ہے کہ قرآن مجید کی ایک دو یا دس بیس آیتیں اپنے حقیقی مقام سے ہٹا دی گئی ہیں۔ ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم ائمہ اطہار علیہم السلام کے ہر قول و عمل کو حجت سمجھنے کے ساتھ ساتھ، اس بات کو بھی حجت سمجھیں جسے فقہ کی اصطلاح میں تقریرِ معصومؑ کہا جاتا ہے۔ یہاں تقریر کا مطلب گفتگو نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس لفظ کے معنی خاموشی ہیں۔ لفظ تقریر کے وہ معنی جو ہم لیتے ہیں وہ درحقیقت اس لفظ کے اصطلاحی معنی ہیں۔ تقریر کے لغوی معنی ہیں قرار پکڑنا، ٹھہر جانا، رک جانا ہے۔ غالباً خطیب جو منبر پر آ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی گفتگو کو تقریر کہا جاتا ہے۔ فقہ میں جب یہ لفظ معصومؑ کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب، کسی بات پر معصومؑ کا خاموش رہنا مراد ہوتا ہے یعنی کسی صورت حال میں ردِعمل کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کوئی صورت حال پیدا ہوئی ہیں اس میں معصومؑ نے کوئی کام کیا۔ کوئی عمل کیا۔ یہ مثل فعل معصومؑ ہے اور فعل معصومؑ حجت ہوگا۔ سند ہوگا۔ Precedent ہوگا۔ اسی طرح اگر امامؑ نے کسی مرحلے پر کسی بات کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا تو یہ ارشاد قولِ معصومؑ ہوگا۔ یہ بھی حجت ہوگا

لیکن اگر صورت حال یہ ہو کہ کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کریں نہ اسے درست کہیں نہ غلط کہیں، بلکہ خاموش رہیں تو یہ خاموشی بھی حجت ہوگی یعنی عمل کی اس صورت کو درست سمجھا جائے گا۔

اس خاموشی کو تقریر معصومؑ کہیں گے۔ تقریر معصومؑ کو حجت سمجھنے کی منطق یہ ہے کہ ان کا فریضہ ہدایت کرنا ہے۔ لوگوں کو حق سے آگاہ کرنا ہے چنانچہ جب کبھی غلط بات ہو خدا اور رسولؐ کی منشاء کے خلاف کوئی بات کی جائے اور معصومؑ اس کے شاہد ہوں۔ اسے دیکھ رہے ہوں۔ تو ان پر واجب ہے کہ غلطی کی اصلاح فرمائیں۔ اب اگر وہ کچھ نہیں فرماتے تو یہ تقریر، یہ خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اسی صورت میں درست تھا۔ صحیح تھا۔

اب آیئے اصل مسئلے کی طرف۔ ہمارے سامنے یہ ارشاد رسالتؐ ہے کہ قرآن اور اہل بیتؑ ساتھ ساتھ ہیں اور یہ دونوں حوض کوثر تک ساتھ ہی رہیں گے۔ تو اب یہ ساتھ رہنا کیا معنی؟ یہ ساتھ، یہ ہمراہی ایسی نہیں جیسے ٹرین کے دو مسافر ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ ایسا ساتھ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تفسیر ہیں۔ ایک دوسرے کے مددگار رہیں۔ ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔ اگر قرآن سمجھ میں نہ آئے تو اہل بیتؑ سے پوچھو۔ اگر کسی جگہ اہل بیتؑ کا طرزِ عمل سمجھ میں نہ آئے تو قرآن سے پوچھو۔ اگر اقوال قرآن پر کسی طرف سے حملہ ہو تو قرآن کا دفاع اہل بیتؑ کریں گے اور اہل بیتؑ کے کردار پر کسی نے انگلی اٹھائی تو ان کا دفاع قرآن کرے گا۔ ان دونوں کا ساتھ اس لئے رکھا گیا کہ دنیا قرآن کو لاوارث نہ سمجھ لے، بے سہارا نہ سمجھ لے، اسے توریت اور انجیل کی طرح خواہشات کا کھلونا نہ بنا لے۔ چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ قرآن مجید میں کوئی شخص آیتوں کو ادھر ادھر کرے اور امام وقتؑ خاموش رہے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ وہ قرآن میں مرضیٔ رسولؐ کے خلاف ذرہ برابر بھی تبدیلی لائے

اور معصومؑ خاموش رہ جائیں اور معصومؑ بھی کون؟ علیؑ ابن ابی طالبؑ۔ وہ علی علیہ السلام جو قرآن کی کتابت، اس کی نشر و اشاعت کو اس قدر ضروری سمجھیں کہ بعد رسولؐ ساری دنیا سے منہ موڑ کر، سیاست و اقتدار سے لاتعلق ہو کر، گھر میں اس لئے بیٹھ جائیں کہ قرآن کی تفسیر جمع کر دی جائے۔ قرآن کی نقلیں تیار کر دی جائیں۔ قرآن کی نشر و اشاعت کی جائے۔ میں نے گزشتہ تقریر میں عرض کیا تھا کہ آج، چودہ سو سال بعد بھی، دنیا میں کم از کم پندرہ قرآن ہیں جو علی علیہ السلام کے ہاتھ سے لکھے ہوئے بتائے جاتے ہیں۔ دنیا نے قرآن کی اشاعت بہت بعد میں کی۔ اس کی کتابت بہت دیر سے شروع کی۔ علی علیہ السلام قرآن کے پہلے کاتب ہیں اور پہلے پبلشر ہیں۔ اب خود فیصلہ کر لے دنیا کہ علی علیہ السلام نے دنیا کو یہ موقع ہی کب دیا کہ وہ قرآن کے ساتھ من مانی کر سکیں دنیا تو وہی قرآن پڑھتی ہے جسے علی علیہ السلام نے لکھا تھا۔

اور یہاں قرآن کی علی علیہ السلام سے وابستگی سے ایک اور ضمنی نتیجہ سامنے آیا۔ اس صورت حال نے ہمیں اسلام کی اصل ترجیحات کو سمجھنے میں مدد دی۔ بعد رسولؐ اہل دنیا کا پہلا کام تھا کہ سلطنت مدینہ کا انتظام سنبھال لیا جائے۔ حکومت کے ادارے کو مستحکم کر دیا جائے۔ بعد رسولؐ علیؑ کا پہلا کام تھا کہ قرآن کا مصدقہ نسخہ تیار کر کے اس کی نشر و اشاعت کر دی جائے، قرآن کو ہر رد و بدل کے امکان سے محفوظ کر دیا جائے چنانچہ علی علیہ السلام کے طرزِ عمل سے پتہ چلا کہ اسلام کا پہلا اور بنیادی کام اللہ کے کلام کی حفاظت اور ان کی ترویج تھی۔ علی علیہ السلام نے بتایا کہ اگر تعلیماتِ اسلام سلامت رہیں تو اسلامی سلطنت آج نہیں تو کل قائم ہو جائے گی لیکن اگر سلطنت قائم ہوگی اور قرآن نہ بچایا گیا تو حکومت تو ہوگی اسلام نہیں رہے گا۔

غرض علی علیہ السلام کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن موجود ہیں۔ علی علیہ السلام کے بعد

بھی ہر معصومؑ قرآن ہی پڑھتا رہا۔ اسی قرآن کے مطالب اور معنی بیان کرتا رہا۔ اب ان آئمہؑ نے قرآن کی ہر سورہ کی تلاوت اسی طرح کی جس طرح آج قرآن میں وہ سورہ ہے۔ اسی طرح کتابت کی جیسے آج قرآن لکھا جاتا ہے تو یہ قول معصومؑ ہے، فعل معصومؑ ہے اور کبھی کسی امامؑ کا کوئی قول نقل نہیں ہوا کہ انہوں نے کہا ہو کہ آیۂ تطہیر غلط جگہ پر ہے یا آیۂ تکمیل دین کسی اور جگہ ہونی چاہیے۔ آئمہ کا طرزِ عمل موجودہ قرآن پر ''تقریرِ معصومؑ'' ہے۔ اب فقہ کے ہر اصول نے ہمیں پابند کر دیا کہ ہم ان آیات کو، جس جگہ ہیں، اسی جگہ پر ہونے کو، منشائے الٰہی سمجھیں۔ دنیا قرآن کی موجودہ ترتیب کے متعلق جو کچھ بھی سمجھے، ائمہ اہل بیتؑ کو حجت اور نص سمجھتے ہوئے ملت جعفریہ کے کسی فرد کے لئے گنجائش ہی نہیں ہے کہ وہ کسی ایک آیت کو بھی اپنے حقیقی مقام سے ہٹا ہوا سمجھے۔

آیات کی موجودہ ترتیب اور ہماری ذمہ داریاں

تو اب ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ سورۂ مائدہ ہو یا سورۂ احزاب اور ان میں آیۂ تکمیل دین ہو یا آیۂ تطہیر۔ تمام آیتیں اور تمام سورتیں اسی جگہ ہیں جہاں ان کو ہونا چاہیے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کہ قرآن الگ الگ جملوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ہر آیت ایک مسلسل عبارت کا حصہ ہے۔ تو اب اگر کسی آیت کو اس کے سیاق و سباق میں سمجھنا دشوار ہو تو یہ ہمارا فریضہ ہے، ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور یہ دیکھیں کہ جہاں کوئی آیت ہے وہاں ہونے کی مصلحت کیا ہے۔ اگر ازواج کے تذکرے میں آیۂ تطہیر نظر آتی ہے تو ایسا کیوں ہے اور اگر گوشت کے حرام و حلال ہونے کی بحث میں دین کے مکمل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس سے کون سی مصلحت پوری ہوتی ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم قرآن کی منشاء کو سمجھیں یہ نہیں کہ اپنی سمجھ کی کمی کے نتیجہ میں قرآن ہی کو

اعتراضات کا نشانہ بنالیں۔

یہ تو ہر صاحب عقل وفہم تسلیم کرے گا کہ یہ ممکن نہیں کہ کسی صاحب حکمت کا کلام سنتے ہی فوراً مکمل طور پر سمجھ میں آ جائے گا۔قرآن مجید تو کلام الٰہی ہے۔اس دانا و بینا کا کلام ہے جو عین حکمت ہے۔جس کا کوئی قول،کوئی عمل مصلحت سے خالی نہیں ہے۔وہ جو کچھ ارشاد فرماتا ہے اس کے فرمان کے معنی اور مصداق کو سمجھنے کے لئے صرف الفاظ کا ترجمہ کر لینا کافی نہیں ہوگا بلکہ دیکھنا ہوگا کہ کوئی بات کب کہی گئی،کس جگہ کہی گئی،سیاق و سباق کیا ہے۔قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ فقط میری تلاوت کر لینا کافی نہیں۔اس کتاب پر غور کرو،تدبر کرو،فکر کرو۔یہ سب اسی لئے ہے کہ قرآن کی کوئی آیت،کوئی جملہ سنتے ہی فوراً نتیجہ نہ نکال لیا جائے۔بلکہ دیکھا جائے کہ جو کچھ جن الفاظ میں کہا گیا ہے ان لفظوں کے انتخاب کا سبب کیا ہے۔پھر یہ لفظ کس جگہ استعمال ہوئے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن ایک کُل ہے۔ایک وحدت ہے۔یہ اور بات کہ ہم نے اپنی سہولت کے لئے اسے تیس پاروں میں تقسیم کرلیا ہے۔ان پاروں میں ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ان سورتوں میں چھ ہزار سے زائد آیتیں ہیں۔ان آیتوں میں بہت سے جملے ہیں لیکن ان سب اجزاء کے ساتھ قرآن ایک کتاب ہے اور جملے آیتوں سے،آیتیں سورتوں سے،اور سورتیں پوری کتاب سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ایسے کلام کو اپنے سیاق و سباق سے الگ کرکے نہ سمجھیے بلکہ ایک چھوٹے سے چھوٹا جملہ بھی سمجھنا ہو تو پوری کتاب سامنے رکھ کر سمجھیے۔

ترتیب کی اہمیت اور واقعۂ کربلا

بلکہ جتنی بات عظیم ہوگی،جتنا بڑا واقعہ ہوگا،اس کی عظمت اور بڑائی کا تقاضا ہوگا کہ اس کے اجزاء کو پورے پس منظر سے الگ کرکے نہ دیکھا جائے بلکہ ہر جزو کو کُل سے

حو ے سے دیکھا جائے۔ یہ تو خدا کا کلام ہے، عام انسانوں کا روزمرہ عمل دیکھیے گا تو محض اجزاء کو الگ الگ کر کے دیکھنے میں عمل کا ہر جزو بے معنی ہو جائے گا۔ ایک کسان اپنا ہل لئے، ہموار زمین کو کھود کر غیر ہموار کر دیتا ہے۔ پھر خود ناہموار زمین کو دوبارہ ہموار کرتا ہے۔ پھر بیج زمین میں بکھیر دیتا ہے، پھر جب بیج سے پودے پھوٹتے ہیں تو وہ رات دن ایک کر کے ان کی پرورش کرتا ہے، حفاظت کرتا ہے، پھر ایک دن خود ہی ہاتھ میں درانتی لے کر پوری فصل کاٹ دیتا ہے۔ اب عمل کا ہر جزو الگ الگ دیکھیے تو کوئی بات قابل فہم نہیں۔ ہموار زمین کو ناہموار کرنا تو کوئی مناسب عمل نہیں، پھر خود ہی بگاڑ پیدا کر کے پھر سنوارنے کی کیا مصلحت ہے، اور جب وہ بیج پھینک رہا تھا تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو ضائع کرنا ہوا سے خاک میں ملا دیا جاتا ہے۔ کسان بیج خاک میں ملا رہا ہے، اس عمل کی کیا تعبیر کی جائے۔ جب پودے نکلے تو ان کی حفاظت کیوں۔ یہ کیا کہ کھیت میں کچھ پودوں کو تو پروان چڑھا رہا ہے۔ کچھ اور پودے نکل آئے تھے ان کو اکھاڑتا بھی جاتا ہے۔ اسی کھیت کے ایک پودے کی حفاظت کیوں اور جسے اکھاڑا ہے اس کو اکھاڑ پھینکنے کی ضرورت کیوں ..... اور پھر شب و روز محنت کر کے جن پودوں کو پروان چڑھایا تھا ان کو کاٹ کیوں رہا ہے ..... غرض عمل کے سارے جزو الگ الگ نہ سمجھ آنے والے ہیں، ہر حصہ عمل غیر واضح ہے۔ لیکن جب سارے عمل کے تمام اجزاء کو ایک دوسرے سے ربط دیں گے تو ہر قدم ضروری نظر آئے گا۔ جب نتیجہ کو سامنے رکھیں گے تو ہر جزو بامعنی بھی ہو جائے گا۔ واضح بھی ہو جائے گا۔

اجزاء کو ان کے کل سے الگ کریں گے تو قدم قدم پر سوالات ہی سوالات ہوں گے اور ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ یہ سوالات ویسے ہی ہوں گے جیسے مدینہ سے نکلتے ہوئے، پھر مکہ سے سفر کرتے ہوئے، پھر دوران سفر، بہت سے لوگ حسین علیہ السلام سے

سوال کر رہے تھے۔ کوئی پوچھتا تھا ناناؐ کا شہر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ مکہ تو جائے امن ہے، خانۂ خدا کی پناہ سے باہر کیوں جا رہے ہیں؟ حج کیوں نہیں کرتے؟ احرام حج کو عمرہ سے کیوں بدل دیا ہے؟ ناموزوں موسم میں کیوں سفر کر رہے ہیں؟ اپنے ہمراہ عورتوں کو کیوں لیا ہے؟ کم سن بچے کیوں شریک سفر ہیں؟ عراق والے تو وعدہ خلافی کی طویل تاریخ رکھتے ہیں، ان پر کیوں اعتماد کر رہے ہیں۔ غرض سوال ہی سوال تھے اور سوالات کی وجہ صرف یہ تھی کہ سوال کرنے والوں کی نظر صرف اجزاء پر تھی۔ حسین علیہ السلام کا پورا عمل نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

یہاں میں پروفیسر کرار حسین صاحب کی دی ہوئی ایک مثال عرض کر دوں۔ ایک مصور یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے فن کا شاہکار تخلیق کرے۔ ایسی تصویر بنائے، جو رہتی دنیا تک اس کے فن کی دلیل ہو۔ اب وہ صفحۂ کاغذ پر کچھ خطوط بناتا ہے۔ کچھ رنگ استعمال کرتا ہے۔ اب کسی کو حق نہیں کہ ابتداء میں ہی سوال شروع کر دے کہ یہ خط ترچھا، اور وہ سیدھا کیوں ہے۔ یہاں سرخ رنگ کیوں استعمال کیا۔ وہاں سبز کیوں لگایا۔ ابھی تصویر بننے دو۔ مکمل ہونے دو۔ پھر دیکھنا کہ ہر چھوٹے بڑے خط کی ضرورت تھی یا نہیں، پھر فیصلہ کرنا کہ جو رنگ، جہاں جہاں استعمال ہوا ہے وہاں اس کی مصلحت تھی یا نہیں۔

حسین علیہ السلام دنیائے کردار و عمل کا شاہکار تخلیق کرنے جا رہے ہیں۔ ابھی نہ پوچھو کہ یہ کیوں ہے اور وہ کیوں نہیں۔ ابھی سوال نہ کرو کہ فاطمہ صغریٰؑ کیوں ساتھ نہیں جا رہی، سکینہؑ کو کیوں ہمراہ لیا ہے۔ ام المؤمنین ام سلمہؓ نہیں جا رہیں، ام البنینؑ نہیں جا رہیں، لیکن زینبؑ جائیں گی۔ ام کلثومؑ جائیں گی۔ بھائی محمد حنفیہ ساتھ نہیں ہوں گے لیکن بھائی عباس علیہ السلام چلیں گے۔ عبداللہ ابن جعفر نہیں جائیں گے۔ عونؑ و محمدؑ ساتھ چلیں گے۔ اور ہاں کوئی جائے یا نہ جائے۔ ربابؑ ضرور ساتھ چلیں گی اور تنہا نہیں، اپنے ہمراہ

چند دنوں کے علی اصغر علیہ السلام کو بھی لے چلیں گی۔ ..... ابھی سوال نہ کرو۔ ابھی اعتراض نہ کرو۔ ذرا شاہکار کربلا بن لینے دو۔ پھر دیکھو علی اصغر علیہ السلام کا ساتھ آنا کتنا ضروری تھا۔ اب دیکھو عباس علیہ السلام کے بغیر داستانِ کربلا کتنی ادھوری ہوتی۔ اب دیکھو کہ سکینہؑ کتنی اہم ہے۔ اب دیکھو کہ زینبؑ و ام کلثومؑ کے بغیر کربلا تاریخ کے صفحات پر تو ہوتا، انسانیت کے دلوں کی دھڑکن نہ بن جاتا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظت قرآن : ۱۳

ترتیبِ آیات

اس سے پہلے ہم یہ عرض کر چکے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا تقاضہ یہ ہے کہ قرآن کی ہر سورہ کی تمام آیتیں اسی ترتیب سے ہوں، جس طرح اللہ کے امین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھی تھیں۔ کیونکہ اگر کسی کلام میں جملوں کی ترتیب بدل دی جائے اور یہ تبدیلی صاحب کلام کی منشاء اور مرضی سے نہ ہو تو عبارت کے معنی کے محفوظ ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی اور ایسی تبدیلی اصل کلام میں تحریف کے مترادف ہوگی۔ چنانچہ اگر یہ مانا جائے کہ قرآن حکیم کی کچھ آیتیں اس جگہ نہیں ہیں، جہاں انہیں اللہ اور رسولؐ کی طرف سے رکھا گیا تھا تو ایسا عقیدہ قرآن حکیم میں تحریف کے مترادف ہوگا۔

ترتیب آیات توقیفی ہے

یہاں ایک طویل جملے کو بار بار کہنے کی بجائے میں ایک اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ ایسی بات جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد اور فرمان کی سند رکھتی ہو، جس طریقے کو خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معین فرمایا ہو اسے دینی اصطلاح میں توقیفی کہا جاتا ہے۔ محترم مجمع کے لئے شاید یہ اصطلاح اجنبی ہو لیکن اس اصطلاح کی اصل جس لفظ

سے ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ یہ اصل وقف کا لفظ ہے اور اس لفظ سے بننے والے کئی اور الفاظ بھی ہماری اردو میں کثرت سے رائج ہیں۔ مثلاً ابھی میں نے وقف کا لفظ استعمال کیا تھا اسی طرح ایک اور لفظ موقف ہے، توقف ہے چونکہ اصل لفظ وقف کے معنی ہیں ٹھہر جانا، رکنا، کھڑا ہونا۔ تو اب اس لفظ سے جتنے اور الفاظ بنتے ہیں اس میں ٹھہرنے اور جم جانے۔ رک جانے کا تصور ہے۔ مثلاً موقف کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ایسی بات جس پر کہنے والا جما ہوا ہے، ٹھہرا ہوا ہے، جسے وہ بدلنے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ توقف کا مفہوم ہے ٹھہرنا، وقفہ دینا۔ اور خود وقفہ کا لفظ، کہ اس کا مطلب ہم سب جانتے ہیں کہ یہ دم لینے کے لئے، رکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے .. ہم جو کہتے ہیں کہ ہم اس بات سے واقف ہیں تو یہ واقف ہونا کسی موضوع یا شخصیت کے لئے وہ علم یا معلومات ہیں جو طے شدہ ہیں جو یقینی ہیں یعنی جب واقفیت کا اظہار کرتے ہیں تو درحقیقت یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ زیرِ بحث بات کے بارے میں ہماری معلومات ایسی ہیں کہ ان میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ وہ غلط نہیں ہیں کہ صحیح بات کا پتہ چلنے کے بعد وہ بدل جائیں۔ اب اس وقف کے لفظ سے توقیفی کی اصطلاح بنی اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ہوئی ہے اور جو بات خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہو اس میں اپنی رائے یا خواہش سے ردوبدل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسی بات پر رک جانا ہے۔ ٹھہر جانا ہے۔ اسی شکل کو تسلیم کرنا ہے جس طرح اللہ کے رسولؐ نے بتایا ہے۔

تو اب ہمارا موقف یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ البتہ یہ جو قرآن کے تیس پارے ہیں یا ہر پارے میں کئی رکوع ہیں۔ یہ تقسیم توقیفی نہیں۔ یہ تو قاری حضرات نے اپنی ضرورت اور سہولت کے تحت کی ہے۔ قرآن مجید کو تقریباً تیس برابر حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ اس تقسیم کے وقت صرف یہ ضرورت پیش نظر تھی کہ کتاب

خدا کی تلاوت ایک ماہ میں مکمل ہو جائے۔ چنانچہ ایک سورہ ایک پارے میں شروع ہوتی ہے تو دوسرے میں ختم ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر ایک سورہ کی فقط ایک آیت ایک پارے میں ہے اور باقی پوری سورہ دوسرے پارے میں۔ قرآن کے سپاروں کی طرح جو رکوع ہیں۔ یہ بھی توقیفی نہیں ہیں۔ یہ بھی اس لئے قرار دیئے گئے ہیں کہ وہ جو نماز کے دوران ختم قرآن کرنا چاہیں وہ چاہے سورہ مکمل ہو یا نہ ہو ایک حصہ قرآن پڑھ کر رکوع میں چلے جائیں چنانچہ چودہ سے سولہ آیات پر مشتمل جز وکو رکوع کہہ دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں جو مختلف طرح کے رموز و اوقاف بنے ہیں یہ جو آیت کے خاتمے پر، یا دورانِ آیت، ایک جملے کے مکمل ہونے پر کہیں 'ط' لکھا ہے کہیں 'لا' لکھا ہے اور کہیں 'ج' وغیرہ ہے۔ یہ سب بھی توقیفی نہیں ہیں۔ یہ علامتیں آیت کے معنی دیکھتے ہوئے مفسرین نے مقرر کی ہیں اور ان کی پابندی کرنا مناسب تو ہے ضروری نہیں بلکہ بعض مقامات پر اگر یہ علامتیں آیت کے مفہوم پر اثر انداز ہونے لگیں تو ان علامات کا خیال رکھنے کی بجائے، ان کا لحاظ نہ کرنا مناسب ہوگا۔

المختصر، قرآن مجید کی آیات کی ترتیب توقیفی ہے اور اس ترتیب کو توقیفی نہ ماننے کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور اگر تحریف کو مان لیا جائے تو اللہ کا یہ اعلان کہ ''ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' ایک بے بنیاد اعلان ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ کردارِ ائمہؑ پر بھی انگلیاں اٹھیں گی کہ اللہ نے جن کو قرآن کا وارث بنایا تھا اور قیامت تک جن کے ساتھ قرآن کو وابستہ کر دیا گیا تھا، وہ نعوذ باللہ اپنے فرض سے غافل ہو گئے، یا وہ فرض کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور نہ کر سکے اور ان میں سے کوئی صورت قابلِ قبول نہیں۔ نہ اللہ کا وعدہ غلط ہے نہ خدا کے بنائے ہوئے وارثانِ قرآن، حفاظتِ قرآن سے غفلت برت سکتے تھے۔

بات کو آگے بڑھانے سے پہلے، اتنا عرض کر دوں کہ ابھی تک ترتیب آیات کے توقیفی ہونے کے بارے میں، میں نے جو کچھ عرض کیا۔ اس کی بنیادیں عقلی ہیں یعنی یہ عقل کہتی ہے کہ وہ کلام جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے، اس کے اجزاء اسی ترتیب سے ہونے چاہئیں جس ترتیب سے خدا نے چاہا اور اس کے رسولؐ نے بیان کیا۔ لیکن بات کو مکمل کر دوں یہ عرض کر کے کہ ایک نظر یہ بھی دیکھ لیں کہ خود قرآن حکیم اپنی ترتیب آیات کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے۔

ترتیب آیات کے متعلق قرآنی ارشاد

میں اپنے گزشتہ ایک بیان میں یہ حوالہ دے چکا ہوں۔ قرآن مجید کی سولہویں سورۃ، سورۃ نحل، اس کی ۱۰۱ اور ۱۰۲ آیات میں کفار کے ایک اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس اعتراض کا جواب اور اللہ کے عمل کی مصلحت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾

''اور جب ہم ایک آیت کو دوسری آیت کے جگہ سے بدل دیتے ہیں اور اللہ جانتا ہے جو کچھ اس نے نازل کیا ہے۔ تو (کافر) کہتے ہیں کہ یہ بات تو نے خود گھڑی ہے لیکن ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے۔ آپؐ فرما دیں کہ اسے روح القدس، حق کے ساتھ، اپنے رب کی طرف سے لایا تھا تا کہ اہل ایمان کو ثابت قدم کر دے اور مسلمانوں

کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہو''۔۔۔ ان آیات میں اللہ نے پہلے آیات کے مقام و مکان کے بدلنے کو اپنی طرف نسبت دی۔ ﴿وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ﴾ اور جب ہم ایک آیت کو دوسری آیت کے مقام سے بدل دیتے ہیں۔ اس ارشاد کے بعد آیت قرآنی کے مقام و مکان کا تعین کرنا اللہ کا اپنا عمل ہو گیا۔ اور پھر اس عمل پر اعتراض کرنے والوں کا یہ اعتراض کہ یہ تبدیلی تو خود رسولؐ نے کی ہے۔ ﴿قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ﴾ یہ تو خود آپؐ کا افترا ہے۔ اور پھر ایسا کہنے والوں کو جاہل قرار دینا اور یہ کہنا کہ ایک آیت کے مقام کو دوسری آیت سے ہم بدلتے ہیں، یہ واضح کر دیتا ہے کہ آیات کے مقام کا تعین کرنا ایسا عمل تھا کہ اللہ نے اس کی نسبت اپنے حبیبؐ کی طرف بھی نہیں دی۔ بلکہ اس بات کی تردید کی کہ یہ کام رسولؐ خود نہیں کرتے، بلکہ یہ تو اللہ کرتا ہے۔۔۔۔۔تو جو اللہ اپنے کلام کے بارے میں اتنی احتیاط کرے کہ اپنے امین اور صادق رسولؐ کو بھی آیات کے مقررہ مقام بدلنے کی اجازت نہ دے تو وہ کیسے عام مسلمانوں کو یہ اختیار دے سکتا ہے کہ وہ جس آیت کو جہاں چاہیں رکھ لیں۔

اور پھر اس ارشاد کے بعد تو قرآن مجید کی ہر آیت کے مقام کو اللہ کی سند مل گئی کہ جو آیت جہاں ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہے۔ اب اس سند کے جاری ہو جانے کے بعد اگر کوئی اور شخص آیات میں تبدیلی کر سکتا تو اس کی ذمہ داری اللہ پر ہوتی۔ اس لئے کہ سند مل جانے کے بعد ہم تو پابند ہو گئے کہ جہاں جو آیت ہے جس ترتیب سے ہے جس مقام پر ہے اسے ہم اللہ کی مصلحت جانیں۔ اب ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ اعلان جب آیا تھا اس وقت تک تو قرآن ویسا ہی تھا جیسے اللہ نے رکھنا چاہا، تبدیلیاں تو بعد میں کی گئیں تو میں عرض کروں گا کہ ایسا گمان تو براہ راست اللہ کے علم و قدرت سے انکار کرنا ہے۔

اس لئے کہ سند دینے کے بعد اگر قرآن میں تبدیلی ہو سکتی تھی تو چاہے قرآن حکیم بالکل بدل جاتا۔ حلیہ بالکل تبدیل ہو جاتا، لیکن ہم اس سند کی موجودگی میں یہی سمجھیں گے کہ قرآن جس شکل میں ہے اسے اس طرح ہی کی مرضی سے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تبدیل شدہ شکل سے جو گمراہی پیدا ہوتی، وہ انسان کی نہیں، خود اللہ کی ذمہ داری ہوتی۔ ربوبیت کے منافی ہے کہ وہ کسی کو گمراہ کردے۔ چنانچہ جب اسے علم تھا کہ بعد میں ترتیب بدل جائے گی، تو وہ کبھی ترتیب کی سند نہ دیتا۔ اور جب سند دی ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ جو ترتیب ہے وہ اللہ کی منشاء اور حکم کے مطابق ہے۔

ترتیب آیات میں تقدیم وتاخیر کے اسباب

اس اصولی بحث کے بعد اب ہم براہ راست اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ بعض مقامات پر جو آیات اپنے سیاق وسباق سے مربوط نظر نہیں آتیں، ان کے ایسا ہونے کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت درکار نہیں کہ ہر آیت کا اپنا سیاق وسباق ہے۔ اسی حوالے سے ہر آیت کے اس کی جگہ ہونے کا سبب بھی الگ الگ ہوگا یعنی اگر آیۂ تکمیل دین کا مقام گوشت کے حلال وحرام کے احکام کے درمیان ہے تو اس کا سبب اور ہوگا اور جب آیۂ تطہیر، ازواج کے تذکرہ کے ساتھ ہے تو اس کا سبب اور ہے۔ لیکن کچھ ایسی عمومی وجوہات بھی ہیں جو آیات کی تقدیم وتاخیر کا سبب ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ عمومی وجوہات ہر مقام پر یکساں صادق آتی ہیں۔ لیکن اکثر وبیشتر مقامات پر ان میں سے ایک یا دو اسباب کا پایا جانا ممکن ہوگا۔

ان میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعض اوقات ایک ہی مسئلہ کے متعلق دو آیت ہیں جن میں سے ایک پہلے نازل ہوئی دوسری بعد میں، لیکن موجودہ قرآن میں یہ ترتیب

الٹ گئی، اور بعد والی آیات کو پہلے اور پہلے والی کو بعد میں بیان کیا گیا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے نازل ہونے والی آیت کا تعلق کسی خاص حالات سے ہو جبکہ بعد میں نازل ہونے والی آیت ایک کلیہ، ایک عمومی قانون ہو۔ تو نزول آیات تو اسی طرح ہوا، لیکن جب اسے ایک مستقل کتاب میں درج کیا گیا، جب اسے آنے والے انسانوں کے لئے چھوڑا جانے لگا، تو پہلے تو عام قاعدہ بتایا گیا۔ جنرل پرنسپل بیان کیا گیا، اور بعد میں اس کا ذکر کیا گیا جس کا تعلق عام لوگوں کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ خاص لوگوں کے ساتھ، یا خاص مواقع کے لئے تھا۔ یا یوں کہا جائے کہ یہ ایک استثنائی حکم تھا۔ تو یہ ترتیب نزول کے وقت تو ان حالات کے مطابق تھی جن میں وہ آیات نازل ہوئیں۔ لیکن آج یہ ترتیب اس طرح ہے جس طرح آج ان کا استعمال کیا جانا مقصود ہے۔

زمانہ عدت کے متعلق دو آیات

اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے قرآن مجید میں موجود دو آیتوں کا ذکر کروں گا۔ ان دونوں آیتوں میں ایک ہی مسئلہ بیان ہوا ہے کہ ایک بیوی کو شوہر کے انتقال کے بعد کتنے عرصہ تک عدت کا زمانہ گزارنا ہوگا۔ سورہ بقرہ قرآن مجید کی دوسری سورۃ ہے۔ یہ سب سے طویل سورۃ ہے۔ تقریباً پونے تین سپاروں پر مشتمل ہے۔ اس سورۃ کی ۲۳۴ ویں آیت میں ایک حکم ہے کہ اگر کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ خاتون شوہر کے انتقال کے بعد چار ماہ دس دن تک دوسری شادی نہیں کرے گی۔ اس مدت میں وہ اپنی زیبائش و آرائش نہیں کرے گی۔ یہ زمانہ عدت کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس آیت سے صرف پانچ آیات کے بعد یعنی آیت ۲۴۰ میں، ایک اور حکم ہے کہ ایک بیوہ کے لئے اگر شوہر نے وصیت کر دی ہو تب بھی، اور اگر وصیت نہ کی ہو تب بھی، یہ اجازت ہے کہ وہ ایک سال

تک اپنے شوہر کے گھر میں رہ سکتی ہے۔ اس ایک سال تک اس کے اخراجات، اس کا نان ونفقہ شوہر کے مال سے ادا کیا جائے گا۔ اب تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ دوسو چالیسویں آیت پہلے نازل ہوئی تھی یعنی پہلے عدت کی مدت ایک سال تھی بعد میں کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ حکم نازل ہوا جس میں یہ مدت چار ماہ دس دن قرار دی گئی۔ آج قرآن حکیم میں یہ ترتیب بدلی ہوئی ہے چار ماہ دس دن کا بیان پہلے ہے اور ایک سال کا تذکرہ بعد میں ہے۔ اب اس ترتیب کے بدل جانے کے بارے میں دو باتیں کی گئیں۔ پہلے تو یہ کہ ایک سال کی عدت کا حکم نازل ہوا۔ پھر دوسری مدت نے پہلی مدت کے حکم کو منسوخ کر دیا یعنی چار ماہ دس دن کی مدت ناسخ ہے اور ایک سال کی مدت منسوخ ہے۔ اب چونکہ ناسخ آیت نازل بھی بعد میں ہوئی تھی اور ویسے بھی پہلے اس آیت کو ہونا چاہیئے تھا جو منسوخ ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ آج قرآن میں ترتیب مختلف ہے۔ ناسخ پہلے ہے، منسوخ بعد میں ہے تو بعض حضرات نے اس صورت حال کو اس بات کی دلیل قرار دیا کہ قرآن کی آیات کی ترتیب خدا اور رسول ؐ کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ ترتیب بعد میں قائم کی گئی اور ترتیب دینے والوں کی نااہلی نے، ناسمجھی نے، بعد کے حکم کو پہلے اور پہلے والے کو بعد میں لکھ دیا۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن حکیم کی آیات کی ترتیب خدا اور رسول ؐ کی طرف سے نہیں بلکہ عام مسلمانوں کی کارگزاری ہے۔

میں عرض کروں گا کہ یہ نتیجہ صرف اس لئے نکلا کہ ہم نے ترتیب آیت پر غور نہیں کیا۔ اگر موجودہ ترتیب عقل کے مطابق ہو تو پھر ہمارا اعتراض باقی نہیں رہے گا تو پہلی گزارش تو یہ ہے کہ قرآن مجید کا یہ حسن بیان ہے کہ اس کا کوئی حکم منسوخ ہونے کے بعد بھی یکسر منسوخ نہیں ہوتا۔ یعنی قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کے حکم میں اضافہ تو کرتی ہے، پہلی آیت کو Cancel نہیں کرتی، بالکل ختم نہیں کرتی، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے

کہ پہلا حکم دوسرے حکم کے آنے کے بعد استثنائی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کا اطلاق Exceptional Cases میں ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ استثناء مفسرین کی مرضی سے ہوتا ہے، بلکہ قرآن کے ناسخ اور منسوخ دونوں حکم جمع کیئے جائیں تو خود پتہ چل جاتا ہے کہ ان میں سے عمومی حکم کون سا ہے اور خصوصی حالات میں کام آنے والا استثنائی حکم کون سا ہے۔ اب زیر بحث آیات کو دیکھیے۔

چار ماہ دس دن کی عدت، جس مدت میں کوئی بیوہ دوسری شادی نہیں کر سکتی ایک عمومی حکم ہے۔ ہر بیوہ کو اس حکم کی پابندی کرنی ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے۔ قانون ہے۔ دوسری طرف شوہر کی وصیت کے تحت یا بغیر وصیت کے بیوہ کو حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایک سال تک اپنے تمام ضروری اخراجات شوہر کے مال سے پورے کرے اور چاہے تو ایک سال تک اپنے شوہر کے گھر میں قیام کرے۔ خواہ شوہر کے انتقال کے بعد گھر کا کوئی اور مالک ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ارشاد ایک اجازت ہے، حکم نہیں یعنی اگر بیوہ رہنا چاہے تو سال بھر رہے، نہ رہنا چاہے تو اس کی مرضی۔ گویا یہ استثنائی حکم ہے اور صرف وہاں استعمال ہوگا جہاں ضرورت ہوگی۔ اب یہ بالکل عقلی بات ہے کہ عمومی حکم، جس کا اطلاق سب پر ہوگا اسے پہلے بیان کیا جائے اور استثنائی حکم بعد میں بیان ہو۔ یوں کہوں کہ دونوں احکام کو جمع کیجیے تو بات کچھ یوں ہوگی کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے تو وہ چار ماہ دس دن تک دوسری شادی نہیں کرے گی۔ البتہ اگر اس کے لئے شوہر کی وصیت ہو یا وہ خود چاہے تو ایک سال تک شوہر کے گھر میں رہ سکتی ہے اب اس البتہ کے بعد والے جملے کو پہلے بیان کیا جائے تو یہ خلاف عقل ہوگا۔ موجودہ ترتیب عین تقاضائے عقل کے مطابق ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب موجودہ ترتیب ہی مناسب ترین ہے تو پھر نازل ہوتے وقت یہ ترتیب کیوں نہ رہی۔ اللہ نے قانون اور کلیہ کو بعد میں کیوں

نازل کیا اور استثنائی حکم کو پہلے کیوں بھیجا؟ تو میں ترتیب نزولی اور ترتیب کتابی کے فرق کی وجوہات پر پہلے گفتگو کر چکا ہوں۔ یہاں اس بحث کی تکرار نہیں کروں گا۔ صرف ان دو آیت کے حوالے سے ایک مثال دے کر بات کو واضح کر دوں۔

ایک صاحب ایک عظیم الشان مکان تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ مکان کی تعمیر میں بہت وقت لگے گا۔ کئی مرحلے آئیں گے۔ پہلے بنیادیں کھودی جائیں گی۔ پھر دیواریں کھڑی ہوں گی۔ پھر چھت پڑے گی لیکن ان تمام کاموں سے پہلے ایک کام یہ کیا جائے گا کہ اس جگہ ایک کمرہ، ایک شیڈ بنا لیا جائے گا تا کہ ضروری تعمیراتی سامان رکھا جا سکے۔ کام کرنے والے اس میں قیام کر سکیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب مکان اس قابل ہو جائے گا کہ اس میں رہا جا سکے تو یہ عارضی کمرہ گرا دیا جائے گا اس کی اینٹیں وغیرہ بھی مکان میں استعمال کر لی جائیں گی۔ یہ کمرہ اس وقت تک ضروری تھا جب تک مکان نہ بن جائے۔

ایسی ہی کچھ صورت دین کے احکام کی ہے۔ اسلامی معاشرہ اسی وقت وجود میں آ گیا جب پہلے مسلم نے اسلام قبول کیا۔ لیکن ابھی دین کے تمام احکام نازل نہیں ہوئے۔ ابھی اسلامی معاشرے کے تمام قوانین نہیں بنے۔ ابھی قانون وراثت نہیں ہے ابھی حق مہر کا قانون نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کوئی مسلم خاتون بیوہ ہو جائے تو فوری طور پر اسلام اس کی ضروریات کے لئے، اس کے معاشی حقوق کے تحفظ کے لئے کیا حل دیتا ہے۔ چنانچہ فرمان آیا کہ اگر کوئی بیوہ ہو جائے تو سال بھر تک اسے شوہر کے مال سے معاشی تحفظ فراہم ہوتا رہے گا پھر اس کے بعد حق مہر کا قانون آ گیا۔ وراثت کے قوانین بن گئے۔ اب عورت کو، خاص طور بیوہ کو ایک طرف شوہر پر واجب الادا مہر مل گیا، پھر وہ شوہر کے ترکہ میں بھی حصہ دار قرار پا گئی۔ اب شریعت نے جب اسے معاشی طور پر بے آسرا ہونے سے بچانے کا پورا انتظام کر دیا تو اب کہا کہ عدت کی مدت صرف چار ماہ

دس دن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلے حکم کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا۔ وہ بھی موجود ہے یعنی اگر شوہر وصیت کر جائے یا بیوہ دوسری شادی نہ کرے اور اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں ہی رہنا چاہے تو شریعت نے ایک سال تک مہلت دے دی۔ چنانچہ جب نزول قرآن ہوا تھ تو پہلے طویل مدت کی عدت درکار تھی لیکن اب جب اسلامی معاشرہ قائم ہو چکا ہے، تو پہیے تو مختصر عدت پر عمل درکار ہے البتہ بعض معاملات میں کبھی کبھی طویل عدت بھی گزاری جا سکتی ہے تو جو ترتیب نزولی ہے وہ نزول کے وقت ضروری تھی اور جو ترتیب کتابی ہے اسے آج ایسے ہی ہونا چاہیئے تھا جیسے وہ قرآن میں موجود ہے۔

غیر معمولی ترتیب کی دوسری وجہ۔ حفاظت قرآن

ترتیب کے غیر معمولی ہونے کی ایک وجہ تو عرض کر دی گئی کہ کہیں پہلے نازل ہونے والا خاص حکم بعد میں نازل ہونے والے عام حکم کے بعد درج کیا گیا۔ اب ایک اور سبب بھی عرض کر دوں اور خصوصیت سے اس سبب کا تعلق ان آیات سے ہے جو فضائل اہل بیتؑ کے بارے میں ہیں، یعنی آیۂ تطہیر، تذکرہ ازواج میں کیوں ہے اور آیۂ تکمیل دین کا بیان گوشت کے حلال و حرام کے احکام کے ساتھ کیوں رکھا گیا۔

تو پہلے تمہیداً ایک اصولی بات عرض کر دوں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ حفاظت قرآن کرے گا۔ تو یہ حفاظت کیسے ہوگی کیا جو قرآن میں تحریف کرنا چاہے گا اس کے ہاتھ شل ہو جائیں گے۔ یا اسے موت آ جائے گی یا جو قرآن کو غلط پڑھنا چاہے گا تو وہ اچانک گونگا ہو جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس طرح سے نہ تو حفاظت کی گئی اور نہ یہ اللہ کی سنت ہے۔ اس نے اس دنیا کو دنیائے اسباب بنایا۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے۔ اس کے لئے اسباب پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ زندگی دیتا ہے تو زندگی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اگر وہ کسی

کو موت دیتا ہے تو موت کے لئے کوئی سبب، کوئی ذریعہ بناتا ہے۔ اس نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے تو یقیناً وہ اسباب پیدا کیئے ہیں جو قرآن کو محفوظ رکھ سکیں۔ اب کسی چیز کی حفاظت دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جس کی حفاظت درکار ہو اس کے اردگرد مضبوط قلعہ بنا دیا جائے۔ ایسا انتظام کر دیا جائے کہ حملہ آور کا ہر حملہ ناکام ہو جائے۔ دشمن کی ہر کوشش رائیگاں جائے۔ اس کے علاوہ حفاظت کا ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ یہ کہ جو دشمن نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے دل سے نقصان پہنچانے کا خیال ہی نکال دیا جائے۔ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ دشمن حملے کا ارادہ ہی نہ کرے۔ اسے ضرورت ہی محسوس نہ ہو کہ وہ زیرِ حفاظت چیز کو نقصان پہنچائے... قرآن مجید کی دونوں طرح حفاظت کی گئی۔ ایک طرف تو قرآن کو اتنا عام کر دیا گیا کہ کسی کے لئے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ قرآن میں کوئی ردوبدل کر سکے۔ اسے غائب کر سکے۔ یا اس میں اضافہ یا کمی کر سکے۔ دوسری طرف یہ بھی اہتمام کیا گیا کہ جن سے قرآن کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ان کے ارادۂ ضرر رسانی کو کمزور کر دیا گیا، ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ وہ قرآن کو نقصان پہنچانے کا خیال ہی دل سے نکال دیں۔

امریکہ میں ایک نیگرو نے ایک کتاب لکھی۔ روٹس (Roots) کے نام سے۔ امریکہ میں آباد مغربی ممالک کے سفید فام لوگ افریقہ سے سیاہ فام لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لاتے اور انہیں غلام بنا کر ان سے خدمت لیتے تھے۔ یہ سیاہ فام لوگ امریکہ پہنچے تو اپنے وطن، اپنے اہل قبیلہ، غرض اپنے پورے ماضی سے کٹ گئے۔ ان کی نسلیں، جب بہت عرصہ کے بعد آزاد ہوگئیں۔ غلامی ختم ہوئی۔ تو ایک سیاہ فام کو جستجو ہوئی کہ یہ معلوم کرے کہ اس کے اجداد کون تھے۔ وہ کہاں سے آیا ہے۔ چنانچہ اس نے بڑی تحقیق کی۔ امریکہ سے معلومات جمع کیں۔ افریقہ گیا۔ غرض بہت تلاش کے بعد یہ معلوم کرنے میں کامیاب

ہوگیا کہ اس کی اصل کیا ہے۔ اس کی جڑیں کہاں ہیں ۔ اس نے اپنی اس تحقیق کو کتابی شکل دے دی یہی کتاب روٹس ہے۔ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ اس پر فلم بھی بنی

اس کتاب میں مصنف نے ایک مقام پر اپنے افریقی قبیلے کے طور طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا کہ جب قبیلے کے کچھ لڑکے بلوغت کی حد میں داخل ہوگئے تو رسم کے مطابق ان کو قبیلے میں ذمہ دار مرد کی حیثیت سے قبول کیئے جانے سے پہلے ایک تربیتی کورس کرایا گیا۔ اس تربیت کے لئے انہیں گھر سے باہر جنگل میں کچھ عرصہ ایک مذہبی عالم یا جادوگر کے پاس گزارنا تھا۔ یہاں مذہبی عالم انہیں مذہبی رسومات سکھاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ قبیلے کا ایک جواں مرد یا یوں کہیئے کہ قبیلے کی فوج کا سردار، ان لڑکوں کو شکار کے قاعدے سکھاتا۔ دشمن سے لڑنے کے اصول سمجھاتا۔ اسلحے کا استعمال بتاتا۔ ایک دن اس سردار نے سب لڑکوں کے سامنے ایک سوال رکھا کہ فرض کرو تم لوگ ایک چیتے کے شکار کو نکلے ہو۔ تم نے چیتے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دائرہ تنگ کرتے کرتے ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ اب چیتے کے لئے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ وہ مکمل طور پر گھر گیا۔ اب بتاؤ کہ جب چیتے کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ اس کے فرار کے تمام راستے تم لوگوں نے بند کر دیئے تو ایسی صورت میں تم کیا کرو گے ۔ لڑکوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ سردار نے کہا کہ تمہارا جواب غلط ہے۔ جب چیتا ہر طرف سے گھر جائے تو اس پر حملہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تم ایک طرف سے گھیرا توڑ دو۔ لڑکوں کی سمجھ میں بات نہیں آئی تو سردار نے سمجھایا دیکھو! جنگل کا ہر جانور، خواہ کتنا ہی خونخوار کیوں نہ ہو اپنی فطرت کے تحت انسان سے خوف کھاتا ہے۔ انسان کے مقابلے میں اس کی پہلی کوشش فرار کی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسے یہ احساس ہو جائے کہ اب فرار کی کوئی صورت نہیں ہے تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے جان لڑا دیتا

ہے، وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر انسان پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اب اگر چیتا ہر طرف سے گھر گیا اور اسے اپنی جان خطرہ میں محسوس ہوئی تو تم پر حملہ کر دے گا اور مرتے مرتے بھی تم میں سے ایک دو کو نقصان پہنچا دے گا چنانچہ ضروری ہے کہ اس کے اس فطری جذبہ فرار کو باقی رہنے دو، اس کو کوئی راستہ دکھا دو جہاں سے وہ بچ نکلنے کی امید رکھے کیونکہ جب تک بچنے کی امید ہے وہ حملہ آور نہیں ہوگا۔ اگر امید ہی نہ رہی تو وہ تمہیں ضرور نقصان پہنچائے گا۔

اب بظاہر یہ افریقہ کے وحشی قبائل کی دانش وحکمت ہے لیکن اس سردار نے جو بات کہی ہے وہ ایک عالمگیر اصول ہے۔ اور اس اصول سے واقفیت کے بعد آپ دیکھیئے کہ آیۂ تطہیر کو ازواج کے تذکرے میں کیوں رکھا گیا۔ واقعۂ غدیر کو گوشت کے بیان سے کیوں وابستہ کیا گیا؟ اگر یہ آیتیں کہ اس طرح ہوتیں کہ کسی اور تذکرے کی گنجائش ہی نہ رہتی تو ان آیتوں سے جس جس کے مفاد کو نقصان پہنچتا وہ یا تو ان آیتوں کو مٹانے کی کوشش کرتا یا سرے سے قرآن ہی سے انکار کر دیتا چنانچہ یہ اہتمام کیا گیا کہ دونوں آیتیں ایسے تذکروں میں رکھ دی جائیں کہ دشمن کو فرار کا امکان نظر آتا رہے وہ دنیا سے کہہ سکے کہ آیۂ تطہیر تو ازواج کے متعلق ہے اور آیۂ تکمیل دین گوشت کے بعض اقسام کے حرام ہونے پر نازل ہوئی ہے اور جب تک وہ یہ سمجھتا رہے گا کہ ان آیات کو کسی غیر متعلق شخص یا اشخاص سے نسبت دی جا سکتی ہے تو اس وقت تک قرآن کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں کرے گا۔

اور یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ شکار کو فرار کا راستہ دکھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ سچ مچ فرار ہو جائے۔ اگر وہ بچ کر نکل گیا تو سارا مقصد ہی ختم ہو گیا۔ کامیابی تو یہی ہے کہ وہ سمجھتا رہے کہ میں بچ جاؤں گا لیکن حقیقتاً وہ بچ نہ سکے۔ اگر فضائل اہل بیت

اس طرح سے، دوسرے تذکروں میں آتے کہ ان کا اہل بیتؑ سے تعلق ہی نہ رہتا تو پھر یہ ایک کوشش ناکام ہوتی۔ یہ تو اللہ کا کلام ہے۔ یہاں ناکامی کا سوال نہیں۔ اللہ نے اہل بیتؑ کی طہارت کا ذکر ازواج کے ساتھ کیا تو اس طرح سے کہ کوئی لاکھ سر مارے، ذکر اہل بیتؑ الگ رہے گا، ذکر ازواج الگ رہے گا۔ اگر اس نے تکمیل دین کا ذکر گوشت کے حلال وحرام کے ساتھ کیا تو اس خوبصورتی سے کہ ساتھ ہوتے ہوئے بھی تکمیل دین سے تعلق رکھنے والا واقعہ الگ نظر آتا ہے اور گوشت کے مسائل الگ دکھائی دیتے ہیں۔

واقعۂ غدیر کو چھپانے کی کوششیں

آیۂ تطہیر اور آیۂ تکمیل دین جس مقام پر ہیں وہاں کیوں ہیں اور وہاں ہوتے ہوئے بھی اپنے سیاق وسباق سے جدا کس طرح ہیں۔ ان پہلوؤں پر گفتگو آئندہ نشستوں میں ہوگی۔ اس وقت ایک اور غلط فہمی، بلکہ خوش فہمی کو دور کر دوں۔ ہوسکتا ہے کسی ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مانا کہ طہارت اہل بیتؑ کے بیان سے کسی جماعت یا فرد کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہو، اور تسلیم کہ واقعۂ خم غدیر سے کچھ لوگوں کی سیاست کو چوٹ لگتی ہو، لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مسلمان کوئی کلمہ گو صرف اپنے مفاد کے لئے قرآن سے انکار کر دے، یا مسلمان ہوتے ہوئے قرآن میں تحریف کا ارادہ کرلے   ہاں! آج یہ بات ناممکن نظر آتی ہے۔ آج کا مسلمان تحریف کے تصور کے ساتھ ہی بیس مرتبہ معاذ اللہ کہے گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ قرآن سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا ہر دور میں مسلمان کا رویہ یہی تھا۔ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ ہمیں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی مفادات کے لئے ماضی کے کچھ مسلمان کسی حد سے بھی گزر سکتے تھے۔ خدا و رسولؐ کے کسی بھی حکم سے انکار کر سکتے تھے۔ یہاں صرف دو

واقعات کا ذکر کردوں۔

آپ کا بار بار سنا ہوا واقعہ ہے اور اس واقعہ کو مسلمانوں کے کئی مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آنحضورؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے مقرر کردہ مؤذن حضرت بلالؓ نے قسم کھالی کہ اب میں اذان نہیں دوں گا۔ اور صرف یہی نہیں کہ اذان دینا ترک کر دی بلکہ مدینہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دن مدینہ آنا ہوا۔ ان کے آنے کی خبر جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو ہوئی تو آپؑ نے پیغام بھیجا کہ بلالؓ تم باباؐ کے مؤذن رہے ہو۔ آج اسی طرح اذان دو جس طرح باباؐ کے زمانے میں دیتے تھے۔ میرے بے چین دل کو سکون ملے گا۔ بلالؓ مجبور ہو گئے۔ گلدستہ اذان میں جا کر اذان دینی شروع کی۔ تکبیر اور شہادت توحید کے بعد جب ﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ﴾ کہا تو نبیؐ زادی کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب دوسری مرتبہ یہ شہادت دہرائی تو کسی نے کہا کہ بلالؓ آگے اذان نہ دینا۔ سیدہؑ اپنے والد کو یاد کرتے کرتے غش کھا گئی ہیں۔ چنانچہ بلالؓ نے اذان نامکمل رہنے دی اور گلدستۂ اذان سے اتر آئے۔

اب یہ واقعہ اتنے معتبر حوالوں سے بیان ہوا ہے کہ اس کے رونما ہونے میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ جہاں تک واقعہ کے وہ اجزاء ہیں جنہیں راویوں نے دیکھا یا دیکھ سکتے تھے، وہاں تو کسی اختلاف کی گنجائش نہیں لیکن اگر واقعہ میں ایسے جزو ہوں جنہیں راوی نے دیکھا نہیں بلکہ فرض کر لیا تو اس پر ضرور بات ہو سکتی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ راوی نے یہ تو دیکھا تھا کہ بلالؓ جو عہد رسالتؐ میں اذان دیا کرتے تھے۔ انہوں نے بعد رسولؐ اذان دینا چھوڑ دی۔ یہ تو واقعہ ہے لیکن ترک اذان کا سبب کیا تھا۔ راوی نے کہا کہ بلالؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ میں حضورؐ کے لئے اذان دیتا تھا۔ اب کس اور کے لئے اذان نہیں دوں گا۔ یہ راوی کا قیاس ہے۔

اس نے ترک اذان کا سبب محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار دی۔ ہم اس وجہ پر غور کر سکتے ہیں۔ حضرت بلالؓ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں۔ ان کی محبت رسولؐ بھی بہت بلند ہے اور معرفت رسولؐ بھی کم درجہ کی نہیں ہے۔ انہوں نے تپتی ریت پر لیٹ کر، تازیانے کھا کر، مصیبتیں اٹھا کر اسلام سے وابستگی کو قائم رکھا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اذان کے لئے وہ انتخاب رسولؐ ہیں۔ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کام کے لئے مقرر کیا تھا۔ اب ایسی شخصیت کے متلق میں کیسے تسلیم کرلوں کہ انہوں نے اذان اس لئے چھوڑ دی کہ جب رسولؐ ہی نہ رہے تو اب اذان کس کے لئے دوں۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق کا تقاضا تو یہ تھا کہ جس پیغام کو پہنچانے کے لئے، جس اذان کو بلند کرنے کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ تو چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر دعویٰ محبت رکھنے والا قسم کھالے کہ میں حضورؐ کی بلند کی ہوئی آواز کو خاموش نہیں ہونے دوں گا۔ میں اسے بڑھا نہ سکوں، نہ سہی لیکن اس حدتک ضرور رکھوں گا جس حدتک عہد رسالتؐ میں بلند تھی۔ جب بلال بحکم رسولؐ پر اذان دیتے تھے تو بعد رسولؐ یہ حکم وصیت رسولؐ بن چکا تھا۔ اب تو اس کی تعمیل کرنا بدرجۂ اولیٰ واجب تھا۔ بلالؓ اذان کو ترک نہیں کر سکتے تھے انہیں تو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اگر کبھی پہلے کسی مصروفیت، کسی مجبوری کی وجہ سے کسی اذان میں ناغہ ہو جاتا تھا تو اب وہ بھی نہیں ہوگا۔

پھر عشق رسالتؐ کی یہ وجہ کیسے قبول کر لی جائے جبکہ صورت یہ ہو کہ بلالؓ اذان دیتے تھے تو حضورؐ کے کہنے پر۔ کیا یہ واحد عمل تھا جو بلال حضورؐ کے ارشاد پر کرتے تھے؟ وہ نماز پڑھتے تھے تو یہ بھی حضورؐ کے ارشاد پر۔ روزہ رکھتے تھے تو یہ بھی حضورؐ کے فرمان پر۔ سب سے بڑھ کر کلمہ پڑھتے تھے، مسلمان ہوئے تھے تو یہ بھی حضورؐ کے فرمانے پر۔ تو سوال یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی حضورؐ کے ارشاد پر گزرتی تھی تو انہوں نے صرف اذان کیوں

ترک کی۔ اگر محبت رسول کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ حضور کی موجودگی میں ان کے کہنے سے کرتے تھے اب ان کے بعد نہیں کریں گے تو نماز روزہ بھی چھوڑ دیتے۔ اسلام کو بھی خدا حافظ کہہ دیتے۔ جب یہ سب نہیں ہوا تو میں ترک اذان کا یہ سبب کیسے مان لوں کہ بلالؓ نے عشق رسولؐ میں اذان دینا ترک کر دی۔ عقلاً یہ تسلیم کرنا بہت دشوار کہ انہوں نے خود اذان دینا بند کر دیا۔ اس سے زیادہ قرین عقل بات یہ ہے کہ کسی صاحب اختیار نے حکماً بلالؓ کو اذان دینے سے روک دیا۔ کسی نے پابندی لگا دی کہ وہ آئندہ گلدستۂ اذان پر نہیں جائیں گے۔

اچھا آگے چلئے۔ بلالؓ نے ﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ کہا تو لوگوں نے بلالؓ کو یہ کہہ کر روک دیا کہ خاتونِ جنتؑ کو غش آ گیا ہے۔ بس آگے اذان نہ دو۔ اب راوی نے لوگوں کو کہتے سنا کہ خاتون جنتؑ کو غش آ گیا ہے۔ راوی نے بیان کر دیا۔ یہاں تک تو واقعہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہہ رہے تھے اس خبر کی بنیاد کیا تھی۔ نبی زادی کو غش آتے کس نے دیکھا؟ بی بیؑ اپنے گھر میں تھیں۔ گھر مسجد کے ساتھ ہی تھا لیکن کون تھا جو بی بی کی کیفیات کو غور سے دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی آپ کو غش آیا اس نے فوراً خاتون جنتؑ کے گھر سے آ کر مسجد میں بلالؓ کے پاس جا کر اذان کو رکوا دیا۔ ﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ میں اور ﴿حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ﴾ میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔ اس عرصہ میں اس تیزی سے کیسے ممکن ہے کہ اتنے واقعات ہو جائیں۔ شہادتِ رسالتؐ کے فوراً بعد اذان کو اسی صورت میں رکوایا جا سکتا ہے کہ رکوانے والے وہیں مسجد میں موجود ہوں اور جیسے ہی کلمہ مکمل ہو بلالؓ کو آگے بڑھنے سے روک دیں۔

اور یہ بھی توضیح طلب بات ہے کہ جب بی بیؑ کو غش آ گیا تو اب اذان رکوانے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے اور پھر غش تو حضورؐ کے اسمِ گرامی کے بلند ہونے پر آیا۔

اب بلالؓ جو کچھ کہتے اس میں آنحضرتؐ کا نام نہیں آتا تھا۔ اگر وہ کلمے ادا ہو جاتے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر یہ بھی دیکھیئے کہ روایت کے مطابق اذان میں صرف حضورؐ کے نام کا یہ اثر ہوا کہ خاتون جنتؐ کو غش آ گیا۔ اذان میں نام تو ہر روز آتا تھا۔ اس کے اثر کا یہ عالم تھا تو مسجد نبوی کو دیکھ کر بی بی پر کیا گزرتی ہوگی۔ جسے خود حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ حضورؐ کے عمامے کو، حضورؐ کی عبا کو، حضورؐ کے بستر علالت کو خالی دیکھ کر آپؑ کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی اور سب سے بڑھ کر چند قدم پر قبر رسولؐ موجود تھی۔ جب اپنے بابا کو مٹی تلے محو خواب دیکھتی ہوں گی تو بی بی پر کیا گزرتی ہوگی۔ یاد دلانے والے ایسے بیسیوں آثار کی موجودگی میں صرف بلالؓ کی آواز سے کیا فرق پڑ گیا تھا کہ رسولؐ زادی پر اتنا گہرا اثر ہوتا۔ چنانچہ یہ تو مانا جا سکتا ہے کہ جناب سیدہؑ کی غشی کا حوالہ دے کر اذان رکوادی گئی۔ لیکن یہ نہیں تسلیم کیا جا سکتا کہ اذان رکوانے کا یہی حقیقی سبب تھا یقیناً اذان کسی اور وجہ سے رکوائی گئی البتہ بی بی کی غشی کو بہانہ بنایا گیا۔

تجزیہ نے واضح کر دیا کہ بلالؓ نے بعد رسولؐ اذان دینا خود نہیں چھوڑا تھا۔ ان پر پابندی لگا دی گئی تھی اور جب ایک مرتبہ خاتون جنتؑ کی فرمائش پر اذان دینی چاہی تو انہیں ﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا اذان تو روز ہوتی تھی۔ آخر بلالؓ کے ساتھ یہ خصوصی رویہ کیوں؟ تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ روز ہونے والی اذان میں اور بلالؓ کی اذان میں کوئی فرق ضرور تھا اور یہ فرق ﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ کے کلمے کے بعد ادا کیئے جانے والے جملوں میں تھا۔ اور اس فرق سے، اس جملے سے، جو بلالؓ کی اذان میں تھا، صاحبان اقتدار کو کوئی نقصان پہنچتا تھا۔ اور جب تاریخ ہمیں ایک ایسے جملے کے وجود سے بھی آگاہ کر دیتی ہے تو پھر سارا واقعہ واضح ہو جاتا ہے۔

یہ کون سا جملہ تھا؟ ملا شیخ علی قادری چشتی نے اپنی کتاب کنز العمال میں لکھا کہ بلالؓ اذان دیتے ہوئے ﴿حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ﴾ کے بعد ایک اور کلمہ ﴿حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ﴾ بھی کہا کرتے تھے۔ اور یہ جملہ ہمیشہ سے نہیں کہتے تھے بلکہ محمد بن خاوند شاہ المتوفی ۹۰۳ء نے مشہور و معتبر کتاب روضۃ الصفا میں بتایا کہ جب آخری حج سے واپسی کے دوران غدیرخم کے مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر کرتے کرتے ٹھہر گئے، اور آگے جانے والوں کو واپس بلانے کا حکم دیا گیا، اور پیچھے رہنے والوں کے غدیر تک پہنچنے تک کا انتظار فرمایا، تو اس وقت لوگوں کو جمع کرنے کے لئے بلالؓ کو اذان کے لئے کہا: اس مرحلے پر بلالؓ نے حکم رسولؐ سے لوگوں کو پکارنے کے لئے جو کلمہ ادا کیا وہ ﴿حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ﴾ تھا۔ غدیرخم میں ولایت علی علیہ السلام کے اعلان کے لئے کہا جانے والا یہ کلمہ جزو اذان ہوگیا۔ اور جب حضورؐ مدینہ واپس پہنچے تو جب جب بلالؓ نے اذان دی، اس جملے کو اذان میں شامل رکھا۔ غدیرخم کے واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو ماہ اور کچھ دن مسلمانوں کے درمیان رہے۔ اس عرصہ میں یہ کلمہ ادا کیا جاتا رہا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کلمہ صرف ایک کلمہ نہیں تھا بلکہ مقام غدیر پر علی علیہ السلام کی ولایت اور وصایت کے اعلان کی علامت تھا۔ یہ جملہ مسلمانوں کو اس عہد کی یاد دلاتا تھا جو انہوں نے علی علیہ السلام کی مسند نشینی کے لئے اپنے رسولؐ سے کیا تھا لیکن بعد پیغمبرؐ، ماہ ربیع الاول ۱۱ ہجری میں مدینہ میں قائم ہونے والی حکومت کی قیادت علی علیہ السلام کے پاس نہیں تھی۔ اگر یہ جملہ بدستور ادا کیا جاتا تو عام مسلمانوں کے ذہن اور زبان پر برسر اقتدار لوگوں کے متعلق سوال پیدا ہوتا۔ چنانچہ اس جملے پر فوراً پابندی ضروری ہوگئی تھی۔ اب اگر بلالؓ سے کہا جاتا کہ وہ اذان میں یہ کلمہ ادا نہ کریں تو اولاً بلالؓ تسلیم نہ کرتے اور اگر مان بھی جاتے تو لوگوں کو جب پتہ چلتا کہ ایک جملہ پر پابندی لگا دی گئی ہے تو سوال ہوتا کہ ایسا کیوں کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی واقعہ

غدیر سامنے آ جاتا۔ چنانچہ سیاست نے راہ دکھائی اور بلالؓ کو اذان دینے کے فریضے سے معزول کر کے دوسرا کوئی سرکاری مؤذن مقرر کر دیا گیا۔ عوام سے کہا گیا کہ بلالؓ محبتِ رسولؐ میں اب اذان دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے آج کل بھی حکومتیں جب کسی عہدہ دار سے ناراض ہو جاتی ہیں اور اسے عہدے سے ہٹانا چاہتی ہیں جبکہ اس کو ہٹانے پر عوامی ردعمل کا اندیشہ ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ عہدہ دار نے خرابیٔ صحت کی بناء پر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔

اب حالات کی یہ کروٹ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی نظر میں تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ عشق رسولؐ تو بہانہ ہے۔ اصل بات بلالؓ کی اذان کو خاموش کرنا ہے چنانچہ آپؑ نے حکومت کے بہانے ہی کو اپنا اسلحہ بنا لیا اور یہ کہہ کر فرمائش اذان کی کہ اگر بلالؓ عشق رسالتؐ میں اذان دینا بند کر رہے ہیں تو میری اپنے باباؐ سے محبت کا تقاضا ہے کہ میں ان کے مؤذن سے اذان سنوں۔ اب ارباب اقتدار مجبور تھے۔ بلالؓ کو کیسے روکا جائے۔ ادھر بلالؓ اذان شروع کر چکے تھے۔ ادھر ذہنوں میں ہیجان برپا تھا ﴿حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ﴾ کا جملہ کیسے کاٹا جائے۔ اچانک بلالؓ ﴿اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ پر پہنچے، نام رسولؐ زبان پر آیا۔ مسلمانوں نے عقیدت و احترام سے سر جھکا کر صلوٰۃ پڑھی، اور شاطر ذہنوں نے اسی عقیدت کو آلہ کار بنا لیا۔ جیسے ہی یہ کلمہ دوبارہ ادا ہوا، چند لوگوں نے شور مچا دیا، بلالؓ خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ نبی زادیؑ پر غشی طاری ہو گئی ہے، بلکہ میں نے روایت میں یہ الفاظ بھی دیکھے کہ کہنے والے نے یہاں تک کہا کہ بلالؓ اب تم کس کے لئے اذان دے رہے ہو۔ نبیؐ کی بیٹی تو صدمہ کی تاب نہ لا کر دنیا سے رخصت ہو گئی ہیں۔ یعنی مقصد صرف یہ ہے کہ بلالؓ خاموش ہو جائیں۔ ﴿حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ﴾ تک نہ پہنچ جائیں۔ اس کے لئے اگر غلط بیانی بھی کرنی پڑی تو کر دی جائے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ چند دن پہلے حجرہ رسولؐ میں نبیؐ کا جنازہ رکھا تھا اور باہر لوگوں کو بتایا جا رہا تھا کہ حضورؐ زندہ ہیں، ان کی وفات نہیں ہوئی۔ آج اپنے گھر میں رسولؐ کی بیٹی زندہ سلامت موجود ہے، لیکن کہا جا رہا ہے کہ وہ وفات پا چکی ہیں۔ گویا اہل سیاست کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ سچ کیا ہے۔ وہ تو فقط اپنے مفاد کو دیکھتے ہیں اگر فائدہ نظر آئے تو وفات پا جانے والے کو زندہ کہہ دو، اور اگر مصلحت نظر آئے تو زندہ کو مرحوم قرار دے دو۔

سنت رسولؐ سے انکار

اپنے سیاسی مقصد کے لئے اذان میں تحریف کا یہ واقعہ عہد رسالتؐ کے بعد کا ہے۔ اس سے زیادہ سنگین، اس سے زیادہ اہم واقعہ، عہد رسالتؐ میں، عین حضورؐ کے سامنے، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیش آیا۔ واقعہ ایسا مستند کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی صحیح بخاری میں کم از کم چھ مرتبہ اور امام مسلم نے صحیح مسلم میں کم از کم دو مرتبہ نقل کیا۔ واقعہ اتنا مشہور کہ مجھے تفصیل عرض کرنے کی ضرورت نہیں محض نتیجہ گوش گزار کرنا کافی ہوگا۔ اپنے وصال سے کچھ پہلے، بستر علالت پر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، اپنے گرد موجود مسلمانوں سے ایک فرمائش کی کہ مجھے قلم دوات لا دو تا کہ ایک ایسی تحریر چھوڑ جاؤں کہ تم قیامت تک گمراہ نہ ہو سکو۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس فرمائش کا جو جواب ملا اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ جواب دینے والے نے پہلے تو کسی ایسی تحریر کی ضرورت سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمارے لئے صرف کتابِ خدا کافی ہے۔ اگر قولِ رسولؐ کے مقابلے میں یہ کہا جائے ہمارے لئے کتابِ خدا کافی ہے تو اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ قولِ رسول کی مسلمانوں کو کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں تمام ہدایت قرآن

سے حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلمان اگر سنت رسولؐ کو نظر انداز بھی کر دیں تو ان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ "قرآن کافی ہے" کے نعرے نے سنت کی اہمیت اور ضرورت کو بالکل ختم کر دیا۔ لیکن اس پر اکتفا نہیں ہوئی۔ قرآن کے کافی کہہ دینے سے انکار سنت تو ہوا، لیکن کم از کم سنت کے برحق ہونے کا امکان تھا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور قول درست تو ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ممکن تھا کہ کسی مرحلے پر اگر قرآن سے راہنمائی نہ ملتی تو مسلمان حدیث کا سہارا لے لیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے اس کا اندازہ کر کے، اسے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے تحریر لکھنے سے روک دیا گیا۔ لیکن بعض اقوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی مرتبہ فرمائے تھے کہ خطرہ تھا کہ ان اقوال کو کبھی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہر حدیث، ہر قول رسولؐ کو ہمیشہ کے لئے رد کرنے کے لئے "قرآن کافی ہے" کے جملے کو ناکافی سمجھتے ہوئے ایک سنگین تر جملہ کہا گیا کہ نعوذ باللہ آنحضورؐ پر بیماری کا غلبہ ہے۔ ان کے قول و فعل پر بیماری کا اثر ہے۔ یہ بات ایسی تھی کہ اگر اس دن اس قول کو تسلیم کر لیا جاتا تو پھر حیاتِ رسالتؐ کی کوئی بات بھی معتبر نہ رہتی، اس لئے کہ اگر نعوذ باللہ بیماری کی وجہ سے ہذیان ہو سکتا ہے تو ماضی میں جو کچھ کہا ہوگا، وہ کبھی محبت کے زیر اثر کہا ہوگا، کبھی غصہ میں آ کر کہا ہوگا۔ اور جس طرح آج ان کے قول کو متوازن سمجھنے سے انکار ہو رہا ہے۔ ماضی میں کہی گئی ہر بات کا انکار ہو سکتا تھا۔

غرض آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سیاست دانوں نے اگر اذان میں کوئی جملہ اپنے مفاد کے خلاف پایا تو اذان میں تحریف کر دی، اور اگر ارشادِ رسالتؐ میں کوئی بات لوگوں کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ نظر آئی تو سنت رسولؐ کے حجت ہونے سے بھی انکار کر دیا، اور اس کے مستند اور معتبر ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ اب اگر قرآن مجید بھی فضائل اہل بیتؑ اس طرح بیان کرتا کہ مخالف کو فرار کی راہ نہ ملتی تو قرآن بھی تحریف کا نشانہ بن جاتا۔

اس کے الہامی ہونے سے انکار کر دیا جاتا۔ چنانچہ قرآن نے آیۂ تطہیر کو ازواج کے تذکرے میں نازل کیا اور آیۂ تکمیل دین کو گوشت کے حلال وحرام کے حکم کے ساتھ نازل کیا تاکہ مفاد پرستوں کو خطرہ محسوس نہ ہو اور قرآن ان کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہے۔

اذان میں تحریف کا واقعہ ہو یا قولِ رسولؐ پر نعوذ باللہ ہذیان کی تہمت ہو اہل سیاست کی دین پر یہ تمام دست درازیاں کبھی تو مورخ کی مفاد پرستانہ کاوشوں سے پس پردہ چلی گئیں، کبھی مناظرہ باز زبانوں کی نکتہ آفرینیوں سے نظر انداز ہوگئیں۔ ہوسکتا ہے کہ آج بھی کوئی سادہ دل یہی کہتا رہے کہ دورِ اول کے مسلمانوں پر یہ گمان کرنا کہ وہ اپنے مفاد کو خطرے میں دیکھ کر قرآن کو تختہ مشق بنا سکتے تھے، اس میں تحریف اور تبدیلی کر سکتے تھے، محض بدگمانی ہے تو میں توجہ دلاؤں گا کہ یہ تو قرآن تھا، ایک بے زبان کتاب۔ اگر اس کی حفاظت کے غیر معمولی ذریعے اختیار کیئے جاتے تو اس کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا جاتا، جب قرآن ناطق کے ساتھ یہ سلوک رہا ہو کہ اسلام کی تمام تعلیمات کو پس پشت ڈال کر، خدا اور اس کے رسولؐ کے تمام احکام کو خاک میں ملا کر، انسانیت کی تمام اعلیٰ قدروں کو قدموں تلے روند کر، آل رسولؐ کو اپنے مفادات کی راہ میں رکاوٹ جان کر، دورِ اول کے مسلمانوں نے اہل بیتؑ کو مٹانے اور ختم کرنے کے لئے ہر حد کو توڑ دیا اور وہ کچھ کر گزرے جو دنیائے ظلم وستم میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اپنے خودساختہ اور خودغرضانہ مفادات کے لئے انسان کہاں تک جا سکتا ہے؟ یہ دیکھنا ہو تو کربلا میں یزید کا طرزِ عمل دیکھ لیجئے۔ شریعت کا کون سا قاعدہ تھا جسے توڑا نہیں گیا۔ اللہ کا کون سا فرمان تھا جسے بھلایا نہ گیا۔ رسولؐ کی کون سی سنت تھی جسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ روزِ عاشور اسلام کے ہر حکم کی دھجیاں بکھیر دی گئیں۔ بے گناہوں کا قتل، پیاس سے بے حال افراد پر بندشِ آب، شیر خوار بچے کو تیر کا نشانہ بنانا، عورتوں کے سروں سے

چادر اتار دینا، ننھی یتیم بچی کے منہ پر طمانچے مارنا، بے سہارا عورتوں اور بچوں کے خیموں کو نظرِ آتش کر دینا، ان میں سے کون سا عمل تھا جس کی اجازت اسلام نے دی تھی۔ اگر کربلا میں، نام نہاد مسلمانوں کے سامنے بدترین مجرم بھی ہوتے تو اسلام تو ان کے لئے بھی ان میں سے کسی عمل کی اجازت نہ دیتا۔ چہ جائیکہ دنیا کے شریف ترین، بے گناہ افراد، اور وہ افراد کہ بانی اسلام کے جگر گوشے ہوں۔ جن کی مؤدت اور محبت کو ہر مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہو۔ جن کی زبان اور ہاتھ سے مسلمانوں کو فیض تو ملا ہو، ہدایت تو ملی ہو، کبھی کوئی دکھ نہ پہنچا ہو۔

دس محرم کو جو کچھ ہوا۔ مفاد پرستی میں حد سے گزرنے کی بہت بڑی مثال تھا۔ ممکن تھا کہ اسے فوری اشتعال کا نتیجہ قرار دے دیا جاتا، اسے جنگ کا جذباتی ردِعمل کہہ دیا جاتا، لیکن گیارہ محرم کو تو حالات بدل چکے تھے۔ حسینؑ اور ان کے تمام ساتھی جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ اب تو ایک عظیم الشان لشکر کے سامنے جنگ آزما سپاہی نہیں تھے۔ اب تو چند یتیم بچے تھے۔ بے سہارا بیوائیں تھیں جن کے وارث خاک و خون میں لپٹے ہوئے، خاکِ کربلا پر محوِ خواب تھے۔ اب تو لشکر یزید کا طرزِ عمل بدل جاتا۔ اب تو اسلام کے احکام یاد آ جاتے۔ لیکن گیارہ محرم کو جو کچھ ہوا وہ شریعت اسلامی کو اپنے جذبۂ دشمنی کی آگ میں جلا کر خاکستر کر دینے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

حفاظت قرآن : ۱۴

آیۂ تطہیر کی جداگانہ حیثیت

گزشتہ گفتگو میں یہ عرض کیا گیا کہ اہل بیت علیہم السلام کی مدح وتعریف کی آیات اگر اس طرح نمایاں کردی جاتیں کہ دشمنانِ اہل بیتؑ کے لئے ان سے انکار کا کوئی راستہ نہ رہتا تو وہ، یا تو قرآن کو الہامی ماننے سے انکار کردیتے یا قرآن میں تحریف کی ضرورت محسوس کرتے، جس سے قرآن شکوک وشبہات کی آماجگاہ بن جاتا۔ اس لئے ان آیات کو اس طرح بیان کیا گیا کہ پہلی نظر میں وہ کسی اور کا تذکرہ معلوم ہوں اور دشمن اہل بیتؑ یہ محسوس کرے کہ وہ ان آیات کے بارے میں لوگوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ آیات اس طرح ہوں کہ ان آیات کا حقیقی مفہوم ظاہر ہی نہ ہو سکے، اور گمراہ کرنے والا، اپنے مقاصد میں ٹھوس وجوہات کی بنا پر کامیاب ہو جائے، تو پھر ان آیات کا مقصد نزول ہی ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ صاحب قدرت وکمال اللہ کا اعجاز بیان ہے کہ ایسی آیتیں جہاں کہیں بھی ہیں اس شان سے ہیں کہ تھوڑا سا تجزیہ، معمولی سا غور اور تلاش حق کی ذرا سی کوشش بھی حقیقت تک پہنچا دیتی ہے۔

ربط کلام کے لئے ان تمہیدی جملوں کے بعد آیئے ایک نظر آیۂ تطہیر پر ڈالیں اور دیکھیں کہ اس جزو کلام کو کیسے ایک گروہ کے تذکرے کے ساتھ رکھا گیا اور کس طرح

اسے اس گروہ سے الگ کیا گیا۔ سب سے پہلے آیت کا محل وقوع ملاحظہ فرمایئے۔

آیۂ تطہیر کا سیاق وسباق

آیۂ تطہیر قرآن مجید کی ۳۳ ویں سورہ کی ۳۳ ویں آیت کا حصہ ہے۔ اس سورہ کی ۲۸ ویں آیت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خطاب کیا گیا اور ارشاد ہوا: ''اے نبیؐ آپ اپنی ازواج سے کہہ دیجیے کہ اگر تم کو دنیا کی زینت اور آرائش پسند ہے تو آؤ تم کو کچھ مال دنیا دے کر رخصت کر دیتا ہوں۔'' پھر ۲۹ ویں آیت شروع ہوئی: ''اگر تم یعنی ازواج رسولؐ خدا اور رسولؐ کے راستے پر چلو اور آخرت کی زندگی کا انتخاب کرو تو اللہ نے نیکوکار عورتوں کے لئے بڑا اجر وثواب رکھا ہے۔'' اس کے بعد براہ راست ازواج رسولؐ سے خطاب ہوا کہ ''اے نبیؐ کی بیویو! اگر تم سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہوئی تو اس کا عذاب بھی دوگنا ہوگا اور اللہ کے لئے یہ بہت آسان بات ہے۔'' پھر ۳۱ ویں آیت میں فرمایا کہ: ''اور تم میں سے جو خدا اور رسولؐ کی تابع ہوگی۔ ہم اس کا اجر وثواب بھی دوگنا کر دیں گے۔ اور ہم نے ان کے لئے عزت کی روزی رکھی ہے۔'' اس سے اگلی آیت میں فرمایا: ''اے نبیؐ کی عورتو! تم کوئی معمولی عورتیں نہیں ہو۔ اگر تم کو پرہیزگاری مطلوب ہو تو لوگوں سے ایسے نرم لہجے میں گفتگو نہ کرو کہ مرض رکھنے والے دل میں تمہارے لئے طمع بیدار ہو۔ تم لوگوں سے شائستہ اور پُروقار لہجے میں بات کیا کرو۔'' اور اس کے بعد ۳۳ ویں آیت ''اور تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ اور زمانۂ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار کرکے مت دکھاتی پھرا کرو۔ اور نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرو''۔ اور یہیں وہ جزو شروع ہوا جو آیۂ تطہیر کہلاتا ہے۔ ''اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم سے ہر نجاست کو دور رکھے اور اے اہل بیتؑ تمہیں اس طرح پاک وپاکیزہ رکھے جیسے

پاک ہونے کا حق ہے'' اس کے بعد چونتیسویں آیت میں ارشاد ہوا: ''اور اسے یاد کرو جو کچھ تمہارے گھروں میں پڑھا جاتا ہے۔ وہ باتیں جو آیاتِ الٰہی ہیں اور حکمت کی باتیں ہیں۔ خدا باریک بین اور واقف کار ہے۔'' یہ تھا ان سات آیات کا ترجمہ جو آیۂ تطہیر کا سیاق وسباق ہیں۔

خصوصی خطاب سے حاصل ہونے والے نتائج

اب آیئے ان باتوں کی طرف جو ان آیات میں کہی گئی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ان آیات میں ازواج نبیؐ کو کچھ باتوں سے روکا جا رہا ہے۔ دنیا کی زیب و زینت کی خواہش نہ کرو۔ غلط فہمی پیدا کرنے والے لہجے میں کلام نہ کرو۔ صریح ناشائستہ حرکت سے بچو، زمانۂ جاہلیت کے طور طریقے چھوڑ دو...... دوسری طرف کچھ باتوں کو کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ آخرت کی زندگی کو پیش نظر رکھو۔ خدا اور رسولؐ کی مطیع رہو۔ اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو۔ جو کچھ گھر میں تلاوت کیا جاتا ہے اور جو حکمت کی باتیں بتائی جاتیں ہیں ان کو یاد رکھو۔

یہ سب نصیحتیں ہیں۔ برائی سے روکا جا رہا ہے۔ اچھے کاموں کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اب نصیحت کرنا وہ عمل ہے جو ہر مؤمن کو کرنا چاہیے۔ ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (سورہ والعصر، آیت: ۳) ایک دوسرے کو حق کی طرف دعوت دینا صبر کرنے کی تلقین کرنا ہر مؤمن کا شعار ہے۔ پھر آیتوں میں جن برائیوں سے روکا جا رہا ہے ان برائیوں سے ہر مؤمن خاتون کو بچنا چاہیے، اور جن کاموں کا حکم دیا جا رہا ہے ان کو ہر مؤمن عورت کو کرنا چاہیئے۔ جب نصیحت کرنا بھی ہر ایک کا فریضہ اور برائیوں سے بچنا اور نیکیوں کو اختیار کرنا بھی ہر ایک کا کام ہے تو سوال یہ ہے کہ خاص طور پر رسولؐ کی ازواج

کو نصیحت کرنے کے لئے کیوں کہا گیا اور تمام نصیحتیں، خواہ وہ زبان رسالتؐ سے کروائی گئیں یا اللہ نے براہ راست کیں، سب کی سب ایک مخصوص جماعت، ازواج النبیؐ، نساء النبیؐ سے کیوں کی گئیں۔ کیا اللہ ان برائیوں سے صرف ازواج نبیؐ کو پاک دیکھنا چاہتا ہے؟ اور کیا یہ اچھی باتیں صرف حضورؐ کی بیویوں میں ہوں تو کافی ہیں؟ کیا دوسری تمام مسلمان عورتیں آزاد ہیں کہ وہ ان برائیوں کا ارتکاب کرسکتی ہیں اور ان نیکیوں سے گریز کرسکتی ہیں۔ یقیناً کوئی ذی شعور انسان یہ نہیں مانے گا۔ ان آیات میں روکے گئے کاموں سے رکنا اور کرنے والے کاموں کا کرنا ہر مسلمان عورت کا فریضہ ہے، تو پھر ساری گفتگو، خاص طور پر مخاطب کر کے، بار بار نام لے کر صرف ازواج رسولؐ سے کیوں؟

تو نصیحت دونوں طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی سب کو مخاطب کر کے نصیحت ہوتی ہے کبھی ایک فرد خاص یا جماعت خاص سے نصیحت کی جاتی ہے۔ دونوں میں فرق کیا ہے۔ مثال عرض کروں۔ مولانا مسجد میں خطبہ دے رہے تھے۔ دورانِ خطاب انہوں نے نصیحت کی، لوگو! جواء کھیلنا بری بات ہے۔ چوری کرنا بری بات ہے۔ شراب پینا بری بات ہے۔ ان برائیوں سے بچو۔ مسجد میں سینکڑوں نمازی تھے۔ سب ہی ان نصیحتوں کے مخاطب تھے۔ ممکن ہے ان میں ایک بھی جواری نہ ہو۔ ایک بھی چور نہ ہو۔ ایک بھی شراب نہ پیتا ہو۔ ان نصیحتوں کا ہرگز مطلب یہ نہیں لیا جائے گا کہ جو عیب بتائے گئے ہیں وہ نمازیوں میں موجود بھی ہیں۔ اس نصیحت کا صرف یہ مطلب ہے کہ زندگی میں کبھی ایسے گناہوں کا سامنا ہو جائے تو خود کو بچا لینا۔ خود کو محفوظ رکھنا۔

اتفاق سے وہی مولانا بازار سے گزر رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ان کے ایک اور عالم دین دوست کا بیٹا آتا نظر آ گیا۔ مولانا دوست کے بیٹے سے ملے۔ اس سے کہا: بیٹا! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: فرمایئے۔ مولانا لڑکے کو لے

کر ایک غیر آباد گوشے میں کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: بیٹا جوا کھیلنا بری بات ہے۔ چوری کرنا بری بات ہے۔ شراب پینا بری بات ہے۔ ان برائیوں سے بچو۔'' اب جملے وہی ہیں جو مسجد میں مجمع سے کہے تھے لیکن وہاں قطعاً ضروری نہیں تھا کہ نمازیوں میں کوئی ایک فرد بھی ایسا ہو۔ لیکن اب جو وہی جملے ایک لڑکے کو مخاطب کر کے کہے گئے تو ہر صاحب عقل آدمی یہ سمجھ جائے گا کہ صاحبزادے بری صحبت میں پڑ کر بھٹک گئے ہیں اور مولانا اپنے دوست کی خیر خواہی میں، اس کے بگڑے ہوئے بیٹے کو اصلاح کے لئے نصیحت کر رہے ہیں۔ اور اب مولانا جو جو نصیحت کریں گے۔ جن جن برائیوں کا ذکر کریں گے وہ برائیاں لڑکے میں موجود ہوں گی۔ ... معلوم ہوا کہ جب نصیحت مخاطب کا تعین کیئے بغیر کی جائے تو جن سے گفتگو ہو رہی ہو، ان کا برا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن جب نصیحت کسی سے خاص طور پر مخاطب ہو کر کی جائے، تو جس کو نصیحت کی جا رہی ہو اس کا برائیوں سے آلودہ ہونا یقینی ہے۔

اب سورۂ احزاب کی ان آیتوں میں تمام مسلمان عورتوں سے خطاب ہوتا تو کسی کا قصوروار ہونا ضروری نہیں تھا۔ لیکن جب رسولؐ سے نام لے کر ارشاد ہوا، اور وہ بھی اس خصوصی ہدایت کے ساتھ کہ اپنی بیویوں سے کہہ دو، اور پھر جب اللہ نے براہ راست بات کی تو بھی ''یا نساء النبیؐ'' کہہ کر۔ اب ہم مجبور ہیں کہ تسلیم کریں کہ جن کاموں سے بچنے کی نصیحت کی جا رہی ہے وہ باتیں اس گروہ میں، سب میں نہ سہی، کچھ میں سہی، لیکن موجود ضرور ہیں۔

قرآن مجید کا طرز کلام ایک اشارہ کر رہا ہے۔ وہ اشارہ انتہائی واضح ہے، لیکن جس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، میرا دل نہیں مانتا کہ میں اس پہلو کو مان لوں۔ یعنی دل آمادہ نہیں ہے کہ انتہائی محترم، انتہائی قابل عزت و تکریم، امہات المومنینؓ کے متعلق

میں ان برائیوں کو مان لوں جو قرآن نے بیان کی ہیں۔ تب بھی ان نصیحتوں سے کم از کم یہ بات تو بہرصورت تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان برائیوں کا وجود نہ رہا ہو، ازواج میں سے کوئی ان حرکات کی مرتکب نہ رہی ہوں، پھر بھی ان برائیوں کا امکان ضرور تھا۔ یعنی جن کو نصیحت کی جا رہی تھی وہ ویسی تھیں نہیں، لیکن ویسی ہو ضرور سکتی تھیں۔ تب ہی نصیحت کی ضرورت پیش آئی۔ اگر قرآن کی مخاطب خواتین نہ ویسی تھیں، اور نہ وہ ویسی ہو سکتی تھیں، تو ان کو نصیحت کرنا بے معنی ہوگا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان آیات کی مخاطب ہستیوں میں برائی کا امکان موجود تھا۔

اب اس تذکرے میں ایک جملہ عجیب شان کا آیا۔ ارشاد ہوا کہ ''بس اللہ نے یہ طے کرلیا ہے''۔ پہلے تو ''انما'' کہہ کر ارادے کی پختگی بتائی کہ بس یہ فیصلہ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بعد یہ بتایا کہ کسی اور کا نہیں یہ اللہ کا ارادہ ہے، یہ فیصلہ اس کا ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے تو بس ویسے ہی ہو جاتا ہے۔ اب اس اعلان کے بعد جو کچھ کہا جائے گا۔ وہ مستقبل کی بات نہیں ہوگی بلکہ وہ ہو چکی ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ یہ تقدیرِ الٰہی ہے کہ ''وہ تمہیں ہر عیب سے دور رکھے اور اے اہل بیتؑ تمہیں ایسے پاک رکھے جیسے پاک رکھنے کا حق ہے۔'' تو اللہ نے جب ہر برائی کو ان سے دور رکھا اور انہیں ایسا پاک بنایا جیسے پاک بنانے کا حق تھا تو ان ہستیوں میں، ان اہل بیتؑ میں برائی کا امکان ہی نہ رہا۔ شیخ الہند مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیے میں لکھا کہ اس آیت تطہیر میں جس طہارت کا ذکر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ اس آیت کے مصداق معصوم ہیں، البتہ ان کا ''محفوظ'' ہونا ثابت ہے۔ ''محفوظ'' اصطلاحاً وہ ہوتا ہے کہ اولاً گناہ نہ کرے اور کبھی کرنا چاہے تو اللہ ایسے حالات پیدا کر دے کہ وہ ارتکاب گناہ نہ کر سکے، یعنی عملاً اس سے گناہ کا امکان نہیں رہے گا۔

گویا نتیجہ یہ نکلا کہ ان سات آیات میں واضح طور پر دو مختلف گروہوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ایک جماعت وہ ہے کہ ان کے ساتھ بہت نرمی برتی جائے، تو اگر گنہگار نہیں تب بھی ان میں امکان گناہ باقی رہتا ہے، اور دوسری جماعت وہ ہے کہ ان کے معاملے میں بہت سختی کی جائے تو وہ معصوم نہیں تو کم از کم محفوظ قرار پاتے ہیں۔ یہ دونوں صفات ایک جماعت میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ ماننا پڑتا ہے کہ ازواج اور ہیں اور اہل بیتؑ اور ہیں۔

کیا ارادہ تطہیر مستقبل کے لئے ہے؟

اس مرحلے پر ایک اور بات کہی گئی کہ درحقیقت معصوم نہ ہونے اور محفوظ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ کوئی ذات معصوم ہوگی تو ساری زندگی اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا ہوگا، جب کہ محفوظ ذات وہ ہے جسے محفوظ بنانے کے بعد ہر برائی سے بچا لیا جائے گا۔ یعنی جب تک آیۂ تطہیر نازل نہیں ہوئی تھی اس وقت تک ارتکاب گناہ ہوا ہوگا لیکن نزولِ آیت کے بعد ازواج محفوظ ہو گئیں۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کے تحت برادرانِ اہلسنت نے آیۂ تطہیر کا ترجمہ یوں کیا کہ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر برائی کو دور کر دے اور تمہیں اس طرح پاک کر دے جیسے پاک کرنے کا حق ہے جبکہ علمائے مسلک اہل بیتؑ نے کہا کہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہر برائی سے دور رکھے اور تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے۔ کر دے اور رکھے کا فرق صاف ظاہر ہے۔ جب کر دے کہا گیا تو مطلب یہ تھا کہ پہلے پاک نہیں تھے اب پاک کیئے جائیں گے اور پاک رکھے کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیشہ سے پاک و پاکیزہ ہیں۔

تو اس استدلال کے بارے میں خود زیرِ بحث آیات جواب دے رہی ہیں جب یہ کہا گیا کہ تمہاری کوتاہیوں کا عذاب دوگنا ہوگا۔ تو ایک طرف تو یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ

تمہیں اب محفوظ بنا دیا گیا۔ اب تم سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا اور اس کے ساتھ یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے گناہ کیا تو سزا دوگنی ہوگی۔ محفوظ ہو جانے کے بعد گناہ ہوگا ہی کب کہ دوگنے عذاب سے ڈرایا جائے چنانچہ پھر ماننا پڑے گا کہ آیۂ تطہیر میں بیان ہونے والی طہارت کا مطلب صرف گناہوں سے محفوظ ہونا لیئے جانے کے باوجود، اور اللہ کے وعدۂ طہارت کو نزول آیت کے بعد عملی جامہ پہننے کے مفہوم کو قبول کر لینے کے باوجود، وہ جو ہر گناہ سے محفوظ ہیں وہ کوئی اور ہیں اور وہ جن کو دوگنے عذاب سے خبردار کیا جا رہا ہے وہ اور ہیں۔

سورۂ تحریم اور آیت تطہیر

اگر سورہ احزاب کی ۲۸ ویں آیت سے ۳۴ ویں آیت تک کی ساری گفتگو کا موضوع ایک ہی جماعت کو مان لیا جائے تو صرف یہی مسئلہ نہیں کہ آیت تطہیر اور دوگنے عذاب کے ارشاد کی آیتوں میں تضاد ہو جائے گا، بلکہ قرآن مجید کے اور ارشادت بھی آیت تطہیر سے متصادم ہو جائیں گے۔ یہاں یہ سمجھ کر کہ آیۂ تطہیر کے اعلان کے بعد ازواج نافرمانی اور گناہ سے محفوظ ہو چکی ہیں، جب ہم قرآن حکیم کی چھیاسٹھویں (۶۶) سورہ، سورہ تحریم پر پہنچے، تو اس کی چوتھی آیت میں اسی جماعت ازواج کی کسی دو افراد کے لیئے ارشاد ہوا:

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَ اِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ

''تم دونوں توبہ کرو۔ تمہارے دونوں کے دل ٹیڑھے ہو گئے ہیں اور تم دونوں ایک دوسرے کی (ان برائیوں میں) مددگار رہیں تو (تمہارے خلاف اپنے رسولؐ کی مدد

کے لئے) خود اللہ اپنے رسولؐ کا دوست ہے اور جبریل بھی مددگار ہے اور وہ بھی جو مؤمنین میں صالح فرد ہے۔'' اس آیت میں تو فقط دو خواتین کے لئے کہا گیا کہ ان کے دل ٹیڑھے ہوگئے ہیں لیکن اگلی آیت میں اس ٹیڑھے پن کی مکمل تفصیل بیان کر دی گئی۔ ارشاد ہوا:

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا﴾۔

''اور اللہ کے لئے یہ بالکل دشوار نہیں کہ اگر رسولؐ تمہیں طلاق دے دیں تو تمہارے بدلے میں اللہ اپنے حبیبؐ کو تم سے بہتر ایسی سابقہ شادی شدہ یا بن بیاہی بیویاں دے گا کہ وہ مسلمان ہوں گی، وہ مؤمنہ ہوں گی، فرمانبرداری کرنے والی ہوں گی توبہ کرنے والی ہونگی، عبادت کرنے والی ہونگی، روزہ رکھنے والی ہونگی۔'' اب میں غیر ضروری تشریحات میں نہیں جاؤں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ اس ارشاد کے بعد اللہ اپنے رسولؐ کو تم سے بہتر بیویاں عطا کر سکتا ہے۔ فوراً جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تمام ان ازواج میں نہیں تھیں، جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔

دونوں آیات کے ساتھ پھر آیۂ تطہیر کی طرف آیئے۔ وہاں دو اعلان تھے۔ آپ کے ترجمہ کے مطابق ایک وعدہ تھا کہ ہر برائی کو دور کر دیا جائے گا، تو یہ کیسی برائی دور ہوئی کہ دل ٹیڑھے ہوگئے، اور وہاں وعدہ تھا کہ اس طرح پاک کروں گا جیسے پاک کرنے کا حق ہے، تو یہ کیسی کامل پاکیزگی تھی کہ اس کے بعد بھی ان سے اچھی مسلمات مؤمنہ، اطاعت رسولؐ کرنے والی، توبہ کرنے والی عبادت گزار روزہ دار موجود ہوں۔

پھر ماننا پڑے گا کہ جن کے دل ٹیڑھے ہو جائیں وہ اور شخصیتیں ہیں اور جن

سے ہر برائی کو دور رکھا گیا ہے وہ اور شخصیتیں ہیں۔

تاریخ اور آیت تطہیر

اب میں نہیں سمجھتا کہ قرآن کے ان واضح ارشادات کے بعد بھی کوئی آیۂ تطہیر کے اہل بیتؑ کو اور اس سے متصل آیات کی ازواج کو ایک ہی جماعت قرار دے سکتا ہے لیکن ممکن ہے عقل بہانہ ساز یہ کہہ لے کہ ممکن ہے سورہ تحریم پہلے نازل ہوئی ہو اور آیت تطہیر کا وعدۂ تطہیر بعد میں کیا گیا ہو۔ تو جب پہلے اور بعد کی بحث ہوگی تو ہمیں تاریخ سے مدد لینی پڑے گی.... اب اس بات کے لئے تو کسی کتاب کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے کہ آیت تطہیر خواہ کسی تاریخ کو نازل ہوئی ہو لیکن بہرصورت حیات نبویؐ میں نازل ہوئی۔ اب اگر حیات پیغمبرؐ میں کچھ برائیوں کی نشاندہی کر کے ایک گروہ سے آئندہ برائیوں کو دور رکھنے کا وعدہ کر لیا گیا تو بعد رسولؐ، اس گروہ کا کوئی فرد کم از کم ان برائیوں کا ارتکاب نہیں کرے گا جن کا ذکر ان آیات میں ہے.... اب جن باتوں سے روکا گیا ہے ان میں ایک بات یہ ہے۔

﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ﴾۔ (سورۂ احزاب، آیت: ۳۳)

اس جزو کا ترجمہ جناب عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر میں یوں کیا کہ ''اے ازواج رسولؐ تم شرعی اور ذاتی ضرورتوں کے علاوہ اپنے گھروں میں قیام کرنا'' شرعی اور ذاتی ضرورتوں میں باہر نکلنے کی اجازت آیت کے کس جزو سے اخذ کی گئی ہے؟.... اور پھر اگر شرعی اور ذاتی ضرورتوں سے نکلنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر کون سا نکلنا باقی رہ جاتا ہے جس پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ جب شرعی ضرورت کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت ہے تو کیا صرف غیر شرعی کاموں کے لئے نہ نکلنا جائز ہوگا؟ اور یہ تو وہ پابندی

ہے جو اسلام میں ہر عورت مرد پر عائد ہے۔ کیا عام مسلمانوں کا غیر شرعی کاموں کے لئے گھر سے نکلنا جائز تھا جو صرف ازواج کو روکا جا رہا تھا خیر اس بحث کو بھی چھوڑیے۔ مان لیجیے کہ سوائے شرعی اور ذاتی ضرورتوں کے، ازواج نبیؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ گھروں میں رہیں۔ اب اگر اس فرمان کے نازل ہونے کے بہت بعد، عہد رسالتؐ کے بعد بھی کوئی زوجۂ رسولؐ قصاص خلیفہ کے لئے گھر سے باہر نکلے، تو اس اقدام کو فقہ کے کس قاعدے سے شرعی ضرورت قرار دیا جائے گا۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں ایک پورے بابا کا بڑا حصہ اس موضوع پر لکھا ہے (خلافت وملوکیت صفحات ۳۳۵ تا ۳۴۶) اور بہت سے جید علماء کے فتوؤں اور فرمودات کے حوالے دے کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جن حضرات نے بھی قاتلین عثمان سے بدلہ لینے کے نام پر خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی ان کا یہ فعل شرعی حیثیت سے درست نہیں تھا (صفحہ ۳۴۳)۔ کیونکہ خلیفۂ برحق کے خلاف خروج بھی خلاف شرع تھا اور اموی مقتول خلیفہ کے وارثوں کی موجودگی میں، بنوتیم کی ایک بیٹی کا قصاص طلب کرنا بھی غیر شرعی تھا۔ رہ گئی ذاتی اغراض سے باہر نکلنے کی اجازت، تو کسی عزیز قریب کی شادی بیاہ میں شرکت ذاتی ضرورت ہو سکتی ہے، علاج معالجے کے لئے طبیب تک جانا ذاتی ضرورت ہو سکتی ہے، معاش اور وسائل رزق کے حصول کو ذاتی ضرورت کہا جا سکتا ہے لیکن فوجوں کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ جانا، اور مکہ سے بہت دور بصرہ میں پہنچ جانا کسی بھی پیمانے سے ذاتی ضرورت نہیں کہا جا سکتا۔

اب آیہ تطہیر کی طہارت کے تقاضے تو بہت بلند تھے۔ شبیر احمد عثمانی نے ان تقاضوں کو نرم کر کے ''معصوم'' سے ''محفوظ'' کر دیا۔ محفوظ کا مطلب تو تمام برائیوں سے بچنا تھا، لیکن میں نے جسارت کی کہ وعدہ حفاظت کو صرف ان برائیوں تک محدود کر دیا جن

سے ان آیات میں روکا گیا ہے، ان ہی سے محفوظ رہیں۔ عبدالماجد دریا بادی نے، گنتی کی ان چند پابندیوں کو اور نرم کر دیا کہ گھر میں رہنے کا حکم تو تھا، لیکن شرعی اور ذاتی ضرورتوں سے نکلنے کی اجازت تھی۔ اب آیت تطہیر کے معیار طہارت میں اتنی رعایتوں، اتنی نرمیوں، اتنی چھوٹ کے بعد بھی گروہ ازواج اس جزو آیت کے تقاضے نہ پورے کر سکے تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہ جاتی کہ یہ مان لیا جائے کہ ان آیات میں ایک نہیں دو جماعتوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جو اللہ کی نافرمانی سے محفوظ نہ رہ سکے اور دوسرے وہ جن کی ہر گناہ سے پاکیزگی کی ضمانت آیت تطہیر نے دی ہے۔

اہل بیتؑ میں آنحضرتؐ شامل ہیں

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا۔ وہ اس معنی اور مفہوم کے حوالے سے تھا جو لوگ لیتے ہیں، جو آیۂ تطہیر کی طہارت میں ازواج رسول کو شامل سمجھتے ہیں، جو لوگ اس طہارت مطلقہ سے صرف محفوظ ہونا مراد لیتے ہیں، جو لوگ اس طہارت کا مطلب عصمت نہیں کرتے، جب محفوظ کے کم تر درجہ پر ہی دائرہ اہل بیتؑ میں ازواج کی شمولیت دشوار ہو جاتی ہے تو عصمت کے بلند درجہ پر وہ اس آیت کی مصداق کیسے بن سکیں گی چنانچہ اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ طہارت کے معنی پر گفتگو کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ آیۂ تطہیر کی طہارت کا درجہ کیا ہے۔ اس لئے مزید تفصیل سے بچتے ہوئے صرف ایک اشارہ کر دوں۔

سورۂ احزاب کی زیر بحث سات آیات میں سارا خطاب ازواج رسولؐ سے ہے چنانچہ ان آیات میں جن خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سب کا تعلق ازواج رسولؐ سے ہے۔ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان باتوں میں شامل

نہیں ہیں۔ لیکن آیت تطہیر میں خطاب ازواج سے نہیں بلکہ اہل بیتؑ سے ہے۔ اور جب اہل بیتؑ کا ذکر ہوگا، تو اس پر تو بحث ہوسکتی ہے کہ اس میں ازواج شامل ہیں یا نہیں، اس میں علیؑ و فاطمہؑ و حسنینؑ شامل ہیں یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ اس جماعت اہل بیتؑ میں خود جناب رسالت مآبؐ لازماً شامل ہیں اور جب حضورؐ اہل بیتؑ کے فرد اول ہیں، جزو لازم ہیں، تو اب آیۂ تطہیر میں جس طہارت کا ذکر کیا گیا ہے وہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طہارت ہے۔ یعنی اہل بیتؑ کو پاک و پاکیزہ رکھنے کے لئے اور ان سے ہر برائی کو دور رکھنے کے لئے اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا پہلا اطلاق خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوتا ہے۔ پھر ان سب پر ہوتا ہے جو حضورؐ کے ساتھ اہل بیتؑ میں شامل ہیں۔ اب آپ اپنے عقیدے، اپنے شعور، اور اپنے تصور نبوت کے حوالے سے خود فیصلہ کر لیجیے کہ آیۂ تطہیر میں جس طہارت کا ذکر ہے وہ ایسی طہارت ہے جیسی آپ حضورؐ کے لئے قرار دیتے ہیں۔ اگر نعوذ باللہ وہ صرف گناہوں سے محفوظ ہیں، معصوم نہیں ہیں تو باقی اہل بیتؑ بھی محفوظ ہوں گے، معصوم نہ ہوں گے۔ اور اگر آپ حضورؐ کو ہر برائی، ہر خطا، ہر بھول چوک سے معصوم مانتے ہیں تو اہل بیتؑ کے باقی افراد بھی ویسے بھی معصوم ہوں گے۔ اور اگر حضورؐ نعوذ باللہ پہلے پاک نہیں تھے، آپؐ کو آیۂ تطہیر کے نازل ہونے کے بعد پاک کیا گیا، تو باقی اہل بیتؑ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہوگا۔ اور اگر حضورؐ کے بارے میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ کو پاک کیا نہیں گیا بلکہ پاک رکھا گیا، تو باقی اہل بیتؑ بھی پاک کیے نہیں جائیں گے بلکہ پاک رکھے جائیں گے۔

اور جب آیۂ تطہیر کی پاکیزگی کا معیار ذات رسالتؐ ٹھہرے تو پھر خود فیصلہ کر لیجیے کہ ازواج اس معیار پر کیسے پوری اتریں گی۔ چنانچہ پھر وہی نتیجہ نکلے گا کہ آیۂ تطہیر میں جن اہل بیتؑ کا ذکر ہے وہ الگ گروہ ہے اور باقی آیت میں جن ازواج کا تذکرہ ہے وہ

الگ جماعت ہے۔

اندازِ بیان کا فرق

ہم نے سورۂ احزاب کی سات آیات کے معنی و مفہوم کے حوالے سے دیکھ لیا کہ ان آیات میں دو مختلف کرداروں کا تذکرہ ہے۔ لیکن اللہ نے آیت تطہیر کو اس کے سیاق و سباق سے صرف معنی کے اعتبار سے ہی جداگانہ حیثیت نہیں دی بلکہ انداز بیان، انتخاب الفاظ اور لب و لہجے کے اعتبار سے بھی ایک الگ مقام دیا ہے۔ معنی کے حوالے سے بات ہو چکی۔ اب ذرا صورت کے اعتبار سے، آیات کی ساخت کے اعتبار سے بھی اس آیت کی انفرادیت پر نظر ڈال لیں۔

تذکیر و تانیث کا فرق

اس عنوان سے ان آیات میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ ان میں گفتگو ازواج سے ہو رہی تھی تو تمام مقامات پر تانیث کے صیغے استعمال ہوئے۔ آیات کے افعال دیکھیے۔ ''قرن'' تم عورتیں ٹھہری رہو۔ ''بیوتکن'' تم عورتوں کے گھر۔ ''واذکرن'' تم عورتیں یاد کرو۔ غرض جتنی جگہ بھی ازواج سے کلام کیا گیا ہے۔ صیغہ مؤنث کا استعمال ہوا ہے لیکن سات آیتوں میں فقط وہ ٹکڑا، کہ جسے آیہ تطہیر کہتے ہیں، اس میں اچانک طرز تخاطب بدل جاتا ہے اور اب صیغہ تانیث کی بجائے تذکیر استعمال ہونے لگتا ہے۔ ''عنکم'' تم مردوں کو۔ ''ویطھرکم'' تم مردوں کو پاک رکھے۔ اب قاعدہ یہ ہے کہ جب صیغہ مؤنث استعمال ہو تو مخاطب عورتیں ہوں گی، البتہ امکان ہے کہ کچھ مرد بھی شامل ہو جائیں، لیکن وہ بہت کم تعداد میں ہوں گے۔ اسی طرح جب صیغہ مذکر استعمال ہو تو

خطاب مردوں سے ہوگا، البتہ مردوں کے ساتھ اس گروہ میں ایک دو عورتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ یہی فرق بتاتا ہے کہ جن تمام آیات میں صیغہ مؤنث استعمال ہوا ان میں اس جماعت سے گفتگو ہے جو تمام تر یا زیادہ تر خواتین پر مشتمل ہے اور جب صیغہ تبدیل ہو کر مذکر ہو گیا تو اب اس جماعت سے گفتگو ہے جو تمام تر یا زیادہ تر مرد ہیں۔

اس دلیل کا ایک جواب دیا گیا اور وہ یہ تھا کہ آیت تطہیر میں جو صیغہ مذکر استعمال ہوا ہے وہ اس لئے نہیں کہ مخاطب بدل گئے تھے، بلکہ اس لئے کہ اس سے پہلے نساء النبی کہہ کر خطاب ہو رہا تھا، اور نساء کا لفظ مؤنث تھا اس لئے صیغے بھی مؤنث تھے لیکن آیہ تطہیر میں نساء النبی کی جگہ اہل بیت کہہ کر خطاب کیا گیا اور اھل کا لفظ مذکر تھا اس لئے صیغے بھی مذکر ہو گئے۔

دلیل معقول ہے۔ لیکن پہلی بات تو یہ کہ خواہ گرامر کی ضرورت ہو، خواہ زبان کا تقاضہ ہو، بہرحال صورت میں ماننا پڑے گا کہ آیہ تطہیر میں انداز بیان اور ہے اور باقی آیات میں طرز گفتگو اور ہے۔ جب یہ کلام حکیم خدا کا ہے تو تسلیم کرنا ہوگا کہ انداز بیان بدلا ہے تو اس کی مصلحت بھی ہوگی۔ اور یہ مصلحت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ صیغوں کی تبدیلی کے ساتھ قاری متوجہ ہو جائے کہ پہلے گفتگو کسی اور سے ہو رہی تھی، اب کسی اور سے ہو رہی ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ اہم بات، اٹھائیسویں آیت میں جب کلام کا آغاز ہوا تو ارشاد ہوا: ﴿یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ﴾ اے رسولؐ آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے۔ اب اس ارشاد کے بعد جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی مخاطب چونکہ ازواج ہیں اس لئے خطاب کا صیغہ مؤنث ہونا چاہیئے۔ پھر تیسویں اور بتیسویں آیت میں یٰنساء النبی کہہ کر خطاب کیا گیا تو اب اس خطاب کے بعد جب تک نساء النبی سے بات ہوگی تو وہ اس

خطاب یعنی نساء النبی کے تحت، صیغۂ مؤنث میں ہوگی چنانچہ تینتیسویں آیت میں جس کا ایک جزو آیۂ تطہیر بھی ہے، جب بات شروع کی گئی تو کوئی خطابیہ لفظ نہیں ہے، اس کے باوجود شروع کے تمام صیغے مؤنث ہیں۔ اور یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جب تیسویں آیت میں ''یانساء النبی'' کہہ کر مخاطب کا تعین کر دیا گیا تو ۳۳ ویں آیت میں کوئی خطاب نہ ہوتے ہوئے بھی قرن، بیوتکن، لا تبرجن، اقمن آتین، اطعن ،غرض جتنے افعال آئے، سب کے سب صیغہ مؤنث میں آئے۔ اب اس کے بعد اسی آیت کے دوسرے ٹکڑے میں خطابیہ الفاظ ''نساء النبی'' سے بدل کر ''اھل البیت'' ہو گئے۔ اب خطاب مذکر سے تھا تو تمام صیغے بھی مذکر ہی استعمال کیئے گئے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی۔ لیکن اس کے بعد چونتیسویں آیت شروع ہوئی۔ اس میں کوئی خطاب نہیں ہے۔ جب کوئی خطاب نہیں ہے، تو اس گفتگو کو اس سے پہلے کے خطاب کے تابع ہونا چاہیئے، یعنی جب ''اھل البیت'' کہہ کر گفتگو شروع ہو چکی ہے تو یا تو پھر خطاب بدلے۔ اگر خطاب نہیں بدلتا تو گفتگو صیغہ مذکر میں ہی جاری رہنی چاہیے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ یہاں پھر صیغۂ مؤنث میں گفتگو شروع ہو گئی۔

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾۔

اب اگر تعصّبات کی شدت عقل وفہم پر مہر نہ لگا دے تو انصاف یہی کہے گا کہ تیسویں آیت کا خطاب ''یانساء النبی'' ۳۳ ویں آیت کے ابتدائی حصہ پر نافذ ہو سکتا ہے تو ۳۳ ویں آیت کا خطاب ''اھل البیت'' ۳۴ ویں آیت پر کیوں نافذ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی کہ ان سات آیات کے مخاطب و موضوع اور شخصیتیں ہیں اور آیہ تطہیر کی مخاطب و موضوع اور شخصیتیں ہیں۔

خطاب کا فرق

ضمناً اس بات پر بھی متوجہ کر دوں کہ تمام زیر بحث آیات کا انداز خطابیہ ہے۔ مخاطب کر کر کے کلام کیا گیا ہے، پکار پکار کر، متوجہ کر کے بات کی گئی ہے۔ لیکن توجہ دلانے کے لئے ایک ہی خطاب استعمال ہوا ''یا نساء النبی'' لیکن صرف آیۂ تطہیر میں خطاب بدل کر ''اھل البیت'' ہو گیا جب خطاب بدلا تو کیوں نہ کہا جائے کہ مخاطب بھی بدل گئے۔

اہل بیت اور بیوت کا فرق

اور قرآن کے حسن بیان پر بے ساختہ سبحان اللہ کہنا پڑتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دو تذکروں کو ایک ساتھ رکھتے ہوئے، ایک ذکر کو دوسرے ذکر سے الگ رکھنے کے لئے کیا کیا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک تفصیلی گفتگو میں فقط ایک جملے میں کچھ مختلف شخصیتوں کا تذکرہ ہے۔ تو اس ایک جملے کو باقی عبارت سے کیسے کیسے الگ کیا گیا۔ معنویت میں فرق، صیغوں میں فرق، خطاب میں فرق، صرف یہی کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک ہی لفظ اور دو جگہ باقی آیات میں... اور باقی آیات میں بھی کہیں دور نہیں۔ ایک مرتبہ ۳۳ ویں آیت میں آیت تطہیر سے فوراً پہلے، اور دوسری جگہ ۳۴ ویں آیت میں، آیت تطہیر کے فوراً بعد، لیکن اہتمام ملاحظہ ہو کہ آیت تطہیر سے پہلے کہا ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ﴾ تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ آیت تطہیر کے بعد کہا: ﴿وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِكُنَّ﴾ اسے یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھا جاتا ہے، اور ان دونوں ''بیوتکن'' کے درمیان آیۂ تطہیر میں یہی گھر کا تذکرہ آیا تو یہ کہہ کر کہ ﴿عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ﴾ اے ایک خاص گھر کے رہنے والو تم سے ہر برائی کو دور رکھا گیا ہے۔ ازواج کے لئے بیوت، جو اہل ہیں ان کے

ہے بیت۔ ازواج کے گھروں میں کن کی ضمیر یعنی تمہارے گھر، اہل کے لئے اہل کا بیت۔ یعنی جتنی ازواج اتنے گھر وہاں ہر بی بی کا الگ الگ گھر۔ یہاں تمام اہل بیتؑ کا ایک گھر۔ اتنے واضح فرق کے بعد بھی کوئی اصرار کرے کہ آیۂ تطہیر بھی انہیں کے لئے ہے جن کا تذکرہ باقی آیات میں ہے تو اس کے علاوہ کیا کہا جائے کہ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ اللہ نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں۔

میں بیوتکن اور البیت کے فرق پر کچھ اور باتیں بھی گوش گزار کرنا چاہوں گا، لیکن اس گفتگو کو کسی اور دن کے لئے اٹھا رکھتا ہوں، اس وقت تو صرف یہی واضح کرنا چاہتا تھا کہ اللہ نے اہل بیتؑ کے تذکرے کو ازواج کے تذکرے کے ساتھ ساتھ رکھا ہے تو اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ دونوں تذکرے ایک دوسرے میں مخلوط نہ ہونے پائیں۔ ازواج الگ رہیں۔ اہل بیتؑ کی شان الگ رہے۔ اللہ کے اس پورے انتظام کے باوجود اب بھی کوئی نہ مانے تو اس کی مرضی، کیونکہ سوتے ہوئے کو جگایا جا سکتا ہے۔ جو جان بوجھ کر سوتا بنا رہے اسے جگانا ناممکن ہے۔ سمجھنے والوں کے لئے تو اللہ نے پورا اہتمام کر دیا ہے لیکن سمجھنے سے انکار کرنے والوں کا کوئی علاج نہیں۔ کوئی حق سے انکار کرے گا تو اس لئے نہیں کہ حق ظاہر نہیں تھا بلکہ اس لئے انکار کرے گا کہ وہ حق کو ماننا نہیں چاہتا۔ اگر دلیل کی مضبوطی، حق کا مبین ہونا، خود بخود لوگوں کو تسلیم کر لینے پر آمادہ کر سکتا تو ابوجہل حالت کفر میں نہ مرتا۔ ابولہب قرآن کی سرزنش کے باوجود گمراہ نہ رہتا۔ یہ تو ذہن کی کجی ہے۔ حق شناسی کا جذبہ ہے، کہ اویس قرنیؓ رسول کو نہ دیکھیں لیکن ان کا احوال سن کر ایمان لے آئیں اور ابوسفیان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کلمہ پڑھ کر بھی ایمان سے کوسوں دور ہے۔

اگر ہر ماننے والا حق ظاہر ہوتے ہی ایمان لے آتا تو حسین علیہ السلام سے بڑھ کر

کس نے ظاہر کیا تھا۔ حُر کے لشکر سے ملاقات ہوئی تو وہاں آپؑ نے حق ظاہر کیا۔ حر کے پاس امام کے ارشادات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ یہی کہتا رہا کہ میں حاکم کے حکم سے مجبور ہوں اور جب قبولیت حق پر آمادہ ہوا تو اس کے لشکر کے ایک ہزار سپاہیوں میں وہ تنہا تھا جس نے حق کو تسلیم کیا۔ پھر اور بہت سے مواقع سے قطع نظر، روزِ عاشور صبح صبح جنگ سے پہلے، حسین علیہ السلام ناقہ پر سوار ہوئے، لشکر یزید کے سامنے گئے اور وہاں ہزاروں کے اس مجمع سے امام نے سوال کیا بتاؤ میں نے کسی کا خون بہایا ہے؟ کسی کا مال غصب کیا ہے؟ کسی کا حق مارا ہے؟ کوئی اذیت کسی کو پہنچائی ہے ۔ جب جواب میں خاموشی رہی تو امام علیہ السلام نے پوچھا: اگر یہ سب نہیں تو بتاؤ کہ میں نے شریعت کے کسی حرام کو حلال کیا ہے؟ کسی جائز کو ناجائز کیا ہے؟ اللہ کی مقرر کردہ کوئی حد توڑی ہے؟ اس پر بھی خاموشی رہی۔ تو امامؑ نے پوچھا: بتاؤ کیا میرے نانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں اور کیا انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے لئے یہ نہیں کہا کہ یہ جوانانِ جنت کے سردار ہیں؟ اب بھی سکوت رہا تو امامؑ نے آخری سوال کیا: اگر یہ سب نہیں ہے اور اللہ کے رسولؐ اور ان کی دختر سے مجھے جو نسبت ہے وہ بھی تم پر ظاہر ہے اور تم میری فضیلت سے بھی آگاہ ہو تو بتاؤ کہ پھر تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو، کیوں مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر تم نے پانی بند کر رکھا ہے؟ اس کا جواب بھی خاموشی تھی وہ خاموشی جو لاجواب ہو جانے کی وجہ سے ہوتی ہے، جو حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد باطل کی صفوں میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حسین علیہ السلام کا خون بہایا گیا۔

اور حق مسلسل ظاہر تھا۔ کون سا مرحلہ تھا کہ حسینؑ کا برحق ہونا ظاہر نہ ہو۔ یہ تو مصلحت تھی کہ روزِ عاشور بھی آپ نے اتمام حجت کی، ورنہ کون تھا جو حسینؑ کی بے گناہی سے واقف نہ تھا۔ اگر دنیا حسینؑ کی بے گناہ سے واقف نہ ہوتی تو، مدینہ میں، مکہ میں،

کربلا میں، کہیں کوئی تو دلیل، خواہ کتنی ناقص ہوتی، لیکن بیان ضرور ہوتی۔ حسین علیہ السلام عجب مظلوم ہے کہ مدینہ سے مکہ تک، مکہ سے کوفہ تک، کوفہ سے شام تک اور ۶۱ ہجری سے آج تک کسی نے حسین علیہ السلام کا کوئی قصور نہ بتایا۔ کسی نے کوئی الزام نہ لگایا۔ حتیٰ کہ عمر ابن سعد، زیاد ابن ابیہ اور یزید ابن معاویہ بھی حسین علیہ السلام پر کوئی الزام نہ لگا سکے کیا حق اس سے بھی زیادہ ظاہر ہو سکتا ہے؟ کیا سچائی اس سے زیادہ روشن ہو سکتی ہے؟

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۱۵

آیۂ تطہیر کا ربط

گزشتہ بحث میں عرض کیا گیا کہ آیۂ تطہیر جس سلسلۂ کلام کے درمیان میں آئی ہے۔اس پوری گفتگو سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ جزو آیت اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بھی اپنے ماقبل اور مابعد کے تذکرے سے الگ ہے، اور اپنے اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی اپنے ساتھ کی باقی آیات سے بالکل جدا نظر آتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر مضمون اور اپنی ظاہری شکل وصورت دونوں پہلوؤں سے آیت تطہیر ایک جداگانہ چیز ہے، اس میں جن اہل بیتؑ کا تذکرہ ہے وہ تمام کی تمام ازواج رسولؐ سے الگ ہستیاں ہیں، تو پھر یہ ٹکڑا اس تذکرے کے درمیان میں کیوں ہے؟ آخر ازواج کے تذکرے میں، اہل بیتؑ کا ذکر کرکے پھر ازواج کی بات کیوں کی گئی ہے، کیا آیۂ تطہیر اس پورے سلسلۂ کلام میں ایک بے ربط جملہ ہے؟ اگر جملہ بے ربط ہے تو درمیان میں کیوں ہے؟ اور اگر ربط ہے تو کس طرح سے؟ تو آیئے! اب ہم اپنی بساط کے مطابق اس حکمت اور مصلحت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو اس جزو آیت کو وہاں رکھنے کی وجہ ہے، جہاں آج ہمیں نظر آتی ہے۔

آیۂ تطہیر کا جداگانہ نزول

یہاں ایک بات ضمناً کہتا چلوں۔ آیت تطہیر جن آیات کے ساتھ ہے، ضروری نہیں کہ ان ہی کے ساتھ نازل بھی ہوئی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں جتنی بھی روایات ملتی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جملہ بالکل تنہا نازل ہوا۔ بلکہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ جو لوگ اس آیت کو ذکر ازواج قرار دیتے ہیں وہ یہ بات محض اپنی رائے اور قیاس سے کہتے ہیں، کیونکہ خود ان کے ہاں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ آیت تطہیر سورۂ احزاب کی ۲۹ ویں سے ۳۴ ویں آیات کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ دوسری طرف اس ایک جملے کے نازل ہونے کے بارے میں بہت سی روایتیں ہیں، لیکن سب اپنے مفہوم کے اعتبار سے متفق ہیں کہ یہ جملہ بالکل تنہا نازل ہوا۔ ہم حدیث کساء سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی واقعہ اس آیت کی شانِ نزول ہے۔ اور یہ نہیں کہ حدیث کساء صرف ایک مسلک کی کتابوں میں ہے۔ یہ حدیث اور یہی شان نزول اختصار کے ساتھ، شیعہ ماخذوں کے علاوہ، صحاح ستہ کی کتابوں، صحیح مسلم اور صحیح ترمذی میں بھی بیان ہوئی، حاکم نے اپنی مستدرک میں نقل کی، جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور میں تذکرہ کیا، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں درج کی۔ اور صرف ایک راوی سے نہیں، بلکہ مختلف راویوں سے۔ کسی نے حضرت عائشہ سے روایت کی، کسی نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے، کسی نے جابر ابن عبد اللہ انصاریؓ سے، کسی نے عبداللہ ابن جعفر سے۔ غرض بہت سی محترم ہستیوں نے اس آیت کی شان نزول کو بیان کیا۔ اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت، تنہا آیت تطہیر، حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں اس وقت نازل ہوئی جب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک چادر میں اپنے

ساتھ اپنے بھائی علیؑ ابن ابی طالبؑ کو، اپنی صاحبزادی جناب سیدہؑ کو اور اپنے نواسوں حسنین علیہم السلام کو لیٹے ہوئے تھے۔ اس ایک شانِ نزول کے علاوہ کسی کتاب میں، کسی راوی کی بیان کردہ کوئی اور روایت ہے ہی نہیں شانِ نزول کے بارے میں یہ حوالے دینے کا اصل مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آیت تطہیر جن آیات کے درمیان ہے ان کے ساتھ نہیں نازل ہوئی لیکن آج وہ ازواج کے تذکرے میں ہے تو وہاں رکھنے کی یقیناً کوئی خاص مصلحت ہوگی۔ ہم اسی مصلحت کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس شانِ نزول سے ایک واضح نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس آیت کے متعلق خود حضورؐ یہ فرما رہے ہیں کہ اہل بیتؑ سے مراد میرے ساتھ علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہیں۔ ادھر مفسرین کہہ رہے ہیں کہ آیت ازواج کے لئے اتری ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا مسلمان کا کام ہے کہ وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے واضح ارشاد کو قبول کرتا ہے یا مفسرین کی ذاتی رائے کو کہ جس کے ساتھ کوئی سند ہے، نہ کوئی دلیل ہے۔

ذکرِ ازواج میں آیۂ تطہیر رکھنے کی ایک وجہ۔ حفاظت

آیۂ تطہیر کو ازواج کے تذکرے میں رکھے جانے کی ایک وجہ تو مفسرین کے اسی رویہ سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایک طرف مستند حدیثیں کہہ رہی ہیں کہ یہ آیت پنجتن پاکؑ کے لئے نازل ہوئی، امہات المومنین بتا رہی ہیں کہ اہل بیتؑ سے مراد وہ خود نہیں، پنجتنؑ ہیں۔ جید صحابہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس آیت سے ازواج کا کوئی تعلق نہیں اور ادھر ہمارے مفسرین ہیں کہ ہر آواز سے بے پرواہ، ہر سند کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہے جا رہے ہیں کہ آیت تطہیر تو ازواجِ رسولؐ کے لئے نازل ہوئی ہے یعنی اس مختصر سی آیت میں کوئی ایسی بات ہے جسے اہل بیتؑ کے لئے تسلیم کر لیا جانا بہت سے لوگوں کو گوارا نہیں

ہے۔ اب یہاں تذکرۂ ازواج میں آیت آئی تو گویا شان اہل بیتؑ کے منکروں کو ایک سہارا مل گیا۔ انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو ہے ہی ازواج کے متعلق۔ ایسا کہتے ہوئے انہوں نے اقوال رسولؐ کو نظر انداز کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ تو یہاں تو ازواج کا سہارا مل گیا تھا۔ اس پر بھی اقوال رسولؐ کو رد کر دیا گیا۔ اگر یہ آیت یہاں کی بجائے کہیں اور ہوتی، اور منکر کے لئے راہ فرار نہ ہوتی، تو وہ آج حدیث کا انکار کر رہا ہے، اس صورت میں قرآن کا انکار کر دیتا۔

ہمیں یہ بات تجربے نے بتائی کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو آیہ تطہیر کو اس کے اصل مصداق سے ہٹانے کے لئے بہت سی احادیث رسولؐ سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن اللہ علیم وخبیر ہے۔ وہ نزول آیت سے پہلے جانتا ہے کہ اس آیت پر مختلف لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ ایک طرف اس کی ربوبیت کا تقاضہ تھا کہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے قرآن نازل کرے۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ان ہستیوں کے عمل اور قول کے برحق ہونے کی ضمانت بھی دے دے جن کا ہر عمل قرآن کی تفسیر ہے، جن کی معرفت کے بغیر اسلام کی معرفت ممکن ہی نہیں تھی۔ اور اللہ یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ لوگ اسلام کو تو قبول کر لیں گے لیکن ان ہستیوں سے دور بھاگیں گے۔ اب اگر مقام اہل بیتؑ کا تعارف نہ کرایا جائے تو انسان کی ہدایت مکمل نہیں ہوتی۔ اور اگر مقام اہل بیتؑ کو واضح کر دیا جائے تو اہل بیتؑ دشمنوں کی دشمنی انہیں قرآن سے انکار کرنے اور آیہ تطہیر میں تحریف کرنے پر آمادہ کر دے گی۔ اس لئے ایک ایسا راستہ اختیار کیا گیا کہ قرآن بھی محفوظ رہے اور مقام اہل بیتؑ بھی واضح ہو جائے۔ چنانچہ آیہ تطہیر کو الگ نازل کر کے، آیت کی مصداق شخصیتوں کا تعارف کرا کے، اسے ازواج کے تذکرے میں اس انداز سے رکھ دیا گیا کہ دشمن اسے ذکر ازواج سمجھ کر قرآن میں ردوبدل کے خیال سے دستبردار ہو جائے اور جب اہل نظر ان آیات پر

نظر ڈالیں تو انہیں بخوبی نظر آ جائے کہ ازواج اور ہیں اور اہل بیتؑ اور ہیں۔

دوسری وجہ۔اھل البیت کے معنی کا تعین

آیت تطہیر کو اپنے موجودہ سیاق وسباق میں رکھنے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ موجودہ صورت حال کے علاوہ لفظ اھل البیت کے معنی اور مفہوم سمجھنے میں بہت سی غلط فہمیوں کا امکان تھا۔۔۔

اہل بیت، عربی زبان میں کوئی اجنبی لفظ نہیں تھا۔ یہ ترکیب بہت کثرت سے رائج تھی۔ اور ایک عربی کیا، تقریباً ہر زبان میں اس لفظ کا رواج تھا۔ ہم اردو میں بھی گھر والے کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ فارسی والے بھی اہل خانہ اور خانوادہ کے الفاظ بولتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب بھی اور جس زبان میں بھی یہ لفظ استعمال کریں تو اس سے مراد، صاحب خانہ، اس کی بیوی یا بیویاں اور اس کی اولاد ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آیت تطہیر میں اھل بیت کے لفظ میں، بیت سے پہلے ال شامل کر کے ایک خاص گھر کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے معنی میں یہ فرق ضرور پڑ جائے گا کہ اب اھل بیت سے مراد، ہر گھر کے رہنے والے نہیں ہوں گے۔ بلکہ صرف ایک خاص گھر کے رہنے والے اس طہارت کے حامل ہوں گے جس کا اعلان آیۂ تطہیر میں کیا گیا ہے۔ اب وہ خاص گھر کون سا ہے؟ تو ظاہر ہے کہ وہ گھر نبیؐ کے گھر کے علاوہ اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اور جب نبیؐ کے گھر والوں کا ذکر ہوگا تو اس میں ازواج النبیؐ لازماً شامل ہوں گی۔ کیونکہ خود قرآن میں یہی لفظ، اسی طرح ال کے ساتھ، گیارہویں سورہ، سورہ ھود میں استعمال ہوا ہے اور وہاں لازمی طور پر زوجہ اھل بیت میں شامل ہے موقع یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر کچھ فرشتے آتے ہیں، اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی

زوجہ سارہ کو ایک بیٹے، اسحاقؑ، کی ولادت کی بشارت دے رہے ہیں، اور یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اسحاقؑ کو ایک فرزند یعقوبؑ بھی دیا جائے گا۔ اس پر حضرت سارہ کو ہنسی آجاتی ہے اور کہتی ہیں کہ اب بھلا ہمارے ہاں اولاد کہاں۔ میں بھی بوڑھی، میرا شوہر بھی ضعیف، یہ تو تم لوگ عجیب وغریب بات کر رہے ہو اس پر فرشتے جواب دیتے ہیں:

﴿قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ﴾۔ (سورۂ ھود، آیت: ۷۳)

''تمہیں اللہ کے حکم پر حیرت کیوں ہے۔ اے اہل بیت تم پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہیں۔ بے شک اللہ حمید اور مجید ہے۔'' اب یہاں جن اہل بیت پر اللہ کی رحمت اور برکت ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ جناب سارہ شامل ہیں۔ چنانچہ اہل بیتؑ کے لفظ میں تو ازواج شامل ہی تھیں، لیکن ال لگا کر بیت کو مخصوص بھی کر دیا جائے، اور یہ خاص گھر خود نبیؐ کا گھر ہو تو اس اہل بیت میں بھی ازواج شامل ہوں گی۔

اب آیئے آیۂ تطہیر کی طرف۔ یہاں ایک جماعت ہے جس کی مثالی پاکیزگی کا اعلان ہو رہا ہے۔ ایسی پاکیزگی جس میں رجس کا، گناہ کا، خطا کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ایسے پاکیزہ افراد کے گروہ کو اللہ کسی وجہ سے اہل بیت کا خطاب دے رہا ہے۔ بیت سے پہلے ال موجود ہے جس سے پتہ چل رہا ہے کہ یہ کسی خاص گھر کی طرف اشارہ ہے، لیکن وہ کون سا گھر جس گھر کے تمام افراد سے ہر برائی کو دور رکھا گیا ہے۔ اللہ نے اعلانِ طہارت اپنے حبیبؐ کے پاس بھیجا ہے۔ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خبر کو ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ اب یا تو خبر پاتے ہوئے ہماری نظریں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جمی ہوں، اور ہم دیکھ لیں کہ وہ آیۂ تطہیر پڑھتے ہوئے کسی گھر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن اگر ہم نے نہیں دیکھا تو بغیر اشارے کے قیامت تک نہیں جان سکتے کہ یہ کون سا گھر ہے۔ بہت سمجھیں

گے تو یہی کہ یہاں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر مراد ہے۔ اور اگر یہ رسول اللہ کا گھر ہے تو آیت سے بالکل درست طور پر ازواج مراد لی جائیں گی۔ لیکن اللہ نہیں چاہتا کہ اھل البیت سے ازواج مراد لی جائیں۔ تو اب واحد طریقہ یہی ہے کہ آیت کو یونہی نہ رہنے دیا جائے، بلکہ اھل البیتؑ کہتے ہوئے، بیت کی طرف اشارہ بھی کیا جائے، اور یہ اشارہ صرف ایک مرتبہ نہ ہو بلکہ ایسا اشارہ ہو کہ جب تک آیت تطہیر رہے اس وقت تک اشارہ بھی ساتھ رہے۔ چنانچہ حکمت الٰہی نے حکم دیا اور اللہ کے رسولؐ نے اس آیت کو سورۂ احزاب میں ایک ایسی جگہ رکھوا دیا، جہاں پہلے ازواج رسولؐ کی کچھ کوتاہیوں کا بیان کیا گیا تھا یہ کوتاہیاں حقیقتاً موجود نہ بھی ہوں تو ان کا امکان تو تھا۔ اور یہ امکان ہی ازواج کو ﴿لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ﴾ اور ﴿يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ کی کمال طہارت سے باہر کر رہا تھا۔ لیکن اس اشارے کو بھی کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ایک واضح تر اشارہ اس طرح کیا گیا کہ اھل بیتؑ کہنے سے پہلے، ایک خاص گھر کا ذکر کرنے سے پہلے، یہ بتایا گیا کہ رسولؐ کی ازواج کے اپنے گھر تھے۔ ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ پھر اہل بیت کی بات کی گئی۔ اور اس کے بعد پھر ازواج کے گھروں کا تذکرہ کیا گیا۔ ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ جو کچھ تمہارے گھروں میں پڑھا جاتا ہے اسے یاد کیا کرو۔

میں سوال کروں گا کہ ازواج کے یہ کون سے گھر تھے جن کا حوالہ دیا جا رہا ہے گھر کا مالک تو مرد ہوتا ہے۔ یہ رسولؐ کا گھر تھا اور تمام ازواج حضورؐ سے عقد ہونے کے بعد اس گھر میں آئی تھیں اور آنے کے بعد بھی گھر کی مستقل مالک نہیں بن گئی تھیں بلکہ اس سلسلے کی پہلی ہی آیت میں کہا جا چکا تھا کہ ''اے رسولؐ کی بیویو! اگر تمہیں دنیا کی دلچسپیاں عزیز ہیں تو آؤ تمہیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جائے۔'' گویا ازواج کا کسی گھر کا مالک ہونا تو دور رہا، انہیں رسولؐ کے گھر میں رہنے کی اجازت بھی اسی وقت حاصل تھی

جب تک رسولؐ پسند فرمائیں ... چنانچہ ازواج کا کوئی گھر تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو رسولؐ کا وہ ایک گھر جس میں ازواج کو منشائے رسالتؐ کے مطابق رہنے کی اجازت تھی۔ رسولؐ کے اس ایک گھر کی بجائے، تمام بیویوں کو الگ الگ گھر دے دیا گیا۔ آخر یہ عجیب اہتمام کیوں؟ تو آیت تطہیر زبان حال سے جواب دے گی کہ ابھی اھل البیت کی طہارت کا ذکر ہونے والا ہے، اور عام طور پر اھل البیت میں ازواج شامل ہوتی ہیں، لیکن اللہ انہیں البیت سے الگ رکھنا چاہتا ہے، تو یہ اسی وقت ممکن تھا کہ پہلے ہر زوجہ کو ایک ایک گھر دے کر الگ کر دیا جائے تاکہ اب جب ایک خاص گھر ''البیت'' کی بات ہو تو کوئی زوجہ اس میں اپنا حصہ نہ مانگنے آجائے۔

میں تمثیل کے لہجے میں بات کروں تو صورت کچھ یوں ہے کہ پہلے ہر زوجہ کے نام ایک ایک گھر لکھ دیا گیا۔ پھر یہ کہہ دیا گیا کہ تم اپنے گھر والی ہو، اپنے گھر کے اندر بیٹھو۔ پھر ان کو ایک مشغلہ بھی بتا دیا گیا کہ ان باتوں کو یاد کرتی رہا کرو جو تمہارے گھر میں ہوتی ہیں، اس کے بعد ﴿وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ کا تالا لگا کر تمام ازواج کو ان کے گھروں میں مقید کر دیا گیا۔ تب ایک، صرف ایک خاص گھر کی بات کی گئی کہ اے اس خاص گھر کے رہنے والو! خدا تمہاری طہارت کی ضمانت دیتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب مجھے یہ کہنے کا حق دیجیے کہ اگر آیت تطہیر ازواج کے تذکرے کے ساتھ نہ ہوتی تو اس آیت سے ازواج کو الگ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ اسے اس تذکرہ میں اس لئے ہی رکھا گیا کہ یہاں پر، ازواج کے تذکرے کے عین درمیان ہوتے ہوئے بھی، ازواج کو اھل البیت میں شامل نہیں کیا گیا تو اس تذکرے سے باہر بھی ازواج اھل البیت میں شامل نہیں ہوسکیں گی۔

اھل البیتؑ کا گھر

غرض ازواج کے ساتھ ان کے الگ الگ گھروں کا ذکر کر کے قرآن نے ہمیشہ کے لئے واضح کر دیا کہ ازواج کے ''بیوت'' الگ ہیں اور اھل بیتؑ کا ''البیت'' الگ ہے۔ لیکن اب ایک اور دشواری یہ آ پڑی کہ ازواج کے گھر تو وہ تھے جو اینٹ گارے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک ایک حجرہ پر مشتمل تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان ہی حجروں میں رہتے تھے۔ ان گھروں کے علاوہ حضورؐ کا کوئی الگ گھر نہیں تھا۔ تو اب اھل بیتؑ کا گھر کون سا تھا۔ یوں تو یہ سارے گھر مل کر حضورؐ کا ایک گھر بنتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے یہ ایک گھر تھا۔ ازواج کے حوالے سے جو معظّمہ جس حجرے میں رہتی تھیں، وہ ان کا گھر تھا۔ اب جب آنحضرتؐ کا گھر پورے کا پورا ازواج میں تقسیم ہو گیا تو اب وہ گھر کہاں تھا جس سے تعلق کی بنیاد پر کچھ شخصیتیں اھل البیت کہلاتی تھیں۔

تو ایک عجیب بات نظر آئی۔ صحیح مسلم نے آیہ تطہیر کی تفسیر میں حضرت عائشہ سے روایت کی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک روز صبح کے وقت اس طرح گھر سے نکلے کہ آپؐ کے دوش مبارک پر کالے بالوں سے بنی ہوئی ایک چادر تھی۔ امام حسن علیہ السلام آئے آپؐ نے چادر میں لے لیا۔ پھر امام حسین علیہ السلام آئے۔ پھر فاطمہؑ آئیں۔ پھر علیؑ آئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو چادر میں لیتے جاتے تھے۔ جب یہ پانچوں چادر کے اندر آ گئے تو آپؐ نے آیت پڑھی: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ﴾۔ (صحیح مسلم، جلد ۷، باب فضائل اہل بیت النبیؐ)

صحیح ترمذی میں آیت تطہیر کی شان نزول میں ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے بیٹے عمر بن ابی سلمہ سے روایت کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں تھے۔ آپ نے حسن، حسین اور جناب سیدہؑ کو بلا کر اپنے سامنے کی طرف بٹھایا۔ حضرت علیؑ

کو بلا کر اپنی پشت کی جانب بٹھایا۔ پھر ان سب کے اوپر ایک چادر ڈال دی اور فرمایا کہ یہ میرے اہلبیتؑ ہیں ان سے رجس کو دور رکھ اور انہیں ایسا طاہر رکھ جیسے طہارت کا حق ہے۔ تو اس پر اللہ کی طرف سے آیت تطہیر نازل ہوئی۔ (صحیح ترمذی، جلد ۱۲، تفسیر تطہیر)

مستدرک امام حاکم میں حضرت عبداللہ ابن جعفر سے روایت ہے کہ ''حضورؐ پر نزولِ وحی کے آثار تھے۔ آپؐ نے فرمایا: میرے پاس بلاؤ۔ حضرت صفیہ نے پوچھا: کس کو بلاؤں، فرمایا: میرے اہل بیت علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو۔ ان سب کو بلایا گیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب پر چادر ڈال دی۔ پھر اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے فرمایا: پالنے والے یہ میرے آل ہیں تو محمدؐ و آل محمدؐ پر اپنی رحمت نازل فرما۔ اس وقت آیۂ تطہیر نازل ہوئی۔'' (مستدرک علی الصحیحین، جلد ۳)

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور میں ابوسعید خدری سے روایت کی کہ ''حضورؐ ام سلمہؓ کے گھر میں تھے۔ آپؐ نے حسنؑ، حسینؑ و علیؑ و فاطمہؑ کو بلایا۔ پھر ان سب کو اکٹھا کر کے ان سب پر ایک کپڑا ڈال دیا اور ام سلمہ اور ان افراد کے درمیان پردہ حائل کر دیا۔ پھر فرمایا: اے پالنے والے یہ میرے اہل بیتؑ ہیں۔ پروردگار! میرے اہل بیتؑ سے ہر برائی کو دور رکھ اور انہیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھ جیسے پاکیزگی کا حق ہے۔'' جناب ام سلمہؓ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ کیا میں بھی ان میں شامل ہو سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: تم اپنی جگہ پر رہو۔ تم خیر پر ہو۔ (تفسیر جلد ۵، آیت تطہیر کے ذیل میں)۔

میں آپ کی خدمت میں اور بھی کئی روایات نقل کر سکتا ہوں۔ لیکن جس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ ان چاروں روایتوں میں بھی موجود ہے، اور باقی جتنی اور روایتیں ہیں اس آیت کے شانِ نزول اور اس کی تلاوت کے بارے میں، ان سب میں موجود ہے۔ یوں تو ان روایات سے یہ بھی طے ہو گیا کہ اہل بیتؑ کون افراد ہیں۔ یہ بھی

ظاہر ہو گیا کہ حضورؐ نے اس آیت کی تلاوت میں بہت اہتمام فرمایا۔صرف ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ ایک ہی انداز سے یہ آیت پڑھی۔کبھی گھر کے باہر، کبھی ازواج کے گھر میں۔۔

لیکن ان پہلوؤں سے قطع نظر، میں نے عرض کیا تھا کہ نزول اور تلاوت آیت تطہیر میں مجھے ایک عجیب بات نظر آئی، وہ یہ کہ یہ روایت جس نے بھی، جس طریقے سے بھی بیان کی، ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ حضورؐ جب بھی آیت تطہیر کی تلاوت فرماتے تھے۔ پہلے ایک چادر میں تمام اہل بیتؑ کو جمع فرما لیتے، وہ چادر سیاہ اون کی ہو، سوت کی ہو، ایک کپڑا ہو، خواہ کیسی ہی ہو، لیکن ہر روایت میں ایک چادر بھی ہے اور اس چادر سے تمام اہل بیتؑ کو پہلے ڈھانپنے کا تذکرہ بھی ہے۔آیت تطہیر کے ساتھ چادر کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ ہمارے ہاں تو یہ روایت حدیث کساء کہلانے لگی، یعنی چادر والی حدیث۔اب مجھے یہ پوچھنا ہے کہ آخر اس چادر کی اس قدر اہمیت کیوں ہے کہ ہر راوی نے خاص طور پر ایک چادر کا حوالہ ضرور دیا۔محسوس ہوتا ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نزول آیت کے وقت بھی ہو، اور بعد میں اس آیت کی تلاوت کے وقت بھی، تمام اہل بیتؑ کو چادر اس اہتمام سے اوڑھائی ہے کہ راوی اس منظر کو فراموش نہ کر سکا اور ہر مرتبہ غیر شعوری طور پر چادر کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔تو جب چادر اوڑھا کر آیت پڑھنے میں اتنا اہتمام کیا گیا تو اس میں ضرور کوئی بات بھی ہوگی۔

تو میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے، اور وہ یہ کہ حضورؐ کو ایک ایسی آیت پڑھنی تھی جس میں صرف الفاظ کے معنی جان لینے سے آیت کا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس میں ایک اشارہ بھی تھا، اور جب کوئی اشارہ کیا جائے تو اشارے کا مطلب ڈکشنری سے نہیں معلوم ہوتا، اشارے کو دیکھ کر ہی فیصلہ ہو سکتا ہے کہ یہاں کہنے والے کی مراد کیا ہے۔یعنی اگر آیت ہوتی کہ اللہ اہل بیتؑ سے ہر رجس کو دور کر رہا تھا تو ہم لغت سے اہل

بیت کے معنی دیکھ لیتے اور آیۂ تطہیر کا مطلب سمجھ جاتے۔ لیکن یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم اہل بیت کی پاکیزگی کی ضمانت دے رہے ہیں، یعنی ایک خاص گھر کے رہنے والوں کی۔ اب ''بیت'' کے معنی تو ڈکشنری میں مل جائیں گے۔ لیکن ''البیت'' یہ گھر، اس گھر میں جو ال ہے، جس کا مطلب ''یہ'' ہے۔ اس ''یہ'' کا مطلب لغت سے نہیں معلوم ہوگا، بلکہ دیکھنا پڑے گا کہ حضورؐ نے آیت پڑھتے ہوئے کس گھر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اب اشارے کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ آئے، اشارہ ہر چیز کو اپنے اندر داخل کرتا جاتا ہے۔ لیکن جہاں رکاوٹ آئی اشارہ ختم ہو جاتا ہے۔ میں یہاں بیٹھے ہوئے کہوں کہ ''یہ'' صاحب میرے عزیز ہیں تو اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ اس ہال میں بیٹھے ہوئے کسی صاحب کو بھی میرا عزیز سمجھ لے۔ لیکن جو صاحبان ہال سے باہر ہیں ان میں میرے عزیز کی تلاش نہیں ہوگی کیونکہ اشارہ وہاں ختم ہو گیا جہاں سے ہال کی دیواریں شروع ہو گئیں۔ اب حضورؐ خود بطور دعا کہہ رہے ہوتے یا آیت تطہیر کی تلاوت فرما رہے ہوتے، تو جب کہتے کہ اس گھر والوں کی طہارت کی سند دی جا رہی ہے۔ تو جہاں بھی یہ بات فرماتے وہاں کی دیواروں کے اندر جتنے افراد ہوتے، سب اہل البیت ہوتے۔ آیت کا نزول ہوا ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر۔ اب حضورؐ جناب ام سلمہؓ کے گھر میں بیٹھ کر، کھڑے ہو کر، یا بستر پر استراحت فرماتے ہوئے، آیۂ تطہیر کی تلاوت کرتے تو اس گھر کی مستقل رہنے والی تو جناب ام سلمہؓ تھیں۔ وہ سب سے پہلے اہل بیت قرار پاتیں۔ اس لئے ہر مرتبہ آیت کی تلاوت سے پہلے، حضورؐ نے چند افراد کو اپنے ہمراہ ایک چادر میں سمیٹ لیا۔ گویا پہلے چادر سے ایک چاردیواری بنائی اور اس کے اندر تشریف رکھتے ہوئے کہا کہ اس گھر والوں کی پاکیزگی کا تذکرہ ہے۔ یعنی کسی کو کوئی غلط فہمی نہ رہے کہ آیت تطہیر میں کون کون شامل ہے۔ جو چادر کے اندر ہیں وہ

اہل بیتؑ ہیں اور جو چادر کے باہر ہیں وہ ڈکشنری یا محاورے کے اہلبیت تو ہو سکتے ہیں، آیت تطہیر کے ''اھل البیت'' نہیں ہو سکتے۔

سورہ ھود کے ارشاد کے مطابق فرشتوں نے حضرت ابراہیم ؑ کے گھر میں داخل ہو کر کہا تھا: ''اے اہل بیتؑ تم پر خدا کی رحمت و برکت ہے۔'' تو گھر کی چاردیواری میں رہنے والا ہر فرد، جناب سارہ بھی اھل البیت قرار پائیں۔ لیکن آیۂ تطہیر چادر کے اندر نازل ہوئی تو یہاں اہل البیت چادر کے اندر والے ہوں گے۔ باہر والے نہیں ہوں گے۔

اس ''البیت'' کی خصوصیات کو حضرت ام سلمہ ؓ بخوبی سمجھ گئیں۔ یہی تو وجہ تھی کہ وہ گھر میں موجود تھیں، بلکہ یہ گھر ان کا ہی کہلاتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے آ کر پوچھا کہ کیا میں بھی ان میں شامل ہو سکتی ہوں۔ یہ پوچھنا بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ اھل البیتؑ صرف وہی ہوں گے جو چادر والے بیت میں ہوں گے۔ اینٹ گارے والے گھر کے رہنے والے اھل البیت نہیں ہیں۔

اور پھر ہمارے ہاں کی حدیث کساء کی روایت میں ایک جملہ اور بھی ہے کہ جبرئیل آئے آیۂ تطہیر لے کر، تو چادر کے باہر سے پوچھا: یا رسول اللہؐ کیا میں چادر میں داخل ہو سکتا ہوں۔ وہ جبرئیل، جو غار حرا میں بے تکلف پہنچ گئے تھے، جن کے راستے میں نہ کوئی چھت رکاوٹ تھی، نہ کوئی دیوار حائل ہو سکتی تھی، جو روز ہی حکم الٰہی سے بارگاہ رسالتؐ میں بغیر روک ٹوک کے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ آج ایک چادر کی رکاوٹ سے رکے ہوئے یہ پوچھ رہے ہیں کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ بات اتنی سی تھی کہ جب کوئی شخص گھر سے باہر کھڑا ہو تو جس کا دل چاہے بلا تکلف جا کر مخاطب ہو جائے، لیکن جب کوئی، اور خاص طور پر نبیؐ، اپنے گھر کے اندر ہو تو قرآن نے پہلے حکم دے دیا تھا کہ نبیؐ کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہونا (سورہ احزاب ۳۳، آیت ۳) آج سے پہلے

حضورؐ جب غار میں ہوتے، مسجد میں ہوتے، میدان میں ہوتے، کسی زوجہ کے گھر میں ہوتے، تو اپنے گھر سے باہر ہوتے تھے۔ جبرئیل بغیر کسی رکاوٹ کے آجاتے۔ آج رسولؐ چادر اوڑھ کر، اپنے گھر میں، رسالتؐ کے گھر میں، گھر والوں کے ساتھ ہیں۔ آج حکم خدا کے تحت جبرئیل مجبور ہے کہ جب تک اجازت نہ مل جائے، وہ اس گھر کی چار دیواری میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

بیوتکن اور اھل البیت کا معنوی فرق

اور یہاں ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ آیت تطہیر کو ازواج کے تذکرے میں کیوں رکھا گیا اور یہ آیت خصوصیت سے ایک ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں کیوں نازل ہوئی۔ اگر نزول آیت کے وقت ازواج میں سے کسی کا گھر نہ ہوتا اور امہات المؤمنین میں سے کوئی خاتون قریب نہ ہوتیں، تو کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ گھر والوں سے مراد ازواج ہیں لیکن ایک زوجہ کے گھر میں ہوتے ہوئے ان کے گھر کے اندر ایک اور نیا گھر بنا کر، پھر ازواج کے اپنے اپنے گھروں کو ایک گھر ''البیت'' سے الگ کر کے، اللہ نے ہر صاحب نظر و عقل پر قیامت تک واضح کر دیا کہ نساء النبیؐ اور اھل البیتؑ ایک ساتھ ہو کر بھی جدا ہیں۔

اور اس جدائی کو، اس مختلف ہونے کو ایک طرف تو اعمال کے فرق سے ظاہر کیا گیا۔ دوسری طرف فقط لفظ بیت کو دو طرح استعمال کر کے، مدارج کا، یا بیت کے ساتھ دونوں جماعتوں کے رشتے اور تعلق کی نوعیت کا بھی اظہار کر دیا گیا۔

یعنی ایک جماعت کے لئے کہا گیا بیوتکن۔ تمہارے گھر اور دوسری جماعت کے لئے ارشاد ہوا۔ اھل البیتؑ   اب ان دونوں باتوں میں فرق کیا ہے؟ تو جب کہا جائے فلاں صاحب کا گھر، تو اس سے صرف کسی کی گھر میں سکونت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جب کہا

جائے فلاں گھر والے ہیں تو اس سے گھر پر ان کا اختیار، ان کی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔

مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ میرے ایک دوست یہاں رہتے ہیں ان کے مزاج میں نفاست اور ذوق کی بلندی کے ساتھ ساتھ، ہر لحہ بہتر سے بہتر کی تلاش کا جذبہ بھی بہت ہے۔ چنانچہ ان کو کوئی مکان زیادہ دیر تک پسند نہیں رہتا۔ جس گھر میں آج رہتے ہیں، سال دو سال اس میں رہ کر چھوڑ دیں گے۔ پھر کہیں اور رہیں گے تو چند مہینوں میں ایک اور ٹھکانہ تلاش کر لیں گے۔ چنانچہ میں جب ان سے ملتا ہوں تو یہ ضرور پوچھتا ہوں کہ آج کل آپ کا گھر کہاں ہے۔ اور اکثر و بیشتر وہ ہر ملاقات پر نیا پتہ بتاتے ہیں۔ اب آج ان کا گھر وہ ہے جہاں آج وہ رہ رہے ہیں۔ کل ان کا گھر وہ تھا جہاں وہ کل رہ رہے تھے۔

دوسری طرف آپ اپنے وطن سے آ کر یہاں قیام پذیر ہیں۔ آپ کے اعزا، خاندان کے اور بہت سے محترم اور عزیز رشتے دار وطن میں رہتے ہیں۔ آپ سال دو سال بعد ایک مرتبہ اپنے وطن گئے۔ سوچا اچانک پہنچیں گے تو اعزاء کو زیادہ خوشی ہوگی۔ اس لئے پہنچنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔ چنانچہ ائیر پورٹ پر کوئی استقبال کے لئے بھی نہ آ سکا۔ آپ سیدھے گھر پہنچے۔ اتفاق سے آپ کی غیر حاضری میں آپ کے عزیزوں نے ایک نیا ملازم رکھا تھا۔ آپ جب اچانک پہنچے اور بے دھڑک گھر میں داخل ہونے لگے تو اس نئے ملازم کی نظر پڑ گئی۔ اس نے دیکھا ایک اجنبی گھر میں داخل ہو رہا ہے تو فرض شناسی کے جذبہ سے زور سے چیخا۔ رک جایئے! کون صاحب ہیں آپ۔ اس کی بلند آواز سن کر گھر کے اندر سے آپ کے عزیز باہر آ گئے۔ باہر کا منظر دیکھتے ہی صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ نوکر سے کہنے لگے۔ بھائی تو کسے روک رہا ہے۔ یہ کوئی غیر نہیں۔ یہ تو گھر والے ہیں۔ خبردار ان کو نہ روکنا۔

یعنی جب کہا جائے کہ یہ فلاں کا گھر ہے تو گھر سے رشتہ بہت کمزور۔ جب تک اس میں گھر ہے، تب تک اس کا گھر۔ جہاں چھوڑا، اب اس کا گھر نہیں رہا۔ لیکن جب کہا یہ گھر والے ہیں، تو دنیا کے کسی گوشے میں رہیں۔ گھر سے رشتہ قائم ہے۔ اب قرآن کی بلاغت کی داد دیجیے۔ زوجیت کا رشتہ، منشائے شوہر کا پابند، جب تک شوہر چاہے بیوی ہے، ورنہ تعلق ختم، دوسری طرف تعلق کی بنیاد وہ طہارت ہے جس کے ہمیشہ قائم رہنے کی ضمانت خود اللہ دے رہا ہے۔ گویا ان کا تعلق گھر سے ہمیشہ قائم رہے گا۔ چنانچہ ازواج سے گفتگو کی تو کہا تمہارا گھر، یعنی جب تک رسولؐ پسند فرمائیں، اجازت دیں، اس وقت تک یہ تمہارا گھر ہے۔ آج تمہیں چھوڑ دیں، طلاق دے دیں، تو یہ گھر تمہارا نہیں رہے گا۔ لیکن جس کا رشتہ طہارت کی وجہ سے تھا۔ ان کا حضورؐ سے تعلق دائمی تھا اس لئے انہیں گھر والے کہہ کر مخاطب کیا۔

خانۂ کعبہ میں بت رکھے تھے تو یہ بتوں کا گھر، بت خانہ، بنا رہا۔ ایک دن سارے بت نکال باہر کیئے گئے تو ان کا کعبے سے تعلق ختم ہوگیا۔ لیکن اگر کسی کے لئے کبھی آنا ہوتو آنے کے لئے، کبھی جانا ہوتو جانے کے لئے، دیوار کعبہ شق ہو ہو کر راستہ دیتی رہے، تو سمجھ جایئے کہ یہ کوئی گھر والا ہے۔

اور ایک مرتبہ پھر توجہ دلاؤں گا کہ اگر بیت کے لفظ کے یہ دونوں بلیغ استعمال ایک ساتھ نہ ہوتے تو یہ معنویت ظاہر نہ ہوتی۔ دونوں استعمال ساتھ ساتھ کیئے گئے تو موازنہ سے دونوں استعمال کا فرق واضح ہوگیا۔

آیۂ تطہیر کا اپنے سیاق وسباق سے ربط

اب تک میں نے آیۂ تطہیر کا اس کے ساتھ کی دوسری آیات سے فرق واضح

گیا۔ اس آیت کا ساتھ کی آیات سے مفہوم مختلف، مخاطب مختلف، لب ولہجہ مختلف، الفاظ مختلف۔ لیکن اپنے ساتھ کی دوسری آیات سے مختلف ہونے نے ایک اور الجھن پیدا کر دی کہ ایک مسلسل تذکرے کے دوران، ایک بالکل مختلف تذکرہ شروع کر دینے سے کیا کلام بے ربط نہیں ہو گیا؟ آیت تطہیر کی بات، باقی کہی جانے والی باتوں سے جتنی مختلف ہوگی اسی قدر بے ربطی بڑھتی جائے گی اور بے ربط باتیں کرنا کسی حکیم ودانا سے متوقع نہیں ہوتا۔

البتہ ایک امکان یہ بھی ہوتا ہے کہ دو مختلف باتیں ایک ساتھ اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ دونوں باتوں کا اختلاف نمایاں ہو جائے۔ یعنی بعض اوقات بے ربط باتیں اسی لئے کی جاتی ہیں کہ یہ واضح کیا جا سکے کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی ربط نہیں ہے۔ لیکن میرے ناچیز خیال میں سورۂ احزاب کی ان آیات میں ایسی کوئی بات نہیں، بلکہ آیۂ تطہیر میں اور اس کے ساتھ کی باقی آیات میں گہرا ربط ہے۔ اس ربط کے اظہار کے لئے ایک مثال عرض کروں گا۔

ایک صاحب کے دو فرزند ایک ہی استاد کے پاس ایک ہی جماعت میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان دونوں کا امتحان ہوا۔ تو ایک بیٹا کلاس میں اول آیا۔ لیکن دوسرا تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتا تھا چنانچہ وہ بمشکل پاس ہو سکا۔ استاد نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے ایک دن دونوں لڑکوں کو سامنے بٹھایا۔ اور تعلیم میں کمزور لڑکے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

''عزیزم! پڑھائی میں دلچسپی لو۔ تمہارے والد کا بڑا نام ہے۔ وہ صاحب علم آدمی ہیں۔ اگر تم نے تعلیم میں اچھی کارکردگی نہ دکھائی تو دنیا والے کہیں گے کہ اتنے نامور باپ کا بیٹا ناخلف نکلا۔ تمہیں چاہیے کہ کھیل کود میں وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے اساتذہ کی پڑھائی ہوئی باتوں پر توجہ دو۔ ورنہ اس مرتبہ تو کسی نہ کسی طرح اگلی جماعت میں چلے گئے ہو۔ اگر یہی

حال رہا تو اگلے سال پاس ہونا ناممکن ہو جائے گا۔" یہ کہتے کہتے اچانک استاد دوسرے بیٹے کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: "شاباش بیٹا! تم نے اپنے والدین اور اساتذہ کا نام روشن کر دیا۔ میں تمہاری اعلیٰ کارکردگی پر تمہیں انعام دوں گا۔" اب پھر پہلے لڑکے سے کہنے لگا: "دیکھو تمہارے سامنے محنتی لڑکوں کی مثال رہنی چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے وقت کو کیسے صرف کرتے ہیں۔"

اب اس ساری گفتگو میں بظاہر ایک جملہ غیر متعلق ہے۔ "شاباش بیٹا! تم نے اپنے والدین اور اساتذہ کا نام روشن کر دیا۔ میں تمہاری اعلیٰ کارکردگی پر تمہیں انعام دوں گا" اس جملے کا مخاطب مختلف، اس کا موضوع مختلف، باقی باتیں نصیحت تھیں، اس میں شاباش ہے۔ اس جملے کا لب ولہجہ مختلف، باقی باتیں عتاب آمیز تھیں۔ سرزنش کا انداز لئے ہوئے تھیں، لیکن اس جملے میں شفقت ہے، ستائش ہے، تعریف ہے، تو کیا یہ جمہ بے ربط ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ جملہ باقی گفتگو سے اس قدر مربوط ہے کہ یہ جملہ نہ ہوتا تو نصیحت کا اثر کم ہو جاتا۔ یہ جملہ دوران کلام کہا ہی اس لئے گیا ہے کہ بھائی کی قابلیت، محنت اور لگن کو دیکھ کر دوسرے بھائی کو تحریک ہو۔ وہ بھائی کی مثال سے سبق سیکھے۔ تو گویا خامیاں رکھنے والوں کے تذکرے میں کسی صاحب خوبی کا تذکرہ کلام کو بے ربط نہیں بناتا بلکہ کلام کی معنویت، تاثیر، افادیت بڑھ جاتی ہے۔

اب ذرا زیر بحث آیات پر نظر ڈالیے۔ ازواجِ پیغمبرؐ سے کہا جارہا ہے کہ تم لوگ عام عورتیں نہیں ہو۔ زوجۂ رسولؐ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ تم اگر غلطی کروگی تو تمہارے بلند مرتبے کا تقاضا ہے کہ تمہیں عام خطا کاروں کے مقابلے میں بڑا مجرم قرار دیا جائے۔ تم کسی سے بات چیت کرتے ہوئے اپنے مقام و مرتبے کے مطابق گفتگو کیا کرو، خدا و رسولؐ کی اطاعت کرو۔ زمانۂ جاہلیت کی بری عادتوں کو ترک کردو۔ اچانک مخاطب بدل کر

کہا جاتا ہے کہ اے اہل بیت تمہارے کیا کہنے۔ تمام برائیاں تم سے دور ہیں اور تم تو ایسے پاک ہو کہ اس سے بڑھ کر پاکیزگی کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اب پھر ازواج سے گفتگو ہوئی کہ تمہارے گھر میں اللہ کے احکام کی تلاوت ہوتی ہے، تم اس کی طرف دھیان دیا کرو۔ تمہیں جو عقل و دانش کی باتیں بتائی جاتی ہیں، اس پر توجہ دو ان کو یاد رکھو۔ اس پورے فرمان میں، نصیحت کرتے کرتے اچانک اہل بیتؑ سے کلام اور ان کی مدح بے ربط نہیں، بلکہ ازواج کی تربیت اور اصلاح کے لئے اسی ماحول سے ایک مثال دینی ہے کہ یہاں رہ کر اگر اہل بیتؑ اس قدر طیب و طاہر ہو سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں ایسی ہی ہونے کی کوشش کرتیں۔

یہ اللہ کا اہتمام تھا کہ آیت تطہیر ایک زوجہ کے گھر میں نازل ہوئی۔ حضورؐ نے اس آیت کی پہلی مرتبہ تلاوت کی تو زیر کساء افراد کے علاوہ، اسے سب سے پہلے ازواج ہی نے سنا اور انہوں نے ہی اس کے نزول کی تفصیلات ہم تک پہنچائیں۔ تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازواج کے گھر میں، ان کے سامنے آیت تطہیر کی تلاوت کریں اور فوراً ہی حکم الٰہی آئے کہ

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾۔ (سورۂ احزاب ۳۳، آیت ۳۴)

تمہارے گھروں میں جو آیات الٰہی اور حکمت بیان کی جاتی ہیں انہیں یاد رکھو۔

تو ظاہر ہے کہ اس وقت جس آیت اور حکمت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے وہ، وہ آیت ہے جس کی تلاوت رسولؐ نے چادر تطہیر میں کی تھی، اور وہ حکمت ہے جس کا مظاہرہ رسولؐ نے ایک ہی جگہ موجود ہونے کے باوجود اہل بیتؑ کو ازواج سے الگ رکھنے میں کیا ہے۔

گویا ازواج کے تذکرے میں، آیت تطہیر، اس آئیڈیل، اس مثالیے کا ذکر

ہے جس کو سامنے رکھ کر ازواج اپنے کردار کی تعمیر کریں۔ اب خود انصاف کیجیے۔ اس سے زیادہ مربوط اور بامقصد بات اور کوئی ہو سکتی ہے۔

آیۂ تطہیر ایسی ہی مثالی شخصیتوں کا ذکر کر رہی ہے کہ نہ عہد رسالتؐ میں، اور نہ بعد رسولؐ، کسی زوجۂ نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کو اس آیت کا مصداق قرار دیا۔ میں علماء کی تحقیقات کی روشنی میں پوری ذمہ داری سے دعویٰ کر رہا ہوں کہ کہیں کسی مسلک کی کتاب میں کوئی سچی، جھوٹی یا بنائی ہوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جس میں ازواج رسولؐ میں سے کسی نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہو کہ آیت تطہیر ہمارے لئے اتری ہے، یا اہل بیتؑ سے ہم مراد ہیں، یا آیت تطہیر کا لازمی نتیجہ، عصمت مطلقہ، کی صفت ہم میں پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف خود ازواجؓ کی روایت کردہ احادیث یہ کہتی ہیں کہ یہ آیت پنجتنؑ کے لئے اتری۔ اب اگر کوئی راوی، کوئی محدث، کوئی مفسر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہے کہ آیت تطہیر میں ازواجؓ کا ذکر ہے تو یہ دعویٰ، مدعی سے زیادہ گواہ کی چستی کا نتیجہ ہے۔

مناظرے اور مباحثے کی دنیا الگ ہے۔ وہاں اگر کسی کے منہ سے غلط بات بھی نکل جائے تو وہ اسی کو صحیح ثابت کرنے پر تل جاتا ہے لیکن اگر مقصد تلاش حق ہو اور انسان تعصّبات کی بجائے انصاف کی نظر سے مسائل کو دیکھے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ ایک طرف تو آیت تطہیر میں بیان کی گئی عظمت کردار دیکھیے کہ جو بھی اس آیت کا مصداق ٹھہرے گا، دنیا و آخرت میں اس کی فضیلت سب سے بالا ہوگی۔ اس قدر بڑا اعزاز ہو اور ازواجؓ کی طرف سے کبھی اس آیت کو اپنے حق میں ہونے کا تذکرہ تک نہ ہو۔ یہی بات اسے ازواجؓ کے حق میں نہ ہونے کی کافی دلیل ہے۔ پھر دوسری طرف زبانِ رسالتؐ سے بھی ارشاد ہو، اور جن کے لئے ارشاد ہو، وہ خود بھی کئی مرتبہ یہ فرمائیں کہ یہ آیت ہمارے لئے اتری ہے۔ جب کسی بھی بات کا فقط ایک دعویدار ہو، اور

دوسرے، تمام مواقع موجود ہونے کے باوجود، دعویٰ نہ کریں، تو دعویدار کا حق تسلیم ہو جاتا ہے۔ پنجتنؑ نے خود کو آیت تطہیر کا مصداق بھی کہا۔ اپنے اہل بیتؑ ہونے کا بھی اعلان کیا۔ اور اپنی عصمت کا بھی دعویٰ کیا۔ اور ان کے علاوہ کسی اور نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ تو اب ان کے علاوہ کسی اور کو آیت کا مصداق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہت سی تفسیروں میں مفسرین نے اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر یہ ضرور کہا ہے کہ اہل بیتؑ سے مراد ازواجؓ ہیں لیکن اس رائے کے متعلق خود ازواجؓ اور آل محمدؐ کا کیا نقطۂ نظر ہے اس کا بیان بھی ہو چکا ہو۔ اور اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی دیکھ لیں کہ مفسر کچھ کہتے رہیں، قرآن کی اصطلاح اہل بیت کو جب ملت اسلامیہ نے اپنی زبان سے ادا کیا تو شعوری یا غیر شعوری طور پر، اس لفظ سے صرف آل محمدؐ کو مراد لیا۔ کتابوں میں لکھنے والوں نے جو چاہا لکھا۔ اہل بیتؑ میں صرف ازواجؓ ہی کو نہیں، چچاؤں کو بھی شامل کیا۔ کئی بیٹیاں قرار دے کر تمام دامادوں کو شامل کرنا چاہا، اور اسی رشتہ سے نواسے نواسیوں کو بھی شامل کیا۔ اسی طرح آل کی بات ہوئی تو کہا گیا کہ آل تو پیروی کرنے والے ہوتے ہیں چنانچہ پوری امت آل ہے۔ تمام اصحاب آل ہیں۔ ان سب دعوؤں کے باوجود، جب عمل کی دنیا میں قدم رکھا تو اسری نکتہ آفرینیوں سے دستبردار ہو کر مسلمان نے یہی کہا کہ ازواج الگ ہیں۔ اصحاب الگ ہیں۔ اہل بیتؑ اور آل رسولؐ الگ ہیں۔ یہ کب اور کہاں ہوا، تو فقط ایک زندہ حوالہ کافی ہوگا۔ مسلمان شاید حکم الٰہی کی تعمیل میں، احترام نبوتؐ کی خاطر، جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نامی آتا ہے تو درود پڑھتا ہے۔ عام مسلمان، عام طور پر دو طرح صلواۃ پڑھتا ہے۔ ایک مختصر طریقہ ہے، دوسرا ذرا تفصیلی ہے۔ مختصر صلواۃ تو یہ تھی کہ نام کے ساتھ کہا: ﴿صلی اللّٰہ علیہ وسلم﴾۔ ذرا تفصیلی درود یہ تھا کہ کہا: ﴿اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ و ازواج محمد و اصحاب

محمد ﷺ اب چھوٹا درود پڑھا تو کچھ نہ کہا حتیٰ کہ آل کا بھی ذکر نہیں۔ ذرا تفصیل سے کہا تھا تو آل، ازواج، اصحاب، سب شامل ہو گئے۔ یعنی مسلمان اس پر آمادہ نہیں کہ صرف آل پر درود بھیجے یا تو وہ آل کا ذکر نہیں کرتا اور کرتا ہے تو ازواج و اصحاب کے ساتھ۔ ان دونوں باتوں کی وجہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ آل کون ہیں۔ لیکن اپنی کسی فکری مجبوری کی وجہ سے ان اہل بیتؑ کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ کہتا تو یہی ہے کہ آل میں سب شامل ہیں۔ اہل بیتؑ میں ازواجؓ شامل ہیں۔ لیکن شامل ہوتیں تو ہر مرتبہ آل کا ذکر ضرور کرتا اور آل کے علاوہ کسی اور کا ذکر نہ کرتا۔ خالی آل کا ذکر نہ کرنا، اور جب کبھی ذکر کرنا ہو تو اصحاب و ازواج کے ساتھ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مسلمان نے آل محمدؐ کی چند ہستیوں کے علاوہ، کسی اور کو اہل بیتؑ کے خطاب کا مستحق تسلیم نہیں کیا۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اہل بیتؑ سے جو ہستیاں مراد تھیں، ان کو پہچاننے میں کبھی، کسی کو، کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جو عشق رسولؐ کا جذبہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنے احساس احترام کو جب اہل بیتؑ کی طرف بڑھانا چاہا تو یہی ہستیاں تھیں جن کو مودت، احترام اور تعظیم کا حق ادا کیا گیا۔ اور جو کلمہ پڑھ کر بھی دل میں ذات رسالتؐ سے کدورت اور دشمنی رکھتے تھے، انہوں نے رسولؐ کے اہل بیتؑ سمجھتے ہوئے ان ہی ہستیوں سے انتقام لیا۔

یہ اہل بیتؑ رسولؐ ہی سمجھتا تھا کہ یزید مدینہ میں کئی اصحاب رسولؐ کو قتل کرے، مکہ میں خانۂ خدا کو تاراج کرے، لیکن کبھی اس کی زبان پر وہ جملہ نہ آئے جو قتل حسینؑ کے بعد اس نے کہا تھا۔ سر حسینؑ کو اپنے سامنے دیکھ کر یزید نے کہا تھا: ''کاش آج میرے بڑے موجود ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے بدر کے مقتولوں کا انتقام لے لیا ہے۔'' ❁

حفاظتِ قرآن : ۱۶

اعلانِ تکمیل دین کا سیاق وسباق

ہم اب تک کی گفتگو میں اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ قرآن مجید جس طرح اللہ کا کلام ہے، اسی طرح اس کی ترتیب بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ جس طرح آیت یا جملوں میں الفاظ کی ترتیب منشائے الٰہی کے مطابق ہے، اسی طرح ایک سورۃ کے درمیان آیات اور جملوں کی ترتیب بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اور قرآن حکیم کے متعلق اس حقیقت کے اعتراف کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی مقام پر، کسی ارشادِ الٰہی کا سیاق وسباق اس ارشادِ الٰہی کے معنی ومفہوم کو ایک خاص سمت موڑ دے تو ہمیں اس مفہوم کو قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر کہیں مفہوم کو سمجھنے میں کسی آیت کا سیاق وسباق کسی الجھن کا باعث بن جائے تو فوراً ترتیب قرآن کو انسانی کارگزاری قرار دے دینے کی بجائے، ہمیں پورے غور وفکر سے کام لے کر اس مصلحت کو تلاش کرنا ہوگا، جس کی وجہ سے ایک آیت کو کسی بظاہر غیر متعلق تذکرے کے درمیان رکھا گیا ہے۔

چنانچہ، اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے، ہم نے سورۃ احزاب کی ۲۸ ویں سے ۳۴ ویں آیات پر تفصیل سے گفتگو کی۔ اور ان میں جو جزء عرف عام میں آیۂ تطہیر کہلاتا ہے، اس کے محل وقوع کے متعلق دو اہم شبہات کا ازالہ کیا۔ ایک طرف تو اس تصور کی

خامیاں واضح کی گئیں کہ آیہ تطہیر اپنے گرد و پیش سے غیر متعلق ہے، اور اس کا سورہ احزاب میں موجودہ مقام پر ہونا کسی کی بدنیتی کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف اس دعوے کی کمزوری کو بھی نمایاں کر دیا گیا کہ آیت تطہیر چونکہ ازواج النبیؑ کے تذکرے کا جزو ہے، اس لیے یہ آیت ازواج رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

سورۂ مائدہ میں اعلان تکمیل دین کا سیاق وسباق

اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد ہمارے سامنے، قرآن مجید کا ایک اور مقام ہے پانچ جملوں پر مشتمل ایک مسلسل عبارت ہے، جس میں کسی خاص واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾۔

یہ پانچ جملے خود ایک آیت نہیں، بلکہ سورہ مائدہ کی تیسری آیت کا درمیانی حصہ ہیں۔ اس آیت میں، ان پانچ جملوں سے پہلے گوشت کی کئی اقسام بتائی گئی ہیں، جن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ ''مردار کا گوشت، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیئے گئے ہوں، وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائیں، کسی درندے کے شکار کا بچا ہوا گوشت، البتہ اگر (اس کے مرنے سے پہلے اس کے پاس پہنچ جائیں اور) اسے ذبح کر لیں، وہ جانور جو کسی بت پر قربان کیئے جائیں اور اسی طرح قسمت آزمائی کے تیروں سے تقسیم ہونے والا گوشت، یہ تمام اقسام تمہارے لئے حرام ہیں۔ یہ سارے اعمال فسق اور گناہ ہیں۔''...... حرام گوشت کی اس فہرست کے فوراً بعد اسی

آیت میں یہ پانچ جملے آئے: ''آج کے دن کافر تمہارے دین (کی تباہی و بربادی کے امکان) سے مایوس ہوگئے، اب ان سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ اللہ سے ڈرو، آج کے دن تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا گیا، اللہ نے تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں، اور تمہارے لئے (قیامت تک) اسلام کو بطور دین کے پسند کر لیا۔'' ان جملوں کے بعد پھر وہی حلال و حرام کی گفتگو شروع ہوگئی۔ پہلے حرام گوشت کی اقسام بتائی گئی تھیں، اب ارشاد ہوا کہ: ''وہ لوگ، جن کی بھوک کی حالت میں کسی (حلال) غذا تک رسائی نہ ہو سکے، اور وہ (دل سے) گناہ کی طرف مائل بھی نہ ہوں، تو ایسے مجبور لوگ اگر ان احرام اقسام میں سے کسی قسم کا گوشت کھالیں گے، تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

ربط کلام کی جستجو

سورۂ مائدہ کا ترجمہ گوش گزار کر دیا گیا۔ سلسلہ کلام میں، انشاء اللہ، اس آیت سے پہلے کی دو آیتوں پر بھی گفتگو ہوگی۔ لیکن اس وقت صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ اس سے پہلے کی دو آیتوں میں بھی حلال و حرام کے کچھ احکامات ہیں۔ یہ احکامات بھی گوشت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسری آیت پہلی دو آیتوں سے مربوط ہے۔ تیسری آیت کا پہلا حصہ، کہ فلاں فلاں قسم کا گوشت حرام ہے، اور آخری حصہ، کہ حالت اضطرار میں، مجبوری میں اگر کوئی حرام کھالے گا، تو اللہ اس کے دل کی حالت دیکھ کر، اس کی مجبوری دیکھ کر، اسے معاف کر دے گا، یہ دونوں حصے بھی آپس میں واضح ربط رکھتے ہیں لیکن درمیان کے پانچ جملے اس نوعیت کے ہیں کہ ان کو گوشت کے حلال و حرام کے مسئلہ سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ ممکن ہے پانچ جملوں میں سے ایک جملہ، ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾، آج کے دن ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا، اس جملہ کو کسی نہ کسی

طرح مسلک کر دیا جائے، اور یہ کہا جائے کہ اللہ کی طرف سے حلال وحرام کے جتنے احکام آئے ان میں سے آخری حکم یہی گوشت کے بارے میں ہے، اور اس حکم کے آنے سے، چونکہ احکامات شریعت مکمل ہو گئے، اس لئے ارشاد ہوا کہ ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ لیکن اس توجیہ کے باوجود مسئلہ اپنی جگہ رہا۔ کیونکہ تکمیل دین کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ آج کے دن کافر مایوس ہو گئے، اب ان سے کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا، اور آج کے دن اللہ کی نعمتیں تمام ہو گئیں، اور آج کے واقعہ کے نتیجہ میں اللہ نے اسلام کو قیامت تک تمہارے لئے اپنا پسندیدہ دین قرار دے دیا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا گوشت کے حلال وحرام کے ذکر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں تو گوشت کی گیارہ اقسام حرام کی گئیں، اگر یہ قسمیں سو بھی ہوتیں تو کافر کیوں مایوس ہوتے۔ گوشت کا حلال وحرام ہونا مسلمانوں کو کافروں کے خطرے سے کس طرح بے نیاز کر سکتا ہے۔ یہاں تو مسلمان کے دستر خوان سے کئی طرح کے گوشت اٹھا دیئے گئے، اس کی جگہ اگر دو چار قسم کے گوشت کو حلال قرار دیا جاتا تو ہم سمجھتے کہ گوشت خوروں کے لئے نعمتیں تمام ہو گئیں۔ اشیائے خوردنی کی تعداد میں کمی کا اعلان باعث اتمام نعمت کیسے ہو گا۔ اور یہ بات تو بہت ہی عجیب ہوگی کہ اسلام کو صرف اس بات پر قیامت تک کا پسندیدہ دین قرار دے دیا جائے کہ اس دین میں بعض اقسام کے گوشت حرام قرار دیئے جا رہے ہیں۔ بلکہ اسلام کے قیامت تک باقی رکھنے کا یہ سبب تو کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ کا حلال وحرام دائمی ہے۔ کسی بھی غذا کی جو اقسام آج حرام ہو رہی ہیں وہ ہمیشہ سے حرام تھیں۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے کے ادیان میں مردار کھانا جائز تھا؟ یا پچھلی امتیں بتوں کے نام پر قربان کیے جانے والے جانور کھا سکتی تھیں؟ یا غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونے والے گوسفند پہلے کھائے جا سکتے تھے؟ اگر ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے تو اسلام میں ایسے

احکام، اسلام کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت نہیں دیتے۔ چنانچہ لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس آیت میں گوشت کا تذکرہ الگ موضوع ہے اور تکمیل دین کا سب کچھ اور ہے۔

تکمیل دین کے فرمان سے مربوط آیت

سچ پوچھیے تو ان پانچ صفات والے دین کا اگر کسی آیت سے ربط ہے تو وہ گوشت کے حلال وحرام کے احکام نہیں، بلکہ اسے سورہ مائدہ کی ایک اور آیت، ۶۷ ویں آیت، سے ہے، جس میں ارشاد ہوا:

﴿يَاأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ إِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾

بظاہر لفظ بدلے ہوئے ہیں۔ لیکن ذرا اس ارشاد پر غور فرمائیے: ''اے رسولؐ! آپ کے سپرد جو پیغام کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو فریضہ رسالت ادا نہیں کیا۔ اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ انکار کرنے والوں کی ہدایت نہیں کرتا'' اس آیت میں کوئی خاص پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ اور اس پیغام کی پہلی صفت یہ بتائی جا رہی ہے کہ اسے نہ پہنچایا گیا تو رسالت کا فریضہ تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔ رسالت کا فریضہ تھا دین کو پہنچانا، گویا یہ پیغام نہ پہنچا تو دین مکمل نہیں ہوگا۔ اور جب ایسا ہی اہم پیغام ہے کہ اگر پہنچا دیا جائے تو تکمیل رسالت ہوتی ہے، تو ظاہر ہے یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوگی۔ اور اس پیغام کی نوعیت ایسی ہے کہ کچھ لوگ یقیناً شرارت کرنا چاہیں گے۔ لیکن وہ نبیؐ کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ ان کا کوئی شر، کوئی برائی رسولؐ پر کارگر نہیں ہوگی۔ ان کی پرواہ کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ اور جو اس پیغام کو قبول کر لیں گے وہی ہدایت یافتہ ہوں گے، اور جو انکار کریں گے، جو اس پیغام سے کفر کریں گے، ان کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دے گا ... اب ذرا دونوں مقامات کا موازنہ کیجیے۔ ایک جگہ کہا جا رہا ہے، یہ بات لوگوں تک پہنچا دو تا کہ تمہاری رسالت مکمل ہو جائے۔ وہاں ارشاد ہوا کہ آج جو کچھ ہوا ہے اس کے نتیجہ میں تمہارا دین مکمل ہو گیا۔ یہاں بھی عطائے نعمت کا تصور، وہاں بھی اتمام نعمت کا تذکرہ۔ یہاں بھی مخالفین کی ناکامی کا بیان، وہاں بھی ان کی مایوسی کا ذکر۔ یہاں اللہ فرما رہا ہے کہ وہ تمہیں دشمنوں سے محفوظ رکھے گا، وہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ اب دشمنوں کی پرواہ نہ کرنا۔ یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ تمہارے پیغام سے انکار کرنے والوں کو قیامت تک ہدایت نہیں ملے گی، وہاں اطلاع دی جا رہی ہے کہ آج کے بعد اللہ کے نزدیک کوئی دین قابل قبول ہے تو وہ تمہارا بتایا ہوا اسلام ہے۔ اس پر عمل نہ کرنے والے گمراہ ہوں گے اب پورا قرآن دیکھ لیجیے۔ نہ اس شان کا کوئی دوسرا حکم ہے، نہ اس اہمیت کا کوئی دوسرا واقعہ ہے۔ دونوں کی صفات ایک، دونوں میں تکمیل دین، دونوں میں اتمام نعمت، دونوں میں مخالف کی ناکامی، دونوں میں دشمن سے بے خوفی، اور دونوں میں قیامت تک لئے حق و باطل کے فرق کی وضاحت تو اب عقل کہے گی کہ جب ایک حکم ہو کہ یہ خاص پیغام پہنچا دیجیے جس میں یہ پانچ صفات ہیں، دوسری طرف یہ سند ہو کہ آج جو کچھ ہوا ہے اس کے نتیجہ میں یہ پانچوں باتیں حاصل ہو گئی ہیں، تو اب ان دونوں موقعوں پر فرمائے گئے ان دونوں ارشادات کو ایک دوسرے سے منسلک اور مربوط نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے۔ اور جب یہ دونوں ارشادات ایک دوسرے سے متصل ہیں، تو جائیے، تاریخ دیکھیے، احادیث پڑھیے، اصحاب سے پوچھیے کہ نزول حکم اور اجرائے سند کے درمیان کون سا واقعہ ہوا تھا۔ بس جو واقعہ نظر آئے، اور اس میں یہ پانچوں شرائط پائی جائیں، سمجھ لیجیے گا کہ یہی

واقعہ ارشادِ الٰہی کا مصداق ہے۔

صفات کے ذریعہ واقعہ کا تعین

تو اب صورت حال یہ ہوئی کہ ایک طرف تو قرآن مجید میں تکمیل دین کا اعلان گوشت کے حلال و حرام کے احکام کے ساتھ ہے، دوسرے طرف میں گزارش کر رہا ہوں کہ تکمیل دین کا حقیقی ربط آیہ بلغ کے ساتھ ہے۔ اب اگر آپ میری گزارش سے متفق ہو جائیں تو پھر یہ سوال اور زیادہ شدت سے سامنے آ جائے گا کہ تکمیل دین کا اعلان غیر متعلق باتوں کے ساتھ کیوں؟ اور جو آیتیں آپس میں متعلق ہیں، ان میں اس قدر فاصلہ کیوں کہ ان کے ربط کو تلاش کرنے کے لئے باقاعدہ جستجو کرنی پڑے اور اس کے ساتھ ہی پھر وہی امکان سر اٹھائے گا کہ کہیں کسی مفاد پرست نے اہل دنیا کو حقیقت حال سے بے خبر رکھنے کے لئے، ان آیتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے غیر متعلق مسائل کے انبار میں چھپا تو نہیں دیا؟ کہیں یہ صورت حال بعد کے مسلمانوں کی کارفرمائی تو نہیں؟

میرا اصل موضوع اسی امکان تحریف کے شبہ کا تجزیہ کرنا ہے۔ لیکن مجھے جن باتوں کی طرف توجہ دلانی ہے، موجودہ صورت حال کی وضاحت کے لئے جن وجوہات کی نشاندہی کرنی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ آیہ تکمیل دین میں کس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور آیہ بلغ میں کون سے حکم کو پہنچانے کی تاکید کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ تو اصل واقعہ ہی بتائے گا کہ اس کے بیان کے کیا تقاضے ہیں۔

آیہ بلغ میں کس پیغام کو پہنچانے کے لئے کہا گیا؟ اور اس خاص دن میں کون سا واقعہ پیش آیا جس کی طرف قرآن مجید نے دو مرتبہ الیوم کہہ کر توجہ دلائی؟..... ان سوالوں کے جواب کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تاریخ کے صفحے کھنگالے جائیں،

مؤرخین سے پوچھا جائے، اگر مدد کر سکیں تو محدثین سے سوال کیا جائے، کتب احادیث کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ سب کرنا پڑے گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ ہزاروں صفحات کی تاریخ میں واقعہ کی تلاش مشکل ہو جائے، ہو سکتا ہے کہ مؤرخین ایک سے زیادہ جواب دیں۔ اس لئے تاریخ میں قدم رکھنے سے پہلے، اگر ممکن ہو تو پہلے یہ طے کر لیں کہ ہمیں تلاش کس چیز کی ہے۔ جو واقعہ ہم ڈھونڈ رہے ہیں اس کی کوئی شناخت کوئی پہچان ہے؟ تو یہاں قرآن نے ہماری مشکل آسان کر دی۔ اس نے ہمیں پہلے ہی بتا دیا کہ ایک واقعہ ہوا ہے۔ ایک خاص دن ہوا ہے۔ البتہ نہ ماہ و سال بتایا، نہ ہفتے کا دن بتایا، نہ واقعہ کے تمام کرداروں کے نام بتائے، نہ تفصیلات و جزئیات بتائیں، ہاں اتنا ضرور کیا کہ اس واقعہ کے کچھ نتیجے بتا دیئے۔ اور کمال قدرت یہ دکھایا کہ اگر دن، مہینہ، سال بتاتا تو واقعہ کے تعین میں غلطی ہو سکتی تھی، دنیا کہہ سکتی تھی کہ اس دن تو فلاں واقعہ بھی ہوا تھا، کرداروں کے نام بتاتا تو ایک ایک نام کے کتنے نکل آتے، اس نے کہنے کو صرف اتنا بتایا کہ اس دن جو کچھ ہوا، اس کے اثرات یہ ہوئے۔ اب یہ اثرات، یہ نتیجے اتنے نمایاں تھے، اتنے منفرد تھے کہ دنیا لاکھ تلاش کرے، کتنا ہی سر مارے، تاریخ کا صفحہ صفحہ دیکھ ڈالے، لیکن سوائے ایک کے، نہ کوئی دوسرا واقعہ ملے گا جو قرآن کے بیان کردہ نتیجوں کا حامل ہو، نہ یہ نتائج ایسے ہوں گے کہ کسی دوسرے واقعہ سے حاصل ہو سکیں۔

چنانچہ ہمارے سامنے حقیقت تک پہنچنے کے دونوں راستے ہیں، قرآن کا بتایا ہوا حتمی پیمانہ بھی، اور تاریخ کے دیانت و بدنیتی، مصلحت کوشی و حق گوئی، جانب داری اور منصف مزاجی کے تضادات میں الجھے ہوئے بیانات کا ذخیرہ بھی۔ تو تاریخ کے دھندلکوں میں بھٹک جانے سے پہلے، ہاتھ میں قرآن کا روشن چراغ لے لیں، تاکہ راہیں روشن ہو جائیں، اور منزل نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ

چنانچہ قرآن نے پہلا اعلان کیا کہ آج کے دن کی خصوصیت یہ ہے کافر تمہارے دین سے مایوس ہوگئے، وہ تمہارے دین کے متعلق جو خواب دیکھ رہے تھے وہ سب بکھر گئے۔

مایوسی ہمیشہ امید کا ردعمل ہوتی ہے۔ یعنی پہلے امید ہوتی ہے کہ ایسا ہوگا، اور جب ایسا ہونے کا امکان ختم ہو جائے تو مایوسی ہو جاتی ہے۔ اب اگر کفار مایوس ہوئے تو یقیناً پہلے کوئی امید ہوگی۔ اور امید تھی تو قرآن میں اس کا تذکرہ بھی ہوگا۔ چنانچہ میں نے تلاش کیا کہ کفار کو امید کیا تھی۔ تو فقط ایک مقام پر کفار کی ایک امید فاسد کا ذکر ملا۔ اور وہ بھی اللہ کی طرف سے کفار کو دیئے گئے جواب کی صورت میں۔ ابتدائے تبلیغ کے زمانے میں ایک بہت مختصر سورۃ نازل ہوئی، نام تھا سورہ کوثر، اس کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ﴿اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ ''اے رسولؐ! تمہارے دشمن کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔'' معلوم ہوا کہ رسولؐ کے گھر میں جتنی اولاد ہوئی وہ ہو ہو کر انتقال کرتی رہی، اور کفار یہ امید ظاہر کرنے لگے کہ رسولؐ کا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ کے بعد آپ کی نسل باقی نہیں رہے گی۔

کفار کو جو امید تھی وہ تو ظاہر ہوگئی لیکن سوال یہ ہے کہ کسی کی نسل رہے یا نہ رہے، اولاد ہو یا نہ ہو، اس بات سے کسی دوسرے کی امید کس طرح وابستہ ہوسکتی ہے۔ ہاں اگر کسی کے پاس کوئی قیمتی چیز ہو، جس پر کوئی دوسرا قبضہ جمانا چاہے، دوسرے کی نظر ہو، تو البتہ وہ یہ ضرور چاہے گا کہ صاحب مال کا کوئی وارث نہ ہو، تاکہ اس کی موت دوسرے کو مرنے والے کی ملکیت کا مالک بنادے۔ تو اب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر

بے پناہ مال و دولت کے مالک ہوتے تو کچھ لوگ یہ امید کر سکتے تھے کہ اگر حضورؐ دنیا سے کوئی اولاد چھوڑے بغیر چلے جائیں تو ان کی دولت ہاتھ آ سکتی ہے۔ لیکن ایک تو دولت تھی نہیں، اور اگر تھی بھی تو اس سے عام کفار مکہ کو کیا امید ہو سکتی تھی، اگر حضورؐ لاوارثیت میں کچھ چھوڑ کر جاتے بھی تو وہ ان کے خاندان والوں کے پاس آتا، کفار کے ہاتھ تو کچھ نہ آتا۔ چنانچہ اگر اپنی امیدوں کا رشتہ آنحضورؐ کی بے اولادی سے جوڑیں تو اس کا سبب درہم و دینار، سونا چاندی یا زمین جائیداد تو ہو نہیں سکتا۔ تو اب ایک ہی چیز تھی، اور وہ رسولؐ کا لایا ہوا دین تھا، جس نے کفار کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام حرام کر رکھا تھا۔ جس کو مٹانے کے خواب تو بہت دیکھے جا رہے تھے، لیکن تعبیر کسی کے پاس نہ تھی۔ اب جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد ہو ہو کر وفات پاتی رہی، تو ایک مرتبہ امید بندھی کہ چلو ابھی تو ان کا کام چلنے دو، ایک نہ ایک دن تو یہ بھی دنیا سے رخصت ہوں گے، تو جب اولاد نہ ہوئی تو ان کا پیغام آگے کون بڑھائے گا۔ ان کی باتیں ان ہی کی ذات پر ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنی امیدوں کا برملا اظہار کیا تو اللہ نے اپنے حبیبؐ کو خبر دی کہ ان کو امیدوں کے ہوائی قلعے بنانے دو ہم تمہارے مشن کو زندہ رکھنے کے لئے وارث دیں گے۔ ابتہ یہ کافر جو مشن کہتے ہیں، یعنی تمہارے دین کو مٹانے کا مشن، تو اللہ ان کو کبھی کامیاب نہ ہونے دے گا۔ اب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تو اللہ کا وعدہ پتھر کی لکیر تھا۔ لیکن کفار تو اللہ ہی پر ایمان نہیں لائے تھے تو بھلا وہ اللہ کے وعدے پر کیا یقین کرتے۔ چنانچہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا اور اسلام کو مٹانے کی تمام کافرانہ تدبیریں ناکام ہوتی جاتیں، ویسے ویسے ان کی امید اس بات سے بندھتی جاتی کہ جب رسولؐ کے بعد ان کا کوئی وارث نہ ہوگا، تو ان کے ساتھ ہی ان کا دین ختم ہو جائے گا۔

اب اللہ نے کہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ دشمن کے ابتر ہونے اور رسولؐ

کے ابتر نہ ہونے کے کیا معنی ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے اللہ کی دی ہوئی خبر کی ان الفاظ میں تشریح کر دی کہ ''اللہ نے تمام انبیاء کی ذریت ان کے صلب میں قرار دی ہے جب کہ میری ذریت علیؑ کے صلب سے قرار دی ہے۔'' اب اس ارشاد پر غور کریں تو بہت سے اہم نتائج سامنے آتے ہیں۔

ذریت سے عام طور پر اولاد مراد ہوتی ہے۔ تو کیا ارشاد رسالتؐ سے یہ سمجھ جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرما رہے ہیں کہ ان کے بیٹے بیٹیاں علیؑ کے گھر ہوں گے؟ یعنی شریعت نے جو احکام اولاد کے لئے مقرر کئے ہیں وہ اولاد علی علیہ السلام پر جاری ہوں گے؟ گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وراثت علی علیہ السلام کے بچوں کو ملے گی؟ تو مسلمانوں نے رسولؐ کی وراثت ان کی بیٹی کو ہی نہ دی تو بیٹی کی اولاد کو کیا دیتے۔

اور، مزید غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تو پوری انسانیت کا قانون ہے کہ اولاد باپ سے منسوب ہوتی ہے۔ نسل بیٹے سے چلتی ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے بارے میں ایک جداگانہ قانون بنا رہے ہوں، خود کو مستثنیٰ قرار دے رہے ہوں، تو استثنیٰ جتنے بڑے گروہ میں ہو اسی قدر زیادہ فخر کی بات ہے، امتیاز کی بات ہے۔ چنانچہ یہ ارشاد ہوتا کہ سارے انسانوں کی نسل بیٹوں سے چلتی ہے، لیکن میری نسل وہ ہوگی جو میری بیٹی سے چلے گی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تمام انسانوں کے مقابلے میں اپنا مقابلہ صرف گروہِ انبیاء سے کیا۔ پوری انسانیت کے مقابلے میں خود کو صرف گروہ انبیاء میں مستثنیٰ ٹھہرایا۔ تو تسلیم کرنے پڑے گا کہ رسولؐ اس نسل کی بات نہیں کر رہے جو تمام انسانوں کی نسل کہلاتی ہے۔ بلکہ وہ نسل نبوت کی بات کر رہے ہیں۔ کہ ہر نبی کے فضائل نبوت کا وارث اس کی اولاد میں ہوتا ہے، لیکن میری نبوت کے وارث علیؑ کی اولاد میں ہوں گے۔ اور پھر ایک قول میں وضاحت بھی فرما دی کہ علیؑ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے

تھی، فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں یعنی میرے وارث نبوت علی تم ہو، اور تمہارے بعد تمہاری اولاد ہے، بس فرق یہ ہے کہ دوسرے انبیاء کے وارث نبوت، نبی کہلاتے تھے، لیکن میرے وارث نبی نہیں، امام کہلائیں گے۔

چنانچہ اب تک کی گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ کفار آس لگائے بیٹھے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کا اسلام لاوارث رہ جائے گا۔ اور پھر بے سہارا اسلام ہوگا اور ہم ہوں گے۔ پھر اس دین کو ختم کر دینا ہمارے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ اور اب اگر یہ ارشاد ہو کہ آج کے دن کافر اسلام کی تباہی کے بارے میں مایوس ہو گئے، تو اس کا ایک ہی مطلب ہوگا کہ آج کے دن جو واقعہ ہوا ہے، اس میں اسلام کو کوئی وارث مل گیا ہے، جسے دیکھ کر کافروں کی تمام امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔

اور یہاں بلاغت قرآن کا ایک پہلو۔ جہاں ﴿يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ کہا گیا، وہاں صرف ﴿يَئِسَ كَافِرِيْنَ﴾ بھی کہا جا سکتا تھا۔ یعنی یہی کہنا ہے کہ کافر مایوس ہوگئے تو یہ طویل پیرایہ بیان کیوں اختیار کیا گیا کہ وہ لوگ مایوس ہوگئے جو کفر کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کفار ایک نام ہے اس گروہ کا جنہوں نے اسلام نہ قبول کیا ہو۔ لیکن کفر کرنا ایک ایسا کام ہے جو کوئی اسلام لانے کے بعد بھی کر سکتا ہے۔ گویا قرآن، کافر کی بجائے کفر کرنے والوں کا تذکرہ کر کے یہ بتا رہا ہے کہ اسلام لانے والوں میں بھی کچھ ایسے ہیں کہ جو آج بھی کفر سے وابستہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی خبر دی جا رہی ہے کہ آج صرف اعلانیہ کافر ہی مایوس نہیں ہوئے بلکہ علی علیہ السلام کی ولایت پر کچھ مبارکباد دینے والے بھی دل ہی دل میں مایوس ہوگئے کہ اب اسلام پر قبضہ جما لینے کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ اگر رسولؐ کا بتایا ہوا وارث کمزور ہوتا تو مخالفین خوش ہوتے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وارث اتنا زبردست ہے کہ اس سے اسلام چھین لینے کا امکان ہی نہیں رہ گیا۔ تب ہی تو وارث کو دیکھتے ہی مایوسی انتہا کو پہنچ گئی۔

فَلاَ تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ

اور یہیں اس جزو کلام کی بات بھی ہو جائے کہ ارشاد ﴿فَلاَ تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ﴾ اب تم کفر کرنے والوں سے نہ ڈرنا، اب تم ان کی پرواہ نہ کرنا، یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں یہ یاد رہے کہ اللہ سے ضرور ڈرتے رہنا، اس کے عذاب سے غافل نہ ہونا۔ گویا آج کے بعد اگر مسلمانوں کو کبھی تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اب اگر کبھی مسلمان کسی مصیبت کا شکار ہوا تو اس کا سبب کافر نہیں ہوں گے، بلکہ اس کی واحد وجہ یہ ہوگی کہ اس کے دل سے اللہ کا خوف نکل گیا تھا۔

اب یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ اگر ایک عمومی قانون کے طور پر یہ کہا جاتا کہ مسلمان کو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے تو بات واضح تھی۔ لیکن یہاں بات یوں کہی جا رہی ہے کہ پہلے ایک خبر سنائی گئی کہ آج کے دن، وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں وہ تمہارے دین کی تباہی کی امید سے مایوس ہو گئے۔ اس اطلاع کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اب تمہیں کفار سے نہیں ڈرنا، اب تم اللہ سے ڈرو۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس جملے کا مطلب یہ لیا جائے کہ کل تک اگر تم کافروں سے ڈرتے تھے تو کوئی بات نہیں تھی۔ بس آئندہ نہ ڈرنا نہیں، یہ بات بھی درست نہیں تھی۔ مسلمان سے تو کبھی یہ نہیں تھا کہ وہ اللہ سے نہ ڈرے اور کافروں سے خوف کھاتا رہے۔ یہ تو اسلام کی پوری فکر، پورے فلسفے ہی

کے خلاف ہوتا۔ اسلام تو جس دن سے آیا تھا اسی دن سے یہ سبق دے رہا تھا کہ ﴿لا حَوْلَ وَلا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے سوا نہ کوئی صاحب قوت ہے اور نہ اس کے سوا کوئی پناہ دینے والا ہے۔ اور اللہ کی یہ قوت مطلقہ کسی خاص دن اس کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی سے صاحب قوت و اختیار تھا اور ہمیشہ تمام قوتوں کا مالک رہے گا۔ پھر یہ کیا کہنا کہ آج کے بعد تم کافروں سے نہ ڈرنا بلکہ آج سے صرف اللہ سے ڈرنا۔ (یہ ''آج'' کا لفظ ایک تو جملے کے آغاز میں ''الیوم'' کی صورت میں آیا ہے اور پھر زیر بحث جزو کا پہلا لفظ ''ف'' اس کی تکرار کرتا ہے کیونکہ قواعد کی رو سے اس ''ف'' کا مطلب ہے ''اب اس کے بعد'' یعنی آج سے)۔ یہ بے خوفی کی تعلیم آج سے کیوں؟ آج کافر مایوس ہو گئے تو ان سے ڈرنا چھوڑ دو۔ اگر مایوس نہ ہوتے تو تم ان سے ڈرتے رہتے؟ اس الجھن کا میرے نزدیک ایک ہی حل ہے کہ بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں چاہیے تو یہ تھا کہ تم کبھی اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرتے۔ لیکن تم میں سے کچھ تھے کہ ان کے دل سے کافروں کا خوف نکلتا ہی نہ تھا۔ اسلام لا چکے تھے، پھر بھی کافروں کے خوف سے حکم خدا اور رسول ﷺ کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

کیا ایسے بھی مسلمان تھے جو کافروں سے تو ڈرتے ہوں اور اللہ سے نہ ڈرتے ہوں؟ تو یہ سوال تاریخ کا ہے۔ چنانچہ ایک مستند صفحۂ تاریخ کا حوالہ بات کو واضح کر دے گا۔ موقعہ وہ ہے جب کفار مکہ سے حدیبیہ کے مقام پر صلح ہوئی تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب ایک مرتبہ سنہ ۶ ہجری میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسلمانوں کی جماعت لے کر، عمرہ کے لئے، مکہ آئے اور کفار نے مسلمانوں کو عمرے سے روکا تو کافروں اور مسلمانوں میں مذاکرات شروع ہوئے۔ کافروں کے بہت سے نمائندے آتے رہے، اور مسمانوں سے اصرار کرتے رہے کہ وہ واپس چلے جائیں۔ کافر بار بار آتے اور اپنا موقف بیان

کرتے اور واپس چلے جاتے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی کو حکم دیا کہ مکہ شہر کے اندر جا کر کفار کے بڑوں کو بتاؤ کہ ہم لڑنے نہیں آئے۔ ہم تو صرف عمرہ کرنے آئے ہیں۔ مکہ میں داخل ہوں گے۔ خانہ خدا کا طواف کریں گے، قربانیاں دیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ جن محترم ہستی کو یہ کام سونپا جا رہا تھا ان کا نام تو آپ کتابوں میں دیکھیے گا، مجھے ان کے نام سے غرض نہیں۔ مجھے تو ان کے جواب کی بات کرنی ہے۔ تاریخ طبری میں محمد ابن جریر طبری نے (جلد اول، زیرِ عنوان صلح حدیبیہ)، مدارج النبوت میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے (۶ ہجری اور عمرہ حدیبیہ کے عنوان کے تحت)، اس صحابی کا جواب نقل کیا ہے۔ صحابی نے عرض کی: ''مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا خوف ہے۔ وہاں میرے قبیلے کا بھی کوئی فرد نہیں جو میری حمایت کر سکے۔ اور میری جان بچا سکے۔ آپ میرے بجائے فلاں صاحب کو بھیج دیجیے، ان کی مکہ میں بڑی عزت ہے۔ اور اہل مکہ سے ان کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔'' اب ذرا یہ بھی پیش نظر رکھیے گا کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمان ایک دفعہ نہیں، کئی مرتبہ کفار مکہ کو شکست فاش دے چکے ہیں۔ بدر، احد، اور خاص طور پر خندق کی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ مسلمان ایک سے زیادہ مرتبہ کفار کی طاقت کا زعم توڑ چکے ہیں۔ اب مسلمان کسی اعتبار سے بھی کفار سے کمزور نہیں ہیں۔ اور پھر جس کے سپرد پیغام رسانی کا کام کیا جا رہا ہے، وہ کوئی عام مسلمان نہیں، تاریخ کے دعوؤں کے مطابق وہ بڑی پُر جوش اور جرأت مند شخصیت کے مالک ہیں، اور پھر پیغام کی نوعیت بھی خالصتاً صلح جویانہ ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ پیغام سنتے ہی کفار مشتعل ہو جائیں گے اور یوں بھی کفار کے کئی نمائندے پہلے آ کر مسلمانوں کے پاس سے بخیریت واپس جا چکے تھے۔ ان سارے حالات کے باوجود اگر کوئی بلند مرتبہ مسلمان، محض کفار کی دہشت سے مرعوب ہو، اور اسے اندیشہ جان اس قدر خوفزدہ کر دے کہ وہ حکم رسولؐ کی بجا آوری سے

معذرت کرلے، تو پھر تو اس بات کے تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ یہ نامناسب سہی، اسلام کی تعلیم کے خلاف سہی، لیکن کچھ مسلمان ایسے تھے کہ ان کے دل میں خوف خدا ہو نہ ہو، کفار کا خوف ضرور تھا۔

تو اب اللہ کا یہ ارشاد واضح ہوگیا کہ "آج کے دن کفر کرنے والے مایوس ہوگئے اور اب تم کافروں سے نہ ڈرو، بلکہ اللہ سے ڈرو" مطلب یہ کہ تم میں سے کچھ ہیں کہ ان کو اللہ سے زیادہ کافروں کی ناراضگی کی فکر تھی۔ تو اب تو کافر بھی مایوس ہوگئے۔ اب تو اپنے بیجا خوف سے چھٹکارہ پالو۔ اب تو کافروں کا خوف دل سے نکالو۔ اب تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابندی کرو۔

کلام الٰہی کی بات تو سمجھ میں آ گئی، لیکن یہ تو اب بھی نہ پتہ چلا کہ آج واقعہ کیا ہوا تھا۔ اچانک کیا بات ہوگئی تھی کہ اللہ مسلمانوں سے کہنے لگے کہ اب تو کافروں سے نہ ڈرو۔ تو شاید بات اس مثال سے واضح ہوجائے۔

فرض کیجیے میرے گھر سے ملا ہوا ایک بہت بڑا باغ ہے۔ اس میں کئی گھنے سایہ دار درخت ہیں۔ میرے بچے سارا دن اس باغ میں کھیلتے ہیں۔ ایک دن رات کو ایک چھوٹے بچے کو یاد آیا کہ وہ اپنا ایک دلپسند کھلونا باغ ہی میں چھوڑ آیا ہے۔ اب بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب تک کوئی کھلونا ان کے پاس ہو، تو اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ لیکن ادھر انہیں اس کی دوری کا احساس ہوا اور ادھر انہوں نے اسی کھلونے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اب اس بچے کا کھلونا باغ میں تھا۔ اور اس کا اصرار تھا کہ کوئی باغ سے جا کر کھلونا اٹھا لائے۔ وہ جس سے بھی کہتا اسے یہی جواب ملتا کہ تم خود جاؤ اور اپنا کھلونا لے آؤ۔ لیکن بچہ ہے کہ کسی قیمت پر باہر جانے کے لئے تیار نہیں۔ بات اتنی سی تھی کہ باغ میں اندھیرا تھا۔ اور بچہ اندھیرے سے خوفزدہ تھا۔ اب بچے سے لاکھ کہیے کہ یہ خوف غیر منطقی

ہے، غیر عقلی ہے، سارا دن وہیں کھیلتے رہے ہو، اب کیا ہو گیا کہ وہاں جاتے ہوئے خوف آ رہا ہے۔ لیکن بچے کے لئے یہ ساری بحث بیکار ہے۔ دوسری طرف کھلونا آئے یا نہ آئے لیکن بچے کے دل سے یہ بے معنی خوف دور کرنا بھی ضروری ہے۔ تو میں کیا کروں گا یہی ناں! کہ بچے کے بڑے بھائی کو، کسی اور بڑے کو، جس کی قوت اور طاقت پر بچے کو اعتماد ہو، اشارہ کروں گا کہ تم ساتھ چلے جاؤ۔ ادھر قابل اعتماد بڑے کا ساتھ ہوا، ادھر میں نے بچے سے کہا، بس، اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اٹھو اور جا کر اپنا کھلونا لے آؤ

اب شاید بات واضح ہو جائے۔ کفار سے پہلے بھی ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن اس مسلمان کا کیا کیا جاتا جو بغیر کسی وجہ کے ڈر رہا تھا۔ چنانچہ آج جب یہ کہا جا رہا ہے کہ کفار سے نہ ڈرو تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آج رسولؐ نے اپنے ڈری سہمی امت کو کسی ایسے کے سپرد کر دیا ہے، جس کی قوت پر اس قدر اعتماد ہے کہ اس کی موجودگی میں ڈرپوک سے ڈرپوک شخص کے لئے بھی ڈرنے کا جواز نہیں رہا۔

اب وہ بہادر کون ہے؟ تو اس سوال کا جواب کسی طرح بھی دشوار نہیں۔ تمہیں جس بڑے کے، جس وارث کے حوالے کیا جا رہا ہے وہ تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے۔ کل کا وہ مرحلہ تو یاد ہی ہوگا کہ تمہیں ایک ایک کافر، ہزار ہزار جوانوں کے برابر نظر آ رہا تھا، تو اس بہادر نے اپنے عمل سے بتا دیا تھا کہ جس دل میں خوف خدا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے، کافر ہی نہیں، اگر کل کفر بھی آ جائے تو اس کا مقدر تباہی ہوتا ہے۔

اللہ رے وارث اسلام کی شان میں قرآن کی قصیدہ خوانی۔ ادھر زبان رسالتؐ کہہ رہی ہے کہ آج سے تمہارا آقا، تمہارا سید و سردار، تمہارا مولا، یہ علیؑ ہوگا۔ ادھر رسولؐ نے مسلمان کی باگ علیؑ کے ہاتھ میں دی، ادھر اللہ نے اعلان کر دیا۔ بس، خبردار، اب تمہارے دل میں کسی کافر کا خوف نہ آنے پائے۔ اب اللہ کے سوا کسی سے ڈرنے کو سمجھ

لینا تمہارے دل میں ضرور خوف ہے۔ علیؑ جیسے محافظ کا آسرا موجود ہو تو ڈرنا کیسا۔ اگر دنیا کی کوئی طاقت، کبھی تمہیں ڈرانے کی کوشش کرے تو گھبرانا نہیں۔ ایک مرتبہ علی علیہ السلام کو پکار لینا، سارا خوف دور ہو جائے گا۔

اور اب اسے دنیا کی ہر طاقت سے بے خوفی کی قیمت سمجھو یا اسے بے خوفی کے حصول کی لازمی شرط سمجھو، کہ باطل کا باطل خوف اسی وقت دور ہوگا جب تم خود کو اس سے وابستہ رکھو گے جس کے سپرد آج کیئے جا رہے ہو۔ اگر اس وارث سے رشتہ توڑا تو تمہارا خوف کبھی دور نہیں ہوگا۔ کبھی صاحب تخت و تاج تمہیں ڈرا دیں گے، کبھی تنگدستی و افلاس تمہارے ضمیر کا سودا کرا دیں گے۔ کبھی کثرت سپاہ تمہیں اپنا غلام بنا لیں گے۔ اور پھر انجام یہ ہوگا کہ تم کلمہ تو اللہ کا پڑھو گے، اور ہر طاقت باطل کو تسلیم کرو گے۔

آج اللہ کا رسولؐ جس کے ہاتھ میں تمہاری باگ ڈور دے رہا ہے، وہ ایسا ہی قوی اور توانا ہے کہ اسے دیکھتے ہی کفر کی صفوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اگر رسولؐ کا وارث کمزور ہوتا تو اہل باطل کی امیدیں جوان ہو جاتیں۔ یہ توقع ہو جاتی کہ اگر عہد رسالتؐ میں اسلام کو نقصان نہ پہنچا سکے تو اب تو امکان ہے کہ ہم اسلام کو ختم کر دیں گے۔ لیکن آج کے اعلان میں جب وارث اسلام کی صورت دیکھی تو ساری خوش فہمیاں دور ہوگئیں۔ یہ تو وہی تھا کہ جب تک اس کا بابا زندہ رہا، ہم نہ رسولؐ کو کوئی ضرر پہنچا سکے، نہ رسولؐ کے پیغام کی اشاعت کو روک سکے۔ اور پھر جب باپ کی جگہ بیٹے نے لی تو ایسا لگا جیسے کفر کی تلوار بھی کند ہوگئی ہے اور عقل بھی ماری گئی ہے۔ اگر کبھی سارے دانشوران دنیائے کفر سر جوڑ کر بیٹھتے، اور بہت غور و فکر کے بعد قتل رسولؐ کا منصوبہ بناتے، تو علی علیہ السلام لڑ کر نہیں، تلوار چلا کر نہیں، صرف بستر رسولؐ پر سو کر سارا منصوبہ خاک میں ملا دیتا۔ اور اگر کفر، اپنے تمام وسائل جمع کر کے، اسلام کو مٹانے کے لئے مدینہ پر حملہ آور ہوتا، تو اس کی

شجاعت و ہمت کافروں کی ایک نہ چلنے دیتی۔ علی علیہ السلام کے سامنے باطل کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ علی علیہ السلام کے مقابل آ کر اسے سانس لینے کا بھی موقعہ نہ ملتا۔ جب کبھی باطل، علی علیہ السلام کے سامنے آیا تو ضربت حیدری کی داد، کبھی ملک نے ﴿**لا فتی الا علیؑ لا سیف الا ذوالفقار**﴾ کہہ کر دی، کبھی زبانِ رسالتؐ نے عبادت ثقلین سے وزن کر کے دی۔ بیچارہ کفر تو زبان ہی نہ کھول پایا۔ اس نے اعتراف شجاعت علیؑ کیا بھی تو اس طرح کہ کبھی عمرو ابن عبدود کے سر و گردن نے جدا ہو کر اعتراف کیا، کبھی جسم مرحب نے دو برابر حصوں میں تقسیم ہو کر اعتراف کیا۔

دنیائے باطل کو شدید احساس بے بسی کا شکار بنا دینے والی شجاعت کا یہ منفرد سلسلہ ابو طالب علیہ السلام سے شروع ہو کر علی و حسن علیہما السلام سے ہوتا ہوا، جب حسین علیہ السلام تک پہنچا، تو کفر کی حسرت ناکام نے ایک مرتبہ سانس لینے کی کوشش کی۔ یزید کی طرف سے مطالبہ بیعت نہیں تھا۔ یہ تو حق پر فتح پانے کی موہوم امید کا ٹمٹماتا ہوا دیا تھا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ دامن حسینؑ کی ہوا کا ایک جھونکا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل کر دے گا۔ باطل سانس لینے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ یہ سانس نہیں ہوگی، باطل کی آخری ہچکی ہوگی۔ لیکن وقت نے دنیائے باطل کی تمام خوش فہمیوں کے بت چکنا چور کر دیئے۔ کل حسین علیہ السلام سے بیعت طلب کرنے والا یزید، آج اپنے سامنے حسین علیہ السلام کے بیٹے کو پابہ زنجیر دیکھ رہا تھا، لیکن نہ تو اس میں جرأت تھی، نہ اس کے بعد اس کی نسل میں کسی کی جرأت ہوئی کہ وہ پھر کسی فرزند حسین علیہ السلام سے مطالبۂ بیعت کر سکے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ١٧

تکمیل دین

نزول اور حفاظت قرآن پر گفتگو کرتے ہوئے، سلسلۂ کلام سورۂ مائدہ کی تیسری آیت کے ایک جزو تک پہنچا ہے، جس میں گوشت کی حرام اقسام کے بیان کے ساتھ، ایک خاص دن کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسا خاص دن، جس دن رونما ہونے والے کسی خاص واقعہ نے اسلام کو کئی اعزازات سے نوازا ہے۔ اس واقعہ سے اسلام کے دشمن مایوسی کا شکار ہوگئے، کفار کا خوف قلب مسلم سے نکال دیا گیا، دین مکمل ہوگیا، اللہ کی اپنے بندوں پر نعمتیں تمام ہوگئیں، اور اللہ نے اسلام کو قیامت تک اپنا پسندیدہ دین قرار دے دیا۔

یہ کیا واقعہ تھا، جس کے ظہور نے دامن اسلام کو اتنے گراں قدر اعزازات سے نواز دیا؟ مفسرین نے، مؤرخین نے اپنے قیاس کے رہوار کی بڑی جولانیاں دکھائیں۔ تاریخ اسلام کے صفحے پلٹے گئے۔ اور کئی واقعات بیان کیئے گئے۔ کچھ نے تو کہہ دیا کہ یہ واقعہ صرف گوشت کی بعض اقسام کے حرام کیئے جانے کا واقعہ ہے۔ کچھ نے اسے روز بعثت رسولؐ اور غارِ حرا میں جبرائیل کے پہلی مرتبہ آنے سے ربط دیا۔ کچھ نے کہا: یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ سورۂ برآت کے نزول کا واقعہ ہے۔ یہ سب مفسرین کی

ذاتی رائے ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ کسی تابعی کی رائے ہے۔ کسی ایک قیاس کے لئے کوئی سند نہیں ہے۔ البتہ ایک اور شانِ نزول ہے جسے رائے کی طور پر نہیں، اندازے کی صورت میں نہیں، اپنے قیاس کی شکل میں نہیں، بلکہ امرِ واقعہ کے طور پر، ایک واقعہ کے چشم دید گواہ کے طور پر، ایک دو نے نہیں، بیسیوں حضرات نے، مختلف مسلکی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہوئے، ایک اور واقعہ بیان کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری حج سے واپس آ رہے تھے۔ تو آپ نے خم غدیر کے مقام پر تمام جانے والوں کو روک کر ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اور اس خطبے میں اعلان کیا کہ آج سے جس جس کا میں مولا ہوں، یہ علی اس کا مولا ہے۔ ادھر یہ اعلان ختم ہوا، ادھر اللہ نے اعلان فرمایا کہ آج کافر مایوس ہو گئے اور آج تمہارا دین مکمل ہو گیا۔ اب ان قیاس آرائیوں میں سے کوئی قیاس درست ہے، یہ خم غدیر والی روایت صحیح ہے، اس پر تاریخ کے حوالے سے بحث تو بعد میں ہو گی، ابھی تو ہم سب سے مستند ذریعہ، سب سے یقینی راوی، قرآن مجید کی رہنمائی میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس واقعہ کی نوعیت کیا ہے۔ قرآن حکیم خود اس واقعہ کی کیا خصوصیات بتا تا ہے۔

چنانچہ گزشتہ گفتگو میں ہم نے سب سے پہلے تو اس امکان کو رد کیا کہ کفار کی مایوسی سے لے کر، اسلام کے بطور آخری دین کے انتخاب تک کے تمام اعلانات کا کوئی تعلق گوشت کی بعض اقسام کے حرام ہونے سے نہیں ہے۔ پھر ہم نے قرآن مجید ہی کے ارشادات کی روشنی میں اصل واقعہ کے خدوخال کو پہچاننے کی کوشش کی۔ چنانچہ قرآن نے بتایا تھا کہ آج کے دن جو واقعہ ہوا اس سے کافر مایوس ہو گئے۔ اور قرآن ہی کی رہنمائی میں، کفار کی مایوسی سے معلوم ہوا کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دین اور پیغام کی حفاظت کے لئے کوئی وارث مقرر کیا ہے۔ پھر قرآن نے بتایا کہ آج کے واقعہ کے بعد

مسلمانوں کو کافروں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اب انہیں چاہیئے کہ صرف اللہ سے ڈرا کریں۔ اس ارشاد سے پتہ چلا کہ اسلام کو صرف وارث نہیں ملا، بلکہ ایک زبردست وارث ملا ہے، جس کی جرأت و ہمت نے کفار سے ڈرنے کا ہر جواز ختم کر دیا ہے۔ اب ایسے رہنما کی موجودگی میں خدا کے علاوہ کسی اور سے ڈرنا پہلے ناسمجھی تھا، اب حماقت ہوگا۔

٭ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ٭

نزول آیت سے تعلق رکھنے والے اس واقعہ کی ان دو صفات کے بعد، قرآن مجید نے ایک اور صفت بتائی۔ ٭ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ٭ کہ اس واقعہ نے تمہارے لیئے، تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ کہنے کو یہ ایک جملہ ہے لیکن اس مختصر اعلان کی قدر و قیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھیے۔ یہ کیسی خوشی کا دن ہے، کتنے اطمینان کا دن ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس کے سپرد اسلام پہنچانے کا عظیم اور مشکل کام تھا۔ ۲۳ سال گزر گئے۔ اللہ کے رسولؐ نے نہ دن کو دن سمجھا، نہ کوئی رات اطمینان کی رات بن کر آئی۔ مصیبتیں اٹھائیں، پتھر کھائے، کانٹوں کے زخم سہے، شعب ابو طالب کی سختیاں جھیلیں، اپنوں کو غیر بنتے دیکھا، وطن سے بے وطن ہوئے، جنگیں لڑیں، عزیزوں کے داغ اٹھائے، وحشیوں کے مظالم برداشت کیئے، ناسمجھوں کو اس قابل کیا کہ وہ اللہ کے احکام کو سمجھ سکیں، اس بے پناہ محنت کے بعد، جس اللہ نے اسلام پہنچانے کا کام سپرد کیا تھا، اس نے سند دے دی اے حبیب آج جو کام آپ نے کیا ہے، اس کے ہوتے ہی آپ کا پورا کام، آپ کا دین، مکمل ہو گیا۔ یہ جملہ سن کر رسولؐ کی ساری تھکن دور ہو گئی ہوگی۔ ساری اذیتیں فراموش ہو گئی ہوں گی۔ سر نیاز، ادائے شکر میں، بارگاہ خداوندی میں جھکا دیا ہوگا، پروردگارا! تیرا شکر ہے، کہ تو نے میری محنتوں کو قبولیت کی سند دے دی، تو نے اپنے رسولؐ کے کام کو مکمل قرار دے دیا۔ اب دنیا انصاف کرے جس واقعہ کے نتیجہ میں خود ذات

رسالتؐ اس قدر خوش ہو، اس واقعہ کے رونما ہونے پر، اپنے نبیؐ کی خوشیوں میں شریک ہوکر، مسلمانوں کو اس دن عید منانی چاہیے یا نہیں؟ اب اگر سال کے کسی بھی دن کو، یوم تکمیل دین سمجھ کر مسلمان عید مناتے ہیں، تو جو واقعہ اس خاص دن ہوا ہوگا، وہی ان آیت کا شان نزول ہوگا۔ اور اگر کوئی مسلمان سرے سے کسی دن کو بھی یوم تکمیل دین قرار دے کر، بطور عید، نہیں مناتا تو پھر محبت رسول کا دعویٰ محتاج ثبوت رہے گا۔

کیا دین میں جبر ہوسکتا ہے؟

خیر، یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اللہ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہمیں تکمیل دین کے مرحلے کو پہچاننے میں کیا مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ دین کے دو بنیادی پہلو ہیں۔ ہمارے تمام عقائد، توحید، نبوت، قیامت سب دین ہیں۔ اسی طرح تمام اعمال، نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ سب دین ہیں یعنی یوں کہہ لیجیے کہ جسے ہم اصول دین کہتے ہیں وہ بھی دین، اور جسے فروع دین کہتے ہیں وہ بھی دین۔ اب ایک سوال ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہیں جو نہ ہمارے تصور توحید کو مانتے ہیں، نہ اللہ کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ لوگ گمراہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کی اصلاح کی جائے، انہیں حق وصداقت کا راستہ دکھایا جائے۔ لیکن کیسے؟ کیا جو نہ مانے اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جائے؟ ان پر سختی کی جائے؟ ان سے اصرار کیا جائے کہ اللہ پر ایمان لے آؤ، جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی آخر الزمان تسلیم کرو، ورنہ تمہاری جان سلامت نہیں رہے گی۔ کیا اسلام اس طرزِ عمل کی اجازت دیتا ہے؟ خیال رہے، میں شریعت اسلامی کا جواب پوچھ رہا ہوں، اہل سیاست واقتدار کے انفرادی رویہ کی بات نہیں ہو رہی۔ نہ ان علم وخرد سے عاری لوگوں کا طرز عمل زیر بحث ہے جو ہر مسئلہ کا حل تشدد اور

قوت کے استعمال ہی کو سمجھتے ہیں۔ تو اسلام کیا کہتا ہے؟ کیا توحید کو نہ ماننے والوں پر سختی کی جائے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ رکھنے والوں سے زبردستی کی جائے؟ کیا اسلام اس طرزِ عمل کی اجازت دیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اس کی اجازت ہوتی تو سب سے اچھا موقعہ تھا کہ بدر کے قیدیوں کے سامنے شرط رکھ دی جاتی کہ اسی کو آزادی ملے گی جو اسلام قبول کرلے گا۔ مدینے کے یہودیوں سے کہا جاتا کہ تمہیں یہاں رہنا ہے تو پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ کا نبی تسلیم کرو۔ لیکن یہ سب نہیں ہوا۔ بلکہ رسولؐ سے کہہ دیا گیا کہ تمہاری ذمہ داری صرف اسلام پہنچانا ہے۔ ۞ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ ۞۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے، ان کی سمجھ اور ان کا نصیب۔ جو مانے وہ اسلام کی حقانیت اور صداقت کو مانے، وہ قوت اور طاقت کے سامنے سر نہ جھکائے۔

اب تصویر کا ایک اور رخ۔ متفقہ ارشادِ رسالتؐ ہے کہ اپنے بچوں کو بالغ ہونے سے پہلے نماز سکھاؤ۔ اور جب بارہ سال کے ہو جائیں اور نماز میں سستی کریں تو ان پر سختی کرو۔ اسلامی معاشرے میں بلا وجہ، محض عادتاً نماز جماعت نہ پڑھنے والوں پر بھی سختی کا حکم ہے۔ روزہ کے سلسلے میں بھی احکام ہیں کہ مجمع عام میں، راستے میں کھانے پینے سے پرہیز کیا جائے۔ اور ایسا کرنے والا لائق سزا ہوگا۔ ان عبادات کے علاوہ معاملات میں، معاشرتی قوانین میں، اسلام کے قوانین کو توڑنے والے، سخت رویہ اختیار کیا جائے گا۔

اعمال میں جبر کی توجیہہ

اب بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی ہے۔ ایک طرف دین کی کچھ باتیں ہیں جن میں کوئی زبردستی، کوئی جبر نہیں ہے۔ انہیں ساری انسانیت کے سامنے رکھا جائے گا لیکن تسلیم کرنا، نہ کرنا ہر شخص کا ذاتی فیصلہ ہے۔ دوسری طرف اسی دین کے کچھ فرمان ہیں کہ

جن کو نہ ماننے پر سختی بھی کی جائے گی، زبردستی بھی کی جائے گی۔ اگر مزید توجہ فرمایئے گا تو معلوم ہوگا کہ جن باتوں میں انسان کو اپنا فیصلہ خود کرنا ہے، وہ سب اعتقادات ہیں، اصول ہیں۔ ور جن باتوں کو بے چون و چرا تسلیم کرنا ہے۔ خواہ ان کی منطق یا مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ایسی ساری باتیں اعمال کی، فروع کی باتیں ہیں۔ یہ دوہرا رویہ کیوں ہے؟ ضمناً وضاحت کر دوں۔ بات یہ ہے کہ انسان کے اختیار اور آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اسے پورا موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی عقل و فہم سے کام لے کر اپنے لئے جو نظام، جو ڈسپلن چاہے منتخب کرے۔ لیکن جب انسان ایک نظام کا، بہ رضا و رغبت انتخاب کر لیتا ہے تو اب ضروری ہے کہ اس نظام کے سارے قواعد و ضوابط کی پوری طرح پابندی کرے۔

کوئی شخص فوج میں ملازمت کرنا چاہے یا نہ کرنا چاہے، یہ اس کی مرضی، اسے فوج میں بھرتی ہونے کے لئے مجبور کرنا اس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ چاہے فوج کی ملازمت اس کے لئے کتنی فائدے کی بات ہو۔ اور فوج سے باہر رہنا اس کے لئے کتنا نقصان دہ ہو۔ لیکن انتخاب کا حق اسے فطرت نے دیا ہے۔ اس حق کو چھیننا اس کے آزادی پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پوری آزادی سے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ فوج کی ملازمت اختیار کرے گا، تو اب فوج کے جتنے بھی قوانین ہیں ان کی پابندی اس پر لازمی ہو جائے گی۔ اب اسے وہی لباس پہننا ہے جس کی فوج اجازت دے۔ اسی طرح رہنا پڑے گا جس طرح رہنے کا فوج تقاضہ کرے۔ اب اسلام کے اصول و اعتقادات اسلامی نظام حیات کی بنیاد ہیں، اور فروع یا اعمال اسلامی نظام کا طریق کار ہے۔ چنانچہ اصولوں کو سوچ سمجھ کر، اچھی طرح جان کر تسلیم کرنا ہوگا۔ سمجھ میں آئیں تو انسان مان لے، نہ سمجھ میں آئیں، نہ مانے۔ لیکن جب اسلام کے اصولوں کو مان لیا اور خود کو اسلام کے سپرد کر دیا تو اب اس کے تمام قوانین کو، تمام احکام کو بغیر ہچکچاہٹ کے تسلیم کرنا ہوگا۔ انسان مسلمان

ہونے سے انکار کر سکتا ہے۔ لیکن مسلمان ہو کر اس کے قوانین سے انکار نہیں کر سکتا۔ چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ سمجھ کر نماز ادا کرے گا تو تمام عبادتوں سے پوری طرح فیض اٹھائے گا۔ لیکن نہ سمجھنا کسی قانون میں رعایت نہیں دلائے گا۔

اب یہ واضح ہو گیا کہ اصول میں، عقائد میں، ایمان میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اور فروع میں، اعمال میں، معاملات میں اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول بھی دین ہیں اور فروع بھی دین ہیں۔ توحید و نبوت، قیامت بھی دین ہے اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہ بھی دین ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دین سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

دین سے مراد اصول دین ہیں

اب میں آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا سورہ بقرہ میں آیت الکرسی کے ایک معروف جملے کی طرف۔ ارشاد ہوا

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

دین میں کوئی جبر نہیں، کوئی زبردستی نہیں۔ ابھی ہم دیکھ چکے کہ ایمان کی باتوں میں، اصول دین میں کوئی جبر نہیں لیکن عمل میں، فروع دین میں تو جبر ہے۔ اگر آدھے دین میں جبر نہیں اور آدھے دین میں جبر ہے تو جس طرح یہ کہنا درست ہوگا کہ دین میں جبر نہیں، اسی طرح یہ بھی درست ہوگا کہ دین میں جبر ہے۔ تو اس الجھن کا جواب یہ ہوگا کہ دین ایمان بھی ہے اور عمل بھی، دین اصول بھی ہے اور فروع بھی، لیکن سورہ بقرہ کی اس جزو آیت سے پتہ چلا کہ قرآن مجید لفظ دین کو کسی اور وضاحت، شرح یا خصوصی پس منظر کے بغیر استعمال کرتا ہے، دین کو ایک لفظ واحد کے طور پر بیان کرتا ہے تو دین سے

مراد صرف ایمان ہوتا ہے، صرف اصول دین پر بات ہو رہی ہوتی ہے۔ گویا جب کہا گیا: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾، تو اس سے مراد یہ ہے کہ ایمان کی باتوں کو منوانے کے لئے کوئی جبر نہیں۔ اصول دین زبردستی نہیں منوائے جائیں گے۔

تو اس آیت نے بتایا کہ جب دین کا لفظ بغیر کسی حوالے کے استعمال ہو تو اس کا مطلب ہے ایمان، اصول اب پھر قرآن کا ارشاد ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾، آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ یہاں بھی لفظ دین کسی لاحقے، کسی سابقے، کسی شرط کے بغیر ہے۔ تو ایسی صورت میں اس جزو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آج کے دن تمہاری نمازیں، تمہارے روزے مکمل نہیں ہوئے۔ بلکہ آج تمہارے ایمان کے موضوعات میں کسی بات کا اضافہ ہوا ہے، آج تمہارے اصول دین مکمل ہوئے ہیں۔

ہم تلاش میں نکلے تھے ''الیوم'' کی تاریخ کی۔ تو اب پتہ چلا کہ آیہ تکمیل دین کسی ایسے دن اتری ہے جس دن ایمان مکمل ہوا ہے، جس دن اصول دین میں کسی بات کو شامل کیا گیا ہے۔ اب مفسر قرآن نے اس آیت کی شان نزول میں جن جن واقعات کا امکان بتایا ہے، ان سب کو اس کسوٹی پر پرکھ لیجیے۔ اگر گوشت کی کچھ اقسام کا حرام ہونا ایمان کا جزو ہے، جبرئیل کا غار حرا میں آنا اصل دین ہے، فتح مکہ تاریخ کے بجائے عقیدہ ہے، سورہ برآت کو کافروں تک پہنچانا ایمان کا جزو ہے، تو امکان ہے کہ آیہ تکمیل دین ان میں سے کسی کے لئے اتری ہو۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی بات بھی ایمان نہ ہو تو ان تمام قیاس آرائیوں کو ''الیوم'' سے الگ رکھ دیجیے۔

دوسری طرف علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان کا واقعہ ہوا، اور صرف اعلان پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ پہلے اپنی ولایت کا اقرار کرایا جائے، اور وہ بھی اس طرح ''کیا مجھے

تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ اختیار نہیں ہے؟ کیا میں تمہارا، تمہاری جانوں کا مولا نہیں ہوں؟'' اور مسلمان اس بات کو پہلی مرتبہ نہ سن رہا ہو بلکہ اس سے پہلے قرآن نبی کی ولایت کا اقرار کرا چکا ہو اور یہ اعلان ہو چکا ہو کہ

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾۔

(سورۂ احزاب، ۳۳، آیت ۶)

نبی کو مؤمنین کی جانوں پر مؤمنین سے زیادہ اختیار ہے۔ اب نبی کی یہ ولایت کسی عمل کا نام نہیں ہے، یہ فروعات میں سے کوئی فرع نہیں ہے، یہ ایمان کا مسئلہ ہے، عقیدے کی بات ہے، اصولوں میں سے ایک اصل ہے۔ جو مسلمان نبوت کے اس خاص اختیار کو نہیں مانتا وہ نبوت ہی کو نہیں مانتا۔ اب پہلے تو رسولؐ نے اپنی ولایت پر ایمان کا اقرار کرایا اور اس کے بعد کہا جو میری ولایت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ علی علیہ السلام کو اپنا ولی تسلیم کرے، علی علیہ السلام کی ولایت پر ایمان لائے۔

اب ایک مرتبہ پھر میں تمام حاصل شدہ نتائج دہرا دوں۔ قرآن جب لفظ دین کسی وضاحت کے بغیر استعمال کرتا ہے تو اس کی مراد اصول ہوتے ہیں فروع نہیں، ایمان ہوتا ہے عمل نہیں، پس جب اس نے ایک خاص دن دین کی تکمیل کا اعلان کیا تو اس دن اسلام کے اصول مکمل ہوئے۔ اب یوم تکمیل دین کے بارے میں جتنے بھی امکانات بتائے گئے ان میں سے کوئی عمل تھا، اور کوئی تاریخ کا واقعہ، صرف ایک خم غدیر کا واقعہ تھا کہ جس کی نوعیت خالصتاً ایمانی تھی، اصولی تھی۔ اور اس کی ایمانی حیثیت کو اور واضح کر دیا گیا خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت کے اقرار سے۔ تو جب قرآن کے اعلان تکمیل دین کے تقاضے صرف ولایتِ علی کے اقرار پر پورے اترتے ہوں، تو دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ آیۂ تکمیل دین خم غدیر میں ولایت علی کے اعلان پر اتری اور دوسری یہ کہ علی کی

• امامت کو ماننا جزوِ ایمان ہے، اصولِ دین ہے۔

اصول اور فروع کا فرق

میرا محترم مجمع اصول اور فروع کی اصطلاحوں سے واقف ہے۔ لیکن جن کے لئے ان الفاظ کے معنی واضح نہیں ہیں میں نے ان کی سہولت کے لئے اصول کے ساتھ ایمان، اور فروع کے ساتھ اعمال کے متبادل الفاظ کا استعمال بھی کیا۔ یہ دونوں پہلو اہم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنایا نہیں جا سکتا۔ ضروری ہے کہ ہر مسلمان ایمان بھی رکھتا ہو اور اعمال بھی بجا لاتا ہو، اصولِ دین کو بھی مانتا ہو اور فروعِ دین پر بھی عمل پیرا ہو۔ کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر مکمل نہیں۔ اپنی یکساں اہمیت کے باوجود ان دونوں میں کچھ فرق بھی ہیں، کچھ امتیازات بھی ہیں، جن کی وجہ سے ان دونوں کو الگ الگ عنوان دیئے گئے۔

مثلاً فروع یا اعمال میں حالات کے تحت کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، سفر میں تھے تو چار رکعت کی نماز چھوٹی ہو کر دو رکعت کی رہ گئی۔ بیمار ہوئے تو واجب روزہ عارضی طور پہ معاف ہو گیا۔ وسائل نہیں تھے، معاشی دشواریاں درپیش تھیں، نہ حج واجب ہوا نہ زکوٰۃ کا ادا کرنا واجب ہوا۔ اور صرف یہی نہیں، اعمال کی ادائگی کا وقت بھی مقرر، بعض حالات میں جگہ بھی مقرر۔ اب مقررہ وقت میں، مقررہ مقام پر کوئی موجود ہے تو عمل بجا لائے ورنہ یا تو اس سے عمل کا مطالبہ ہی نہ ہوگا، یا اسے عمل کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ رات دو بجے آنکھ کھل گئی، سوچا پتہ نہیں بعد میں اٹھیں، نہ اٹھیں تو کیوں نہ صبح کی نماز ابھی پڑھ لیں۔ لیکن ایسی نماز، سرے سے نماز ہی نہیں، جب وقت شروع ہوگا تب پڑھنی ہوگی۔ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے، تو اب مکہ جائے بغیر امریکہ ہی میں حج کر لیں۔ اگر اللہ یہی چاہتا ہے کہ

مسلمان حج کے دوران شدید گرمی کا سامنا کرے تو امریکہ کے صحرائے نوادا میں بھی شدید گرمی پڑتی ہے، افریقہ کے صحرائے اعظم میں بھی قیامت کا سماں ہوتا ہے، تو ان مقامات پر حج کرلیا جائے۔ لیکن اب اجازت نہیں۔ گویا اعمال حالات کے تابع ہیں۔ اب کیا ایمان بھی حالات سے متاثر ہوتا ہے؟ کیا بیمار کی توحید صحت مند کی توحید سے مختلف ہوگی؟ کیا انگلستان میں عقیدۂ رسالت اور ہے، اور پاکستان میں اور ہے؟ گویا اعمال میں، فروع میں حالات کے مطابق چھوٹ ہے، رعایت ہے، رخصت ہے۔ لیکن ایمان میں، اصولوں میں کسی وقت، کسی مقام پر کوئی رخصت نہیں ہے۔

پھر فروع میں امکان ہے کہ ایک شخص نماز تو پڑھتا ہو لیکن کسی وجہ سے روزے نہ رکھے۔ یا نماز روزہ دونوں بجالاتا ہو لیکن حج نہ کرے۔ یعنی اعمال میں جزوی طور پر عمل کرنا ممکن ہے۔ دوسری طرف اصولوں کے معاملے میں تمام اصولوں کے معاملے میں تمام اصولوں کو ہر حال میں ماننا پڑے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ توحید پر ایمان ہو اور رسالت کو نہ مانا جائے، رسالت پر ایمان ہو اور امامت کو نہ تسلیم کیا جائے۔ جو بھی ایمان لائے گا اس کے لئے ضروری ہے کہ تمام اصولوں پر ایمان لائے۔

اور ایک اور اہم، بلکہ اہم ترین فرق سن لیجیے۔ اعمال میں سے اگر کوئی مسلمان کسی عمل کا تارک ہو، کسی عمل کو چھوڑ دے تو گنہگار ہوگا لیکن مسلمان رہے گا، لیکن اصولوں میں سے کسی اصول کو چھوڑ دے گا تو اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ مسلمان ہی نہیں رہے گا۔

اب ہم دیکھ چکے کہ ولایت علیؑ جزوِ ایمان ہے، اصول ہے، تو اس میں نہ کسی وقت رعایت ہوگی، نہ کسی قسم کی رخصت ہوگی، نہ اسے ترک کیا جا سکے گا، اور نہ اس کو نہ ماننے والا خود کو مسلمان کہلانے کا مستحق ہوگا۔

کلمہ اور ولایتِ علیؑ کا اقرار

اور یہاں ایک ضمنی نتیجہ، مسلمانوں میں بحث ہوتی ہے کہ کلمہ میں اقرار توحید، اور اقرار رسالتؐ کے بعد ولایت علی کا اقرار کیوں؟ تو صرف یہ پیش نظر رکھیے کہ قرآن کے زیر بحث ارشاد کے مطابق ایمان مکمل نہیں تھا جب تک اس میں ولایت علی شامل نہ ہوگئی۔ جب علی ابن ابی طالبؑ کی ولایت کے اعلان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوا تھا، تو ولایت علی کے اقرار کے بغیر کلمہ ایمان کیسے مکمل ہوسکتا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی تشریح پر ایک نظر

اور یہاں ارشادِ الٰہی سے اگر کسی نے کچھ مختلف مفہوم پیدا کیا ہے تو اسے نظر انداز کرنا انصاف نہ ہوگا۔ چنانچہ برصغیر میں تفسیر قرآن کے سلسلے میں ایک بڑا نام جناب عبدالماجد دریابادی کا ہے۔ وہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

> ''اس کمال دین واتمام نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم، اضافہ، تصرف کی گنجائش نہیں رہی، نہ کسی نبی کی حاجت۔ ختم نبوت پر اگر دلائل صریحہ موجود نہ ہوتے تو یہاں سے بھی مسئلہ کا استنباط ہوسکتا تھا۔ شیعی عقیدۂ امامت کا، جو درحقیقت اجرائے نبوت کی ہی ایک شکل ہے، رد بھی یہیں سے نکل آتا ہے۔''

اب میں نے مولانا عبدالماجد کا قول نقل کیا ہے تو مجھے اس بات کی بھی اجازت دیجیے کہ کچھ وقت اس قول کو سمجھنے پر بھی صرف کروں۔ مولانا نے جو تکمیل دین کے اعلان کو ختم نبوت کی دلیل قرار دیا ہے۔ اس پر گفتگو بعد میں کروں گا، پہلے اس جملے پر بات

جائے جو انہوں نے شیعوں کے عقیدۂ امامت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ دین کے کامل ہونے سے شیعی عقیدۂ امامت بھی رد ہو جاتا ہے جو، بقول ان کے، حقیقت میں اجرائے نبوت، یعنی نبوت کے جاری رہنے کی ہی ایک شکل ہے۔ اس آیت سے شیعوں کا عقیدۂ امامت غلط ثابت ہو یا نہ ہو، کم از کم آپ نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ گو منفی سہی، تکمیل دین کا کچھ نہ کچھ تعلق عقیدۂ امامت سے ہے ضرور۔ یعنی گوشت کے حلال و حرام کے احکام، سورۂ برأت کا نزول، فتح مکہ اور غارِ حرا میں جبرئیل علیہ السلام کی آمد سے تو تعلق ٹوٹا۔ اور یہ ماننا پڑا کہ یہ جزوِ آیت ختمِ نبوت اور شیعوں کے عقیدۂ امامت سے تعلق رکھتی ہے۔ اب یہ تعلق کس قسم کا ہے؟ تو بے دلیل جس کا جو دل چاہے کہے، لیکن کوئی بات اس وقت ہی قابلِ توجہ ہوگی جب اس کے ساتھ کوئی دلیل ہو۔

چونکہ مولانا عبدالماجد دریابادی ایک مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی ہیں، اس لئے مجھے حق پہنچتا ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ فلاں آیت ختمِ نبوت کی دلیل ہے اور اجرائے نبوت یعنی نبوت کے جاری رہنے کے عقیدے کو رد کرتی ہے، تو اس جملے کا مطلب کیا ہے یہی ناں کہ آیت جس بات کی دلیل دیتی ہے وہ درست ہے اور جس بات کو رد کرتی ہے وہ غلط ہے۔ اب ذرا غور فرمایئے۔ مولانا کے نزدیک جو بات درست ہے وہ ہے ختمِ نبوت، یعنی نبوت ختم ہوگئی۔ اور جو بات رد ہوگئی ہے وہ ہے اجرائے نبوت۔ یعنی نبوت کا جاری رہنا غلط ثابت ہوگیا۔ ختم اور اجراء کے الفاظ جب ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے تو ختم کا مطلب ہوگا مٹ جانے والی، نہ رہنے والی، اور اجراء کا مطلب ہوگا رہنے والی، جو موجود ہو، جو جاری ہو۔ گویا مولانا کے الفاظ کا مفہوم یہ نکلا کہ مولانا کی نظر میں یہ بات ثابت ہے کہ حضور کی نبوت ختم ہوگئی اور شیعوں کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ آپ کی نبوت جاری ہے۔ تو اب کسی اور کو منصف بنانے کی ضرورت نہیں،

آپ خود فیصلہ کیجیے کہ صحیح کون ہے، وہ جو یہ کہتا ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ختم ہوگئی، یا وہ جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کی نبوت قیامت تک جاری رہے گی۔

ختم نبوت کی غلط اصطلاح

ہم ایک صاحب علم کے فاضلانہ بیان پر گفتگو کر رہے ہیں۔ اور ایسی گفتگو میں کوئی لفظی بحث چھیڑ دینا مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن جب الفاظ صریحاً گمراہ کر رہے ہوں تو ان پر توجہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور خصوصاً اس وقت جب ایک فریق خود کو اتنا با اختیار سمجھے کہ جو عقیدہ، جو نظریہ چاہے دوسرے فریق سے منسوب کر دے، تو دوسرے فریق کو اتنا حق تو دیجیے کہ وہ کم از کم آپ کے الفاظ سے ظاہر ہونے والے صریح مطلب و معنی کو تو بیان کر سکے، اس پر تو بحث کر سکے۔

طول کلام کا خوف نہ ہوتا تو میں مثالوں سے واضح کرتا کہ بات خواہ کتنی نیک نیتی سے کی جائے، کتنے خلوص اور سچائی کے ساتھ کی جائے، اگر الفاظ غلط ہوں گے، غیر موزوں ہوں گے، تو نیت کی سچائی زیادہ دیر تک کام نہیں آئے گی۔ اچھے اور درست خیال کو بیان کرنے کے لئے غلط الفاظ کا انتخاب بعد میں خیال کو بھی گمراہ کر دیتا ہے۔ ختم نبوت کی اصطلاح بہت رائج سہی، بہت مشہور سہی، لیکن اس پر اہل علم کی توجہ درکار ہے۔ یہ کوئی مسلکی اختلاف نہیں ہے کہ بلاجواز، محض ایک شیعہ کی زبان سے ادا ہونے کی وجہ سے دفاع کے لئے آستینیں الٹ لی جائیں ...قرآن مجید نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ارشاد فرمایا کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ (سورہ احزاب، ۳۳، آیت ۴۰) ہم نے اس ارشاد کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ختم نبوت کی اصطلاح گھڑ لی۔ حالانکہ یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ انبیاء کا ختم ہونا اور بات ہے اور نبوت کا ختم ہونا اور بات ہے۔

اسی طرح انبیاء کا جاری رہنا اور بات ہے اور نبوت کا جاری رہنا بالکل مختلف بات ہے۔ اگر انبیاء کے سلسلے کو ختم مانیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آخری نبی کی نبوت جاری ہے۔ اور اگر کسی نبی کی نبوت کو ختم مانیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابھی انبیاء کا سلسلہ جاری ہے۔ اب خاتم النبیین کا مطلب ہے تمام انبیاء کی نبوتوں کو ختم کرنے والا۔ اور جب ہم نے کہا کہ ہم ختم نبوت کے قائل ہیں، تو معنی ہوئے، نبوت کا خاتمہ، اختتام نبوت۔ خاتم النبیین کا مطلب تھا کہ تمام دیگر انبیاء کی نبوتیں ختم ہوگئیں، صرف وہ نبوت جاری ہے جو خاتم لے کر آیا ہے۔ اور ختم نبوت کا مطلب یہ نکلا کہ اب یہ نبوت بھی ختم ہوگئی۔ آخری رسولؐ کی تشریف آوری نے دوسرے تمام انبیاء کی نبوتوں کو ختم کر دیا تھا، ہم نے ایک غلط اصطلاح بنا کر قیامت تک جاری رہنے والی نبوت کو بھی ختم کر دیا۔

پیغمبر اسلامؐ کی نبوت جاریہ اور عقیدۂ امامت

اب آپ کو اختیار ہے، چاہیں تو ختم نبوت کی اصطلاح پر نظر ثانی کر لیں۔ لیکن میں لفظی بحث سے آگے بڑھ کر اس نکتے کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں جو حقیقتاً کہنے والا کہنا چاہتا ہے۔ میں جہاں تک سمجھا ہوں، جناب مولانا یہ کہہ رہے ہیں کہ اعلان تکمیل دین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آخری نبوت ہے، اور شیعوں کا عقیدۂ امامت غلط ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے اماموں کو ایک طرح سے نبی مانتے ہیں۔ اب جب تک مولانا خود وضاحت نہ فرمائیں، یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ انہیں شیعوں کے عقیدۂ امامت میں کون سی ایسی بات نظر آئی جس کی بنیاد پر انہوں نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ کسی کو امام ماننا درحقیقت اس کو نبی ماننا ہے۔ کیا شیعہ یہ کہتے ہیں کہ ائمہ شریعت لاتے ہیں، یا ان پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے، یا وہ کسی نئے دین کے بانی ہیں، یا نبیؐ اور امامؑ ہم معنی الفاظ

ہیں۔ یا امام پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بات شیعوں کا عقیدہ نہیں ہے، اور یقیناً ان میں سے کوئی بات کسی شیعہ کا نہ عقیدہ ہے اور نہ کبھی تھی، تو اب یہ بہ محض بے بنیاد الزام تراشی کے سوا کچھ اور نہیں کہ شیعہ اپنے عقیدۂ امامت کے تحت سلسلہ انبیاء کو جاری سمجھتے ہیں۔

نبوت کے بارے میں عقیدہ کی حد تک مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر شیعوں سے متفق ہیں کہ نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر ہیں۔ اور تمام انبیاء کی نبوتیں ختم ہو گئیں، آپ کی نبوت جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ البتہ شیعوں کا امتیاز یہ ہے کہ دوسروں نے آپ کو آخری نبی تو مانا لیکن آپ کے بعد کسی نبی کی آمد کا امکان باقی رہنے دیا، جب کہ شیعوں نے امامت کو مان کر یہ امکان بھی ختم کر دیا۔ ہمارے اس عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اب جو آئیں گے، وہ جانشین رسول اور آپ کی امت کے امام ہوں گے، قیامت تک نہ کسی نبی کے آنے کا امکان ہے، نہ ضرورت ہے۔

سچ پوچھیے تو نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا سارا فساد ہی عقیدۂ امامت نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ اسلام سے پہلے یہ حقیقت انسانی مشاہدے کا جزو تھی کہ مسند ہدایت کبھی خالی نہیں رہی۔ ایک نبی کے جانے کے بعد دوسرا نبی اس کی جگہ لیتا رہا۔ فراہمی ہدایت میں کبھی وقفہ نہیں آیا۔ اب اسلام آیا تو ایک طرف تو اس نے اپنے ماننے والوں سے یہ کہا کہ ہر وقت دعا کرتے رہنا، ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ (سورۃ الحمد)، پروردگار ہمیں ہدایت دیتا رہ۔ دوسری طرف آخری نبی کی صورت میں ہادی آ کر چلا گیا۔ ہم ہدایت مانگ رہے ہیں اور ہدایت دینے والا کوئی نہیں، تو جگہ کو خالی سمجھ کر کئی مہم جو، کئی شائق نبوت رکھنے والے، دعویٰ نبوت کر بیٹھے۔ دوسری طرف ہم نے یہ کہہ کر انسانوں کو جب تک ہدایت کی ضرورت ہے اس وقت تک مسند ہدایت خالی نہیں رہے

گی۔ نبی نہیں آئے گا، البتہ ہدایت کا فریضہ امام سر انجام دیں گے۔ اور امامت بھی کچھ عرصے کے بعد شروع نہیں ہوگی بلکہ بلافصل ہوگی۔ یعنی عہدۂ ہدایت ایک لمحہ بھی خالی نہیں رہے گا کہ کوئی جھوٹا موقعہ سے فائدہ اٹھا کر نبی ہونے کا دعویدار بن جائے۔

اب دنیا تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن یہ عقیدہ امامت کا اعجاز ہے کہ اس عقیدہ نے آنحضورؐ کے آخری نبی ہونے کے تصور کو اس قدر مستحکم کر دیا کہ آپ کے بعد کسی نبی کا آنا تو کیسے ممکن ہوتا، جھوٹے نبی کا بھی راستہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

میری بات کی سچائی کو پرکھنا ہے تو تاریخ کی اس حیران کن حقیقت پر نظر ڈالیے۔ دنیائے اسلام میں تقریباً ہر دور میں خدائی منصبوں کے لئے جھوٹے دعویدار آتے رہے۔ کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا، کوئی امامت کا دعویدار رہا، کوئی امام مہدی ہونے کا اعلان کرتا رہا۔ کچھ کی پیروی بھی کی گئی۔ کچھ محض دعویٰ ہی کرتے رہے، کسی نے توجہ نہ دی لیکن آپ جھوٹے دعویداروں کے تمام پس منظر پر نظر ڈالیے تو آپ پر ایک دلچسپ حقیقت منکشف ہوگی۔ چودہ سو سال میں جتنے جھوٹے نبی آئے، مسیلمہ کذاب سے مرزا غلام احمد قادیانی تک، سب کے سب اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے جو حضورؐ کے بعد کسی امام کی ضرورت کے قائل نہیں تھے۔ ایک بھی نبوت کا جھوٹا دعویدار شیعوں میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہ جھوٹے دعوے شیعوں میں ہوئے ہی نہیں۔ ہوئے اور ضرور ہوئے۔ لیکن جتنے بنے امام بنے، امام مہدی بنے، ایک بھی نبی نہ بنا۔ بات یہ تھی کہ شیعوں میں عقیدۂ امامت نے نبوت کا دروازہ اس مضبوطی سے بند کر دیا تھا کہ کچھ دن شیعہ رہ کر کوئی گمراہ بھی ہوا تو نبی بننے کا خیال دل میں نہ لا سکا۔

اور یہاں ایک بات ضمناً کہتا چلوں۔ امامت کے جتنے بھی جھوٹے دعویدار آئے خواہ وہ امام مہدی بنے ہوں یا خود اپنے نام کے ساتھ امامت کے مدعی ہوں، ان

میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا کہ کسی دن کچھ لوگوں نے اس کو اتفاق رائے سے امام بنا دیا ہو یا کسی جماعت کی طرف سے امام بنائے جانے کا مدعی ہو، جتنے بھی آئے یہ کہتے ہوئے آئے کہ ہمیں اللہ نے امام بنایا ہے۔ عجیب عہدہ ہے امامت کا، جھوٹے بھی قائل ہیں کہ امام بنایا نہیں جاتا، بنا بنایا آتا ہے۔

یزید سے بڑھ کر اور کون عہدۂ امامت کا شوق رکھتا ہوگا۔ اسے اہل الرائے کی حمایت بھی حاصل تھی، جمہور نے بھی اسے امام تسلیم کر لیا تھا۔ گزشتہ حکمران کی وصیت بھی اس کے حق میں تھی، حکومت اور عوام پر غلبہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ غرض حکمران بننے کے جتنے بھی طریقے تھے، ان سب کی رو سے وہ حاکم تھا۔ پھر حسین علیہ السلام کی بیعت پر اس قدر اصرار کیوں، صرف اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ سارے طریقے اسے سب کچھ بنا سکتے ہیں، امام نہیں بنا سکتے۔ امام تو وہی ہوگا جسے اللہ بنائے، یا کوئی نمائندۂ خدا سند دے، تصدیق کرے۔ لیکن جس طرح اس کا اپنے طور پر امام بننا ناممکن تھا، اسی طرح امام برحق کی طرف سے اس کی بیعت ناممکن تھی۔ چنانچہ اللہ اور رسولؐ کے بنائے ہوئے امام نے جان دے دی، پورے گھرانے کو قربان کر دیا، اہل و عیال کا قیدی بننا، ان کا دربدر پھرایا جانا قبول کر لیا لیکن یزید کی امام بننے کی خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظتِ قرآن : ۱۸

اتمام نعمت اور انتخاب اسلام

قرآن مجید نے سورہ مائدہ کی تیسری آیت میں ایک طرف گوشت کے حلال و حرام کے کچھ مسائل بیان کیئے اور اس کے ساتھ ہی، فقہ کے ان مسائل سے بظاہر بالکل غیر متعلق، ایک غیر معمولی دن کا تذکرہ کیا۔ اور وہ بھی اس انداز سے کہ ایک مرتبہ نہیں، ایک ہی آیت میں دو مرتبہ ''الیوم'' آج کا دن، اس روز کہہ کر بات شروع کی گئی۔ اور پھر اس دن کی غیر معمولی خصوصیات بتائی گئیں۔ بتایا گیا کہ آج کے دن ایک بہت بڑا واقعہ ہوا ہے۔ ایک بہت اہم بات ہوئی ہے۔ وہ واقعہ کیا تھا، اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن اس دن ہونے والے واقعہ کی اہمیت کو یوں واضح کیا گیا کہ آج کے دن کو غیر معمولی اہمیت دے دینے والے واقعہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے کافر اسلام کو مٹا دینے کی احمقانہ خواہش کی ہر امید سے دستبردار ہوگئے۔ اب ان سے کسی مسلمان کو خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرے۔ اور آج اس واقعہ نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، تم پر اللہ کی نعمتیں تمام ہوگئیں، اور اس واقعہ کے نتیجہ میں اللہ نے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔ الیوم کی اہمیت کی ان وجوہات کی روشنی میں، اس دن رونما ہونے والے واقعہ کے ان نتائج کی رہنمائی میں، اور

اس دن ملنے والے ان گراں قدر انعامات کی قدر و قیمت کو دیکھتے ہوئے، ہم یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تاریخ اسلام کا وہ کون سا اہم مرحلہ ہے جس نے اسلام کے دامن کو اللہ کی عنایات سے مالا مال کر دیا۔ چنانچہ ہم اب تک تین نتائج، یا تین خصوصیات کا جائزہ لے چکے۔ ہم نے دیکھا کہ اس دن جو واقعہ ہوا ہے اس میں اسلام کو ایسے محفوظ ہاتھوں میں منتقل کر دیا گیا کہ کفر کرنے والے اسلام کو تباہ کرنے کی ہر امید سے مایوس ہو گئے، اور ان ہاتھوں کی طاقت بار بار کی آزمائی ہوئی تھی، اس لئے جو اس مظہر قوت پروردگار سے وابستہ ہو گیا اس کے دل سے خوف خدا کے علاوہ ماسوا کا ہر خوف نکل گیا۔ اور اس روز کے واقعہ نے اسلام کے اصولوں کو آخری شکل دے دی۔ اور جن جن باتوں پر ایک مسلمان کے لئے ایمان لانا ضروری تھا ان باتوں میں اس روز کیئے گئے اعلان کو شامل کر کے اسلام کے مکمل ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا۔

اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِيۡ

ان تین خصوصیات کے بعد قرآن حکیم نے الیوم کی چوتھی صفت یہ بتائی کہ ﴿اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِيۡ﴾ آج کے دن تمہیں ایک نعمت دی گئی ہے اور اس نعمت کے ملنے سے تم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تمام ہو گئیں، اللہ کی طرف سے تمہارے حصے کی نعمتیں پوری ہو گئیں۔ اس جزو آیت سے یہ تو معلوم ہوا کہ آج کے دن اللہ کے خزانہ نعمت سے کوئی گراں قدر، کوئی بہت بڑی نعمت نوع انسانی کے حصے میں آئی ہے لیکن کسی نعمت کے مل جانے سے اللہ کا یہ کہنا کہ ہماری نعمتیں تمام ہو گئیں، نعمتیں پوری ہو گئیں، یہ بات وضاحت طلب ہے۔

کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ اللہ نے آج کی نعمت عطا کر کے اپنا خزانہ نعمت

خالی کر دیا۔ اب اس کے پاس انسان کو دینے کے لئے کچھ باقی نہیں بچا۔ ایسا گمان کرنا مشاہدے کی بھی نفی ہوگا اور اللہ کی بے پایاں قدرت اور اختیار سے انکار کے بھی مترادف ہوگا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب انسانیت اللہ کی نعمتوں سے محروم رہی ہو۔ وقت کا کوئی لمحہ نہیں جب اہل دنیا اللہ کے فضل و کرم سے اپنا دامن طلب نہ بھر رہے ہوں۔ دوسری طرف اللہ کے خزانے لامحدود ہیں۔ وہ خواہ کسی کو کتنی ہی نعمتوں سے نوازے، اس کی نعمتوں میں کمی نہیں آتی۔ ہم دنیا میں بھی ہر لمحہ اس کی نعمتوں کے امیدوار ہیں اور آخرت میں بھی اسی کی نعمتوں کا سہارا ہے۔ ہم تو جیتے بھی اسی امید پر ہیں کہ اس کی طرف سے عطائے نعمت میں کمی نہیں ہوگی، اور ہمارے لئے موت بھی صرف اس توقع پر آسان ہے کہ آخرت میں ہمیں مغفرت ملے گی، شفاعت ملے گی، آتش جہنم سے نجات ملے گی، جنت ملے گی۔ تو اتمام نعمت سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اللہ کی نعمتیں ختم ہوگئیں۔

تو پھر کیا یہ مطلب لیا جائے کہ اللہ کے خزانے تو بے شک لامحدود ہیں لیکن اس نے مسلمانوں کے لئے جو نعمتیں مناسب سمجھیں وہ سب عطا کر دیں۔ اب کوئی مسلمان مزید کچھ ملنے کی امید نہ رکھے۔ جملے کے لفظی معنی تو یہی ہیں کہ جن نعمتوں سے تمہیں نوازنا تھا وہ سب بخش دی گئیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ جو الیوم کے خاص موقعہ پر موجود تھے ان کی جھولیاں تو بھر گئیں لیکن وہ جو بعد میں آئے، یعنی ہم، تو ہمارے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔ (مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر تو یہ بات کچھ صحیح ہی لگتی ہے کہ آج کا مسلمان ماضی کے مسلمان کے مقابلے میں ہر جگہ اقتدار، عزت، وقار سے محروم پستی اور ذلت کی زندگی گزار رہا ہے۔ نہ اس کے پاس علم رہا، نہ زمانے کی قیادت رہی)۔ بہرطور اللہ عادل ہے۔ وہ ایک نسل کو سب کچھ دے کر قیامت تک آنے

والی نسلوں کو محروم نہیں کرسکتا۔

اتمام نعمت کا مفہوم

تو اگر اتمام نعمت کے یہ تمام مفاہیم نا قابل قبول ہیں تو پھر اس جملے کا کیا مطلب ہوا؟ تو آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ کسی ایک نعمت کے تمام ہونے کی کیا صورت ہوتی ہے۔ انسان شب و روز نعمتیں طلب بھی کر رہا ہوتا ہے اور اسے اللہ کی طرف سے مسلسل نعمتیں مل بھی رہی ہوتی ہیں۔ اگر اس تسلسل نعمت کو غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ انسان کسی نعمت کی ابتدائی طلب سے لے کر مطمئن ہونے تک تین مرحلوں سے گزرتا ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ حاجت مند ہوتا ہے، کسی ایسی نعمت کا آرزومند ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں عطائے نعمت کی پہلی منزل یہ ہے کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ جیسے تنگدست کو دولت مل جائے، بیمار کو صحت مل جائے، بھوکے کو غذا مل جائے، جاہل کو علم مل جائے۔ لیکن اس عطائے نعمت سے اتمامِ نعمت نہیں ہوتا، اب ضرورت ہے کہ جو نعمت عطا ہوئی ہے اس کی بہتر صورت مل جائے، اور بہتر کی تمنا اس وقت تک رہتی ہے جب تک بہتر بہترین کے مقام تک نہ پہنچ جائے۔ دولت ملی ہے تو سب سے زیادہ ہو، صحت ہے تو وہ مثالی ہو، علم ملا ہے تو بے حساب ہو۔ اب فرض کیجیے، ضرورت بھی پوری ہوگئی، اور بہترین طریقے سے پوری ہوگئی تو کیا نعمت تمام ہوگئی؟ کیا اس سے بڑھ کر کچھ ملنے کا امکان ختم ہوگیا؟ جی نہیں! ابھی ایک منزل اور ہے کہ اب انسان چاہتا ہے جو کچھ ملا ہے وہ باقی بھی رہے، وہ جاری بھی رہے، اسے نہ تو زوال ہو، نہ اس سے محرومی ہو۔ تو جب یہ تینوں مراحل طے ہوئے، نعمت ملی بھی، اس میں بدرجہ کمال اضافہ بھی ہوا، اور پھر اس نعمت کے باقی رہنے، جاری رہنے کی ضمانت بھی حاصل ہوگئی،

تب یہ کہا جائے گا کہ یہ نعمت تمام ہوگئی۔

نعمت سے کیا مراد ہے

یہ تو ہوا نعمت کے تمام ہونے کا مفہوم، لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ کہا گیا کہ تم پر اللہ کی نعمتیں تمام ہوگئی تو کیا اس سے یہ مراد لیں کہ اس کی ہر نعمت مل گئی، اور اس طرح سے ملی کہ ہر نعمت اپنی بہترین صورت میں عطا ہوئی، اور نہ صرف عطا ہوئی بلکہ باقی بھی ہے؟ تو ایسا سمجھنا خلاف واقعہ ہوگا، اور خلاف عقل بھی ہوگا۔ تمام مسلمانوں کو تمام نعمتیں، اور وہ بھی بہترین صورت میں، مل ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً حکومت واقتدار بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں تمام مسلمان اپنے زمانے کے سب سے بڑے حکمران ہو جائیں؟ تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سی نعمت ہوسکتی ہے جس کی عطا پر یہ کہا جا سکے کہ یہ اتمام نعمت ہے۔

تو کیوں نہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ کون سی نعمتیں ہیں جو اس آیت کا مصداق نہیں ہوسکتیں، اگر نعمتوں کی طویل فہرست میں سے کچھ کو الگ کیا جا سکے تو پھر جس نعمت کا اتمام ہوا اسے پہچاننے میں آسانی ہو جائے گی۔ تو اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ اللہ کی نعمتیں اس کی عطا کے اعتبار سے دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ نعمتیں ہیں جن کو اللہ نے انسان کی سعی کا پابند کیا ہے یا جن کے لئے کچھ اسباب مقرر کر دیئے ہیں، جو اور جب یہ اسباب فراہم کر لے، اسے نعمت مل جائے گی۔ عام حالات میں ملنے والی تمام نعمتیں، زندگی سے لے کر شہادت تک، اور درمیان میں جو کچھ بھی نعمت سمجھا جائے، اقتدار، دولت، رزق، صحت، اولاد، شہرت و ناموری، غرض یہ ساری نعمتیں اسی وقت ملتی ہیں جب مقررہ اسباب فراہم ہو جائیں۔ ان تمام نعمتوں کو اسباب سے اس طرح وابستہ کر دیا گیا کہ جہاں

اسباب جمع ہونے، نعمت عطا ہوگی۔ خواہ نعمت پانے والا شکر گزار بندہ ہے، یا ناشکر گزار، خود مؤمن ہے خواہ کافر۔ دولت ہو یا اقتدار، اولاد ہو یا رزق یہ تمام نعمتیں اسباب کی فراہمی پر ملتی ہیں۔ تو جب ان تمام نعمتوں کے لئے اسباب کی فراہمی کو لازمی شرط قرار دے دیا گیا تو ان نعمتوں کو کسی ایک گروہ کے لئے مخصوص کر دینا، اللہ کا اپنے بنائے ہوئے قانون کو توڑنا ہوگا۔ وہ جو صادق الوعد ہے، جو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا (سورہ الزمر، ۳۹، آیت ۲۰)، وہ جو اپنے قانون، اپنی سنت تبدیل نہیں کرتا (سورہ احزاب ۳۳، آیت ۶۲) اس کے عدل کے خلاف ہوگا کہ اسباب کی فراہمی سے مشروط نعمتوں کو بغیر اسباب کے ایک جماعت کو عطا کر دے، اور انہیں محروم کر دے جو اسباب فراہم کر رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے اس ارشاد میں کہ ہم نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، دنیا کی ان تمام نعمتوں کا تذکرہ نہیں ہوسکتا، جو اسباب جمع ہونے سے عطا ہوتی ہیں۔

اب نعمتوں کی ایک اور قسم ہے، جو مانگنے سے نہیں ملتیں، جو ہزار کوشش سے بھی حاصل نہیں ہوتیں، انسان لاکھ اسباب فراہم کرتا رہے، کتنی ہی جدوجہد کرے، کتنی شدید خواہش رکھتا ہو، وہ ان نعمتوں کو حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ وہ نعمتیں ہیں جو اللہ، جسے چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے، خود عطا کرتا ہے۔ بات واضح کردوں۔ یہ نبوت کی نعمت ہے، رسالت کی نعمت ہے، امامت کی نعمت ہے۔ چونکہ ان نعمتوں کو اس نے اسباب کی فراہمی کی بجائے خالصتاً اپنی رضا اور اپنی مصلحت کا پابند رکھا ہے۔ اس لئے اب یہ اس کی مرضی جس کو چاہے، جس کو اہل سمجھے، نبوت، رسالت اور امامت عطا کر دے۔

تو اب جو اللہ نے فرمایا: ﴿اَتْـمَـمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ﴾ تمام کی تم پر میں نے اپنی نعمت۔ تو یہ انہی نعمتوں میں سے کوئی ایک ہے جنہیں وہ خاص طور پر اپنی کہتا ہے تو جس دن اللہ نے اپنی نعمت تمام کی، اس دن ملت اسلامیہ کو رسالت ملی، نبوت ملی یا امامت

تھی۔ اب نبوت و رسالت تو پہلے ہی ذات محمدیؐ پر تمام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جس دن نعمت تمام ہوئی اس دن امامت ہی عطا ہو سکتی تھی۔

سب سے بڑی نعمت

آیت کے الفاظ سے جو منطقی نتیجہ نکلتا تھا وہ میں نے عرض کر دیا۔ لیکن آیئے مسئلے کو ایک اور زاویہ سے دیکھیں۔ کچھ دیر پہلے میں نے گوش گزار کیا تھا کہ عطائے نعمت کے تین مرحلے ہیں، نعمت کا عطا ہونا، نعمت کا کامل ہونا، اور پھر کامل نعمت کا باقی رہنا، جاری رہنا۔ اب اتمام نعمت محض کسی نعمت کے مل جانے سے نہیں ہوگا کیونکہ ابھی اس میں اضافے کی گنجائش باقی رہے گی۔ اچھا! اضافہ ہوتے ہوتے نعمت کامل ہوگئی۔ اب اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں رہی۔ لیکن اب بھی اتمام نعمت نہیں ہوگا کیونکہ نعمت کو کمال تو حاصل ہو گیا، لیکن ختم ہو جانے کا اندیشہ موجود رہا۔ تو اتمام نعمت اس وقت ہوگا جب یہ ضمانت مل جائے کہ یہ سب سے بڑی نعمت باقی رہے گی، اسے نہ زوال ہوگا نہ واپس لی جائے گی۔ گویا جب ارشاد ہوا کہ اللہ نے ہم پر اپنی نعمت تمام کر دی تو اس نے سب سے بڑی نعمت کے جاری رہنے کی ضمانت دے دی۔

اب سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟ تو میں اس کی آسان سی پہچان بتا دوں۔ جب تک یہ دعا ہو کہ اے اللہ مجھے فلاں شے عطا کر دے تو یہ نعمت کی پہلی منزل ہوگی، پھر جب تک یہ دعا ہو کہ یا اللہ تو نے جو کچھ دیا ہے اس میں اضافہ کر دے تو اب بھی نعمت اپنے کمال کو نہیں پہنچی۔ ابھی بڑھنے کی گنجائش باقی ہے۔ لیکن جب دعا یہ ہونے لگے کہ پروردگار تو نے جو کچھ عطا کیا ہے اسے جاری رکھنا، اسے برقرار رکھنا، تو اس کا مطلب ہوگا کہ اب نعمت کامل ہو چکی ہے۔ اب اس میں اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی نعمت سب

سے بڑی ہے۔

اب اگر عام انسانوں کے حوالے سے دیکھیے گا تو ہر فرد کا تصور نعمت دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اور اسی طرح ہر شخص کے نزدیک سب سے بڑی نعمت کا مطلب بھی الگ الگ ہوگا۔ یہ دراصل ظرف کا اختلاف ہے، وسعت نظر کا اختلاف ہے، مشاہدے اور علم کا اختلاف ہے، دولت مند دولت میں اضافے کا خواہش مند ہے، صاحب اختیار کو اپنے اختیار میں اضافے کی تمنا ہے، اور اللہ کا رسولؐ، سارے زمانے کا معلم، ہر خشک و تر کا علم رکھنے والا یہ کہتا نظر آتا ہے: ﴿رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ (سورۂ کہف، آیت ۱۱۴) اے پالنے والے میرے علم کو بڑھا دے۔ غرض ہر شخص کے نزدیک نعمت بھی مختلف ہوگی اور سب سے بڑی نعمت کا مفہوم بھی جدا ہوگا۔ عام انسان دولت، حکومت، عزت، اولاد، شہرت، دوست وغیرہ میں سب سے بڑی نعمت تلاش کرے گا۔ لیکن صحیح پیمانہ کسی ایسے کی طلب ہوگی جس کو اللہ نے اپنی عمومی ہی نہیں، خصوصی نعمتوں سے بھی نوازا ہو۔

تو اللہ نے کچھ نعمتیں تو بغیر امتیاز کے دیں، مؤمن و کافر سب کو دیں۔ لیکن کچھ نعمتیں صرف مخصوص لوگوں، منتخب لوگوں کو عطا کیں۔ یہ وہ خاص لوگ تھے جن کے قول عمل سے اللہ راضی تھا، جنہوں نے خود کو اللہ کی رضا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اللہ نے ان کو چن لیا، انہیں عبد خاص قرار دیا، اپنا ولی کہا، پھر ان کے سپرد اہم ذمہ داریاں کیں۔ انہیں اپنا نمائندہ ہونے کا شرف عطا کیا۔ یہ سب اللہ کی خاص نعمتیں تھیں۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑا مقام نبوت کا تھا۔ پھر نبوت کے بھی درجے تھے۔ کچھ کو صرف نبوت دی، کچھ کو رسالت بھی عطا کی، پھر ان رسولوں میں سے کچھ کو شریعت دی، ان میں سے کچھ کو اولی العزم قرار دیا۔ اور پھر سب کو نہیں، دو چار کو بھی نہیں، فقط ایک نبی کو یہ اعزاز بخشا کہ اسے اپنا خلیل بنا لیا۔ ایسی منفرد نعمت پانے کے بعد اب ابراہیمؑ کو حق حاصل ہے کہ کہیں کہ اللہ

نے مجھے سب سے بڑی نعمت عطا کردی۔ مجھ پر اپنی نعمتیں تمام کردیں۔

ہماری محدود نظر میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملنے والی نعمت سب سے بڑی تھی، لیکن قرآن مجید نے درجاتِ الٰہی میں ایک اور بلند تر درجے کا پتہ دیا، اپنے خزانۂ نعمت میں ایک اور بڑی نعمت کی موجودگی کی خبر دی۔ سورہ بقرہ کی ۱۲۴ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

﴿وَ اِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾

کہ ابراہیمؑ کا، اس ابراہیمؑ کا جو نبی بھی تھے، رسول بھی تھے، اولی العزم پیغمبر بھی تھے اور خلیل خدا کے خصوصی منصب پر بھی فائز تھے، اللہ نے امتحان لیا۔ اور ایک امتحان نہیں بلکہ امتحانات لیئے، اور جب وہ کامیاب ہوئے اور صرف کامیاب نہیں، مکمل طور پر کامیاب ہوئے تو ارشاد ہوا آؤ اب تمہیں ایک اور مرتبہ عطا کرتے ہیں، تمہیں نوع انسانی کا امام بناتے ہیں۔ اب کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن جب امتحان کے نتیجہ میں کامیاب فرد کو کوئی منصب عطا ہوگا تو اس کے سابقہ تمام منصبوں سے افضل ہوگا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو جب امامت ملی تو وہ نبوت سے، رسالت سے، خلت سے بڑھ کر نعمت تھی۔

ابراہیم علیہ السلام نبی تھے، نبوت ملی تو خاموش رہے، رسالت پر بھی کچھ نہ کہا، خلیل قرار دیئے گئے تب ادائے شکر کے سوا کچھ نہ کہا۔ لیکن ادھر امام بنے تو فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھ گئے:

﴿قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾

پروردگارا اس عہدے کو، اس امامت کو میری ذریت میں بھی قائم

رکھنا۔

اب اگر ابراہیم علیہ السلام کوئی اور دعا مانگتے تو ہم سمجھتے امامت نعمت تو ہے، لیکن سب سے بڑی نعمت نہیں۔ لیکن جب اولاد کے لئے دعا کی تو پتہ چلا کہ یہ نعمت آخری نعمت تھی۔ سب سے بڑی نعمت تھی، اس لئے اس کی بقا کی، جاری رہنے کی دعا مانگی۔

اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت کی سب سے بڑی نعمت امتحان کے بعد ملی تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت کا تقاضہ تھا کہ آپؐ رسالت و نبوت کے ساتھ ابتدا ہی سے منصب امامت پر بھی فائز ہوتے۔ اور اب جو کہا جائے گا کہ اللہ نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ آپ کو بھی امامت مل گئی۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ کی امامت آپ کی ذریت میں قیامت تک جاری و ساری رہے گی۔ گویا جس دن اتمامِ نعمت ہوا تھا، اس دن اللہ نے سب سے بڑی نعمت، امامت کو ذریت رسولؐ میں باقی رکھنے کا اعلان کیا تھا۔

رَضِیتُ لَکُمُ الْإِسْلَامَ دِینًا

اور اب آیت کا آخیر جزو، ارشاد ہوا:

﴿رَضِیتُ لَکُمُ الْإِسْلَامَ دِینًا﴾

اللہ اس بات پر راضی ہوگیا کہ اسلام تمہارا دین رہے گا۔ یا اللہ نے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔ الیوم کو رونما ہونے والے واقعہ کے اب تک جتنے نتائج قرآن مجید نے بیان کیئے، یہ آخری نتیجہ ان سب میں خصوصیت سے قابل غور ہے۔ اس لئے کہ یہ فرمانا کہ ''اللہ اس بات سے راضی ہوگیا کہ اسلام تمہارا دین رہے گا'' کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔ اسلام مخلوق کا نہیں، خالق کا بنایا ہوا نظام تھا۔ اس نے جب

ضرورت سمجھی کہ اب انسانوں کی رہنمائی کے لئے دین اسلام بھیجا جائے۔ تب اسلام آیا۔ اگر یہ بندوں کی ایجاد ہوتا، انسان کے غور وفکر کا نتیجہ ہوتا اور اللہ اس غور وفکر کے نتیجے کو اپنے مقصد تخلیق کے مطابق پاتا تو ایک سند جاری کر دیتا کہ تمہارا بنایا ہوا نظام منظور کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام اللہ ہی کا بھیجا ہوا دین تھا، اور اللہ کا نور اس سے پہلے بھی ادیان بھیجتا رہا اور ان تمام ادیان کا پیغام بھی ایک ہی تھا۔ ان سب کا مقصد بنی نوع انسان کی ہدایت تھی۔ تو اب ان تمام ادیان کو منسوخ کر دینے، اور اسلام کو منتخب اور پسندیدہ قرار دینے کے لئے کوئی تو امتیازی بات ہو جس سے سابقہ ادیان محروم ہوں۔

اور ایک اور اہم بات، جب اللہ اسلام بھیج رہا تھا تو پہلے اسے بندوں سے لے کے پسند کیا ہوگا تب ہی بھیجا ہوگا۔ پھر یہ کیا کہ یہ اعلان ایک خاص دن، وہ بھی آخر دور نبوت میں، کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے آج اس دین کو قیامت تک کے لئے بنی نوع انسان کے لئے اپنا منظور کردہ دین قرار دے دیا ہے۔

اب ان دونوں پہلوؤں کو جمع کیجیے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اولاً اسلام کو کوئی ایسی خصوصیت حاصل ہے جو ماضی کے کسی دین کو میسر نہیں تھی۔ اور ثانیاً یہ خصوصیت شروع سے حاصل نہیں تھی بلکہ اسی دن پیدا ہوئی ہے جس روز اللہ نے اسلام کی قبولیت کا اعلان فرمایا ہے۔

اللہ کا پیغام ایک، تمام نبی اللہ ہی کی طرف سے، پھر وہ کیا ہے کہ اسلام میں ہے دوسرے ادیان میں نہیں۔ تو تمام انبیاء کی تعلیمات کا مقابلہ کیجیے۔ لیکن مقابلہ ہو تو کیسے ہو، ہمیں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے نام تک نہیں معلوم، تو ان کی تعلیمات کو کیا جانیں؟ مقابلہ ہو تو کیسے ہو؟ تو میں ایک آسان سا حل بتا دوں۔ ماضی کے تمام ادیان کی ایک خصوصیت یقین سے بتائی جا سکتی ہے، خواہ ہم انبیاء کے نام جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں،

خواہ ہمیں ان کی تعلیمات سے متعلق کچھ معلوم ہو یا نہ ہو۔ اور وہ صفت یہ ہے کہ ان تمام ادیان میں سے ایک دین بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ تمام دین تحریف کا اس طرح نشانہ بن گئے کہ اصل دین باقی نہ رہا۔ یہ میں کس بنیاد پر کس دلیل پر کہہ رہا ہوں؟ دلیل اور کچھ نہیں، خود ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کا آنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے نبی کا لایا ہوا دین محفوظ نہیں رہا۔ اگر دین محفوظ رہتا تو نئے نبی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ابھی عرض کر چکا کہ دین خواہ کوئی پیغمبر لائے تھے تو اللہ کی طرف سے، اس لئے اللہ کی طرف سے آنے والا ہر نبی ایک ہی پیغام لا رہا تھا۔ چنانچہ ادھر نیا پیغمبر مبعوث ہوا، ادھر یہ معلوم ہو گیا کہ پچھلے نبی کا دین باقی نہیں رہا۔ غرض نتیجہ یہ نکلا کہ محفوظ نہ رہنا وہ خصوصیت ہے جو ماضی کے تمام ادیان میں پائی جاتی ہے۔ ادھر جب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اب قیامت تک اسلام ہی اللہ کا منظور کردہ دین ہے تو گویا یہ اعلان ہو رہا ہے کہ اب کوئی اور نبی نہیں آئے گا، یہ نبی بھی آخری، اور اس کا لایا ہوا دین اسلام بھی آخری۔ اب اگر اللہ اپنے ہی بھیجے ہوئے تمام ادیان میں صرف اسلام کو قیامت تک کا پسندیدہ دین قرار دے گا تو یہ اسی وقت ہو گا جب کسی طریقہ سے یہ ضمانت حاصل ہو جائے کہ یہ دین قیامت تک باقی رہے گا۔ اور جب تک سامان حفاظت ہو نہ جائے، اس وقت تک اسلام کو چن لینے اور دوسرے ادیان کو رد کر دینے کا جواز نہ ہو گا۔ پس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دن اسلام کو منتخب شدہ دین قرار دیا گیا، اس دن اسلام کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا نظام فراہم کیا گیا ہے۔

الیوم

سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں گوشت کی حرام اقسام کے تذکرے کے دوران جس ایک غیر معمولی دن کا بیان ہوا تھا، اس کی خصوصیات کے تجزیہ سے اب اصولی طور پر

ہمیں الیوم کے تعین میں دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ ہم کل اور آج کی گفتگو میں دیکھ چکے کہ آج کے دن کافروں کی مایوسی کا سبب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیغام کا وارث مل گیا ہے، کافروں سے نہ ڈرنے کی وجہ یہ نظر آئی کہ وارث غیر معمولی طاقتور ہے اور دنیائے کفر اس کی طاقت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ پھر دین کے کامل ہونے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ نبیؐ کے وارث کو تسلیم کرنا جزوِ ایمان ہے، اتمام نعمت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت، جس کا نام از روئے قرآن امامت ہے، قیامت تک باقی رہے گی، اور تمام سابقہ ادیان کے مقابلے میں اسلام کے انتخاب نے بتایا کہ آج کے دن اسلام کے قیامت تک محفوظ رہنے کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب اتنی واضح علامتوں کی موجودگی میں، اتنے صاف اشاروں کے ہوتے ہوئے الیوم کو پہچان لینا، اور اس روز رونما ہونے والے واقعہ کی شناخت کر لینا کسی کے لئے بھی دشوار نہیں رہ جاتا۔ اور پھر قرآن مجید نے اس دن کو جو اہمیت دی ہے، اس کے پیش نظر اس دن کو مسلمان کی تاریخ میں ہی غیر معمولی مقام نہیں ملا تھا بلکہ اسے عقائد وایمان کے موضوعات میں بھی نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود، یا شاید اسی اہمیت کی وجہ سے، اس دن کو، اور اس دن ہونے والے واقعہ کو کثرت تعبیر کے دھندلکوں میں چھپانے کی شعوری کوشش ہوتی رہی۔ الیوم کے لفظ میں جو اس کا اشارہ تھا، اسے کبھی گوشت کی حرام اقسام کی طرف موڑا گیا تو عقل نے پوچھا گوشت کے حلال وحرام سے کفار کی مایوسی کا کیا تعلق۔ پھر اس اشارے کو روزِ بعثت کی جانب جھکایا گیا تو انصاف نے کہا وہ دن، تو آغاز نعمت کا تھا، اتمام نعمت کیسے ہو گیا، اور ابھی تو کافروں نے اسلام کے بارے میں سنا ہی نہیں تھا تو ان کی مایوسی کے کیا معنی، کبھی سورہ برآت کے نزول سے نسبت دی گئی تو پھر وہی سوال، کہ کیا سورہ برآت اللہ کا آخری فرمان تھا، کیا اس کے بعد شریعت کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا، اور ایک مرتبہ پھر وہی

بعض نے سورہ برأت کے نزول سے نعمتوں کا اتمام کیسے ہو گیا۔ غرض کوئی جس حد تک مطمئن ہوا اِدھر اُدھر کے منظروں میں الجھنے پر آمادہ ہی نہ تھے۔ الیوم بار بار متوجہ کرتا کہ پہلے یوم کے ”ال“ کے، اس دن کے ”اس“ کے، آج کے دن میں ”آج“ کے اشارے کا ہدف متعین کرتے جاؤ۔ آخر، شاید تنگ آ کر، شاید ضمیر اور عقل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کسی نے کہہ دیا کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ کو اتری تھی۔ قیاس آرائی کا یہ تنکا، بہت سے ڈوبتے ہوؤں کا آخری سہارا بن گیا اور بہت سے مؤرخوں نے، بہت سے مفسرین نے یک زبان ہو کر کہنا شروع کر دیا کہ آیت تکمیل دین یوم عرفہ کو نازل ہوئی تھی۔

چنانچہ صحاحِ ستہ میں سے ایک صحیح، جامع ترمذی کے ابواب تفسیر القرآن میں (جلد دوم)، سورۂ مائدہ کی تفسیر کا آغاز ہی ایک جیسے دو قصوں سے کیا گیا۔ کہ حضرت عمر کے پاس کچھ یہودی آئے انہوں نے کہا، اور دوسری روایت کے مطابق حضرت عبداللہ ابن عباس کے پاس ایک یہودی بیٹھا تھا، اس نے کہا کہ اگر اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کسی دن یہ آیت اتارتا کہ آج کے دن تکمیل دین بھی ہوگئی، اتمام نعمت بھی ہوگئی اور اللہ نے ہمارے دین سے اپنی خوشنودی کا بھی اعلان کر دیا تو ہم تو اس دن کو یوم عید قرار دیتے۔ اس پر دونوں شخصیتوں نے جواب دیا کہ یہودی ایک عید کی بات کرتے ہیں یہ آیت جس دن اتری اس دن مسلمانوں میں دو عیدیں تھیں، ایک تو اس دن جمعہ تھا دوسرے یوم عرفہ تھا۔ اور صحیح ترمذی کے ایک شارح علامہ بدیع الزمان نے ان دونوں روایتوں کی تشریح کرتے ہوئے عیدوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا کہ بقول عبداللہ ابن عباس کے اس دن پانچ عیدیں تھیں، عرفہ اور جمعہ دو عیدیں مسلمانوں کی، اور ایک ایک عید یہودیوں، نصرانی اور مجوسیوں کی۔ اور ایسا عیدوں کا اجتماع نہ پہلے کبھی ہوا تھا نہ آئندہ بھی ہوگا۔

(بات غیر متعلق ہو جائے گی اس لئے صرف دو اشارے کر دوں ایک تو یہ کہ یہ تو نہیں معلوم کہ اس سال یعنی سنہ ۱۰ ہجری کے یوم عرفہ پر یہودیوں، نصرانی اور مجوسیوں کی کون سی عید تھی، لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ 18 ذی الحجہ سنہ 10 ہجری کو خم غدیر کے اجتماع کے موقعہ پر، ایرانیوں کے شمسی کیلنڈر کے مطابق عید نوروز ضرور تھی۔ ہو سکتا ہے کہ راوی نے کسی مصلحت یا کسی مجبوری سے خم غدیر میں نازل ہونے والی آیت کو یوم عرفہ سے منسوب کر دیا ہو لیکن لاشعور میں موجود اس حقیقت پر پردہ ڈالنا بھول گیا ہو کہ یہ آیت جس دن نازل ہوئی تھی اس دن مجوسی بھی عید منا رہے تھے اور دوسری بات یہ کہ اس روایت میں سائل کا سوال تو سمجھ میں آ گیا، لیکن جواب کچھ الجھا ہوا ہے۔ اگر کسی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ موقعہ بظاہر بڑی خوشی کا دن ہے تو اس کے جواب میں یہ کہا جاتا کہ تیرا خیال غلط ہے، دین کا مکمل ہونا کوئی خوشی کی بات نہیں ہے۔ اور اگر یہ جواب مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ سچ مچ خوشی ہی کا دن تھا، تو اس دن عید نہ منانے کا جواز یہ دیا جاتا کہ ہے تو خوشی کا دن لیکن چونکہ خدا اور اس کے رسولؐ نے صراحت نہیں کی اس لئے ہم اس دن عید نہیں مناتے۔ یہ جواب کہ اس دن تو ہم دو دو عید مناتے ہیں، ایک جمعہ کی اور ایک عرفہ کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نزول آیت تکمیل دین ہے تو عید ہی، لیکن کیا کریں اس دن پہلے ہی دو عیدیں ہیں تو اب تیسری کیسے منائیں۔ گویا جس دن پہلے سے ایک عید ہو اس دن دوسری عید نہیں منانی چاہیے۔ (یعنی اگر جمعہ کے دن عید الفطر آ جائے تو اس دن نماز عید نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ پہلے ہی نماز جمعہ پڑھ رہے ہوں گے)۔

ان روایتوں سے ہمیں تاریخ بھی معلوم ہوئی اور دن کا بھی پتہ چل گیا کہ اس دن عرفہ، یعنی 9 ذی الحجہ کی تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا۔ اس اطلاع کو مزید مؤثر بنانے کے لئے ابن کثیر، شوکانی، شاہ رفیع الدین، علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ الہند علامہ محمود الحسن،

غرض کسی نے اپنی تفسیر میں، کسی نے قرآن حکیم کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنے ترجمے میں، جہاں یہ لکھا کہ یہ آیت بروز جمعہ، یوم عرفہ کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی وہاں کئی راویوں سے یہ بھی کہلا دیا کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف اکیاسی دن بعد وصال ہوگیا۔ عبدالماجد دریابادی نے تو تحقیق وتلاش کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے صحیح ترمذی کی روایت نقل کرتے ہوئے بتایا کہ اس آیت کے نزول کے دو مہینے اکیس دن کے بعد حضورؐ کا انتقال ہو گیا، یہ آیت عرفات کے میدان میں، عرفہ کے روز، نازل ہوئی، اس دن جمعہ کا دن تھا، بعد نماز عصر کا وقت تھا، اور شمسی کیلنڈر کے مطابق 15 یا 16 مارچ کی تاریخ تھی۔ دن، تاریخ، وقت، موقعہ، غرض سارے ممکن سوالوں کا جواب موجود ہے۔ اب اتنے بہت سے حتمی حوالوں کی موجودگی میں کون اس تحقیق سے انکار کرنے کی جرأت کرے گا؟ چنانچہ انکار اقرار بعد میں دیکھیں گے لیکن پہلے مجھے ایک سیدھا سا سوال پوچھنے دیجیے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ اور آپ کے راویوں نے بڑا کرم کیا ہم بعد میں آنے والوں پر کہ اس اہم آیت کے بارے میں ساری تفصیلات محفوظ کر دیں۔ بہت شکریہ۔ لیکن یہ تو ارشاد ہو کہ قرآن مجید میں چھ ہزار دو سو انتالیس یا کتالیس آیات ہیں، آپ کو ان سوا چھ ہزار سے زیادہ آیات میں کسی دوسری آیت کے بارے میں یہ بھی تفصیلات یاد ہیں؟ کسی اور آیت کے نزول کی تاریخ، دن اور وقت معلوم ہے؟ چلیے یہی بتا دیجیے کہ قرآن مجید کی پہلی آیت کس تاریخ کو نازل ہوئی تھی۔ 16 رمضان، 17 رمضان، 27 رجب، یہ سب جواب ہیں۔ اور جب تاریخ کا ہی فیصلہ نہ ہو سکا تو دن اور وقت کیسے معلوم ہوگا۔ اگر ابتداء میں آپ متوجہ نہیں تھے تو آخری آیت کی تاریخ نزول تو ضرور یاد ہوگی۔ وہ بھی نہیں تو کسی اور آیت کے متعلق تو ضرور معلوم ہوگا۔ اگر ہر سوال کا جواب لاعلمی ہے تو پھر یہ پوچھنے کا حق دیجیے کہ اتنے بڑے قرآن میں آپ کو صرف ایک

آیت کے نازل ہونے کے متعلق اتنی بہت سی تفصیلات کیسے یاد رہیں۔

ٹریفک کے ایک حادثے میں ایک گاڑی کسی راہگیر کو ٹکر مار کر فرار ہوگئی۔ کچھ چشم دید گواہوں نے بھاگتی ہوئی گاڑی کو دیکھا، وہ نمبر تو یاد نہ رکھ سکے البتہ گاڑی کا میک، اس کا رنگ، ماڈل وغیرہ دیکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ پولیس نے ان معلومات پر ان شرائط کو پورا کرتی ہوئی پانچ چھ گاڑیاں تین چار دن بعد ڈھونڈ نکالیں۔ اب ان کے ڈرائیور حضرات سے پوچھا جانے لگا کہ تین دن پہلے آپ کی مصروفیات کیا تھیں۔ لوگوں نے ذہن پر زور دے کر اس دن کے کچھ کاموں کا تذکرہ کر دیا لیکن لمحہ بہ لمحہ مصروفیات نہ بتا سکے۔ ایک صاحب نے غیر معمولی حافظے کا مظاہرہ کیا۔ جس وقت حادثہ ہوا تھا اس سے دو گھنٹے پہلے سے لے کر دو گھنٹے بعد تک کی ایک ایک جزئیات، ایک ایک منٹ کی تفصیل کے ساتھ سنا دیں۔ ہر تفصیل سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس دن جائے حادثہ سے میلوں دور تھے۔ اب سوال کرنے والوں نے پوچھا اس دن آپ سو کر کب اٹھے تھے، کہنے لگے: یہی کوئی ساڑھے سات کا وقت تھا۔ پوچھا گیا: دفتر کب روانہ ہوئے، کہنے لگے: روز ساڑھے آٹھ اور نو کے درمیان گھر سے نکلتا ہوں، اس دن بھی اسی وقت نکلا ہوں گا۔ کہا گیا: اچھا دفتر میں کیا کیا تھا؟ فرمایا: اب اس وقت تو یاد نہیں۔ پولیس نے ان کو حادثے کا مجرم قرار دے دیا۔ اس لئے کہ جسے سارے دن کی کوئی بات صحیح طرح یاد نہ ہو اور حادثے کے قرب و جوار کی ایک ایک تفصیل یاد ہو تو درحقیقت یہ تفصیلات یاد نہیں ہیں بلکہ اصل واقعہ سے توجہ ہٹانے کے لئے فرضی کہانی گھڑی گئی ہے۔ راویوں کو پورے قرآن مجید میں ایک آیت کی تاریخ نزول یاد نہیں، لیکن ایک آیہ تکمیل دین، جو پوری آیت بھی نہیں، سورہ مائدہ کی تیسری آیت کی ایک جزو ہے، اس کے نزول کی تاریخ بھی یاد، دن بھی یاد، وقت بھی یاد، مقام بھی یاد، یہ بھی یاد کہ اس کے نزول کے پورے اکیاسی دن کے بعد نبی

اگر مرض ﷺ کا وصال ہوگیا۔ تو یہ تفصیلات اس آیت کی اصل تاریخ اور مقام نزول سے توجہ ہٹانے کی کوشش تو نہیں؟

بے بنیاد بات کو حقیقت ثابت کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے، اسی اعتبار سے آدمی ٹھوکر کھاتا جاتا ہے۔ بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے یہ تو کہہ دیا گیا کہ اس آیت کے نزول کے دو مہینے اکیس دن بعد، یعنی 81 دن کے بعد، آنحضور کا وصال ہوگیا۔ لیکن کسی نے اپنی بیان کردہ تاریخ میں یہ اکیاسی دن جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جو کام کسی اور کو کرنا چاہیے تھا، اس نے تو نہیں کیا چنانچہ آپ ہی یہ حساب کرلیں۔ عرفہ ہوتا ہے 9 ذی الحجہ کو، اس میں ایک مہینہ 29 کا اور ایک 30 کا جمع کیا، تو 9 صفر کو 59 دن ہوگئے۔ باقی بچے 22 دن، تو 9 صفر میں 22 دن جمع کیجئے تو 2 ربیع الاول ہوئی یا یکم ربیع الاول، اب یہ اکیاسی دن کی روایت سنانے والوں کا ہی کہنا ہے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت و وفات ایک ہی دن، یعنی 12 ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ اب انصاف کیجیے۔ دس گیارہ دن کے اس اختلاف کا کیا جواب ہے۔ یا اکیاسی دن کی روایت غلط ہے یا پھر حضور ﷺ کا یوم وصال 12 ربیع الاول نہیں ہے۔

لاشعوری ٹھوکر کا دلچسپ نتیجہ

نفسیات والے کہتے ہیں کہ لاشعوری طور پر کہی جانے والی باتیں خواہ کتنی بے معنی نظر آئیں، ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کہنے والے نے جب یہ کہا تھا کہ آیہ تکمیل دین کے نزول کے اکیاسی دن بعد حضور ﷺ کا وصال ہوگیا تو اس نے یہ اکیاسی کا عدد بغیر کسی حساب کے کہہ دیا تھا۔ ورنہ اتنی فاش غلطی نہ ہوتی۔ راوی کے ذہن میں اکیاسی کا عدد کہاں سے آیا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔ تو آیئے

ایک اور طریقے سے حساب کریں۔ ہم نے پہلے عرفے کی تاریخ میں اکیاسی دن جمع کیئے تھے تو وہ حضورؐ کی تاریخ وفات نہیں تھی۔ اب یہ کیا جائے کہ جس تاریخ کو آپ حضورؐ کی تاریخ وفات بتاتے ہیں، اس میں سے اکیاسی دن گھٹا لیتے ہیں۔ آپ نے کہا: تاریخ وفات بارہ ربیع الاول ہے۔ تو بارہ کو تو وصال ہوگیا، چنانچہ بارہواں دن تو شمار میں نہیں آئے گا۔ باقی بچے ربیع الاول کے گیارہ دن۔ تو انہیں 81 سے نفی کیا تو 70 دن بچے۔ اب فرض کیجیے اس سے پہلے صفر کا مہینہ 29 دن کا تھا، تو ستر میں سے انتیس دن گھٹائے تو باقی بچے 41 دن، چونکہ صفر کا مہینہ 29 دن کا فرض کیا تھا تو محرم 30 دن کا ہوگا، ان دنوں کو اکتالیس سے نفی کرلیں تو باقی رہے گیارہ روز۔ اب 30 دن کے محرم سے پہلے ماہ ذی الحجہ میں قاعدے سے 29 دن ہوں گے۔ چنانچہ 29 میں سے 11 دن پیچھے جایئے تو جواب آیا 18۔ یعنی آیہ تکمیل دین 18 ذی الحجہ کو نازل ہوئی تھی۔ اب اٹھارہ ذی الحجہ کو خم غدیر میں ولایت علیؑ کے اعلان کے علاوہ کوئی واقعہ ہوا ہو تو بتایئے۔ ورنہ آپ نے ہی کہا تھا کہ حضورؐ کی تاریخ وصال 12 ربیع الاول ہے۔ اور آپ ہی کا کہنا تھا کہ آنجنابؐ کی وفات سے 81 دن پہلے آیہ تکمیل دین نازل ہوئی تھی۔ تو اب اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ یہ مان لیا جائے کہ ادھر ولایت علیؑ کا اعلان ہوا، ادھر قدرت نے کافروں کی مایوسی، تکمیل دین، اتمام نعمت اور اسلام کی پسندیدگی کی سند عطا کردی۔

کسی سچائی کو چھپانے کے لئے، غلط بیانی کرتے ہوئے، سچ بات کے منہ سے نکل جانے کا یہ ایک واقعہ نہیں ہے۔ تاریخ میں یہ بار بار ہوتا ہے۔ یزید کی وکالت کرتے ہوئے بہت سے نمک خوار، بار بار، یزید ہی کی کہی ہوئی اس بات کو دہراتے رہے کہ کربلا میں جو کچھ ہوا یہ سب کوفہ کے گورنر، ابن زیاد کا ذاتی فیصلہ تھا۔ یزید کو نہ تو اس کی خبر تھی نہ وہ قتل حسینؑ پر راضی تھا۔ اب کہنے کو تو کہہ دیا گیا لیکن اس کے باوجود محمد ابن جریر طبری

نے، ابن خلدون نے، ابن کثیر نے، غرض بہت سے مورخین نے یہ بھی لکھ دیا کہ ابن زیاد نے یزید کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خاندانِ رسالتؐ کے قیدیوں کو بے کجاوہ اونٹوں پر، بنی ہاشم کے شہیدوں کے سروں کے ساتھ، قیدی بنا کر دمشق بھیج دیا۔ اگر یزید قتل حسینؓ پر راضی نہ ہوتا، اگر یہ اس کے حکم کی تعمیل میں نہ ہوتا، تو شہادتِ حسینؓ کی خبر ملنے پر اس کا اہل حرم سے ردعمل تلافی کا ہوتا، معذرت کا ہوتا، افسوس کا ہوتا، ابن زیاد نے مظالم کو جس مقام پر پہنچا دیا تھا وہی کیا کم تھے کہ یزید کربلا کے یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا بیبیوں کو دردر، قریہ قریہ، شہر شہر اس ذلت وخواری کا نشانہ بناتا رہا۔ اب بعد کے کسی مرحلے پر یزید قتل حسینؓ سے لاتعلق ہونا بھی چاہے، تو یہ اس کی سیاسی مجبوری ہوگی، یہ حسین علیہ السلام کی غیر معمولی فتح کا نتیجہ ہوگا اس کی بے گناہی کی دلیل نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کا اصل کردار تو اس فوری ردعمل سے ظاہر ہو چکا جس کا مظاہرہ اس نے شہداء کے سروں اور بے جرم خطا اہل حرم کے ساتھ کیا تھا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

حفاظت قرآن : ۱۹

تکمیل دین اور تبلیغ رسالت کا فرمان

گزشتہ دو روز کی گفتگو سورہ مائدہ کی تیسری آیت کے بعض اجزاء کو سمجھنے پر مشتمل تھی۔ ہم نے دیکھا کہ اس آیہ مبارکہ میں حیوانی گوشت کی کچھ اقسام کو ہر مسلمان کی غذا سے خارج کرتے ہوئے، اور دوسری طرف مجبور اور گرفتار مصیبت شخص کو، حالت اضطرار میں قانون شکنی پر معافی کی نوید سناتے ہوئے، ان دونوں باتوں کے درمیان ایک خاص دن کا تذکرہ اس اہتمام سے کیا گیا کہ اس دن میں اور اس کی ابتدا اور آخر میں کیئے گئے گوشت کے بیان میں کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ چنانچہ یہ سمجھنے کے لئے کہ یہ ترتیب کلام کیوں ہے اور اس آیت کو موجودہ صورت میں رکھنے میں کیا حکمت ہے، ہم نے پہلے تاریخ اسلام میں، اس دن کا تعین کرنے کی کوشش کی، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس خاص دن کے بارے میں جتنی بھی آراء پیش کی گئی ہیں، ان سب میں سوائے ایک واقعہ کے، کوئی بھی مرحلہ ایسا نہیں تھا جو قرآن مجید کی بتائی ہوئی شرائط اور خصوصیات پر پورا اترتا۔ ہاں ایک خم غدیر میں علی ابن ابی طالب کی ولایت کا اعلان ہے جو ایک طرف قرآن کے معیار پر پورا اترتا ہے، دوسری طرف مسلمانوں کی تاریخ، حدیث اور تفسیر کے اختلافی ذخیرہ میں واحد واقعہ ہے جس کے متعلق صرف یہ نہیں کہ اسے ایک گروہ بیان کرتا ہو اور باقی متفقہ طور پر رد

کرتے ہوں بلکہ ہر مسلک کے کچھ نہ کچھ افراد یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آیۂ تکمیل دین اعلان ولایت علیؑ کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ چنانچہ پورے اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ آیۂ تکمیل دین کی شان نزول کے بارے میں جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان میں یہی ایک وقت مقام اور واقعہ ہے جس پر قرآن مجید کی بیان کردہ شرائط کا بھی مکمل اطلاق ہوتا ہے۔ درایت اور عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر بھی اپنے اپنے ذخیرۂ احادیث و روایات کی بنیاد پر اسی شان نزول سے اتفاق کرتے ہیں۔

دوسری طرف میں یہ بھی عرض کر چکا کہ جہاں آیت کے زیر بحث جملے اسی آیت کے دوسرے ارشادات سے مربوط نہیں نظر آتے، وہاں سورہ مائدہ کی 67 ویں آیت جسے آیۂ بلّغ کہا جاتا ہے، آیۂ تکمیل دین سے براہ راست منسلک دکھائی دیتی ہے۔ میں یہ بات وضاحت سے عرض کر چکا کہ آیۂ بلّغ میں ایک پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ اگر پیغام نہ دیا گیا تو بعض اہم انعامات نہ مل سکیں گے۔ دوسری جانب آیۂ تکمیل دین میں ان تمام انعامات کے مل جانے کی نوید سنائی گئی۔ چنانچہ نتیجہ واضح ہے کہ آیۂ بلّغ اور آیۂ تکمیل دین میں بس اتنا ہی وقفہ ہے جتنی دیر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغام پہنچایا۔ ورنہ دونوں آیات کا موضوع ایک ہی واقعہ ہے۔ لیکن اس تمہید گفتگو سے آگے بڑھ کر، تکمیل دین کی بحث کو ایک طرف رکھتے ہوئے، پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے آیۂ بلّغ جس پیغام کو پہنچانے کے لئے کہہ رہی ہے اس کی کیا نوعیت ہونی چاہیے۔

آیۂ بلّغ کے پیغام پر ایک نظر

آیۂ بلّغ کے الفاظ یہ ہیں:۔

٭یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ٭۔ (مائدہ ۵۔آیت ۶۷)

اب اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے رسولؐ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے، اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت نہیں پہنچائی۔ اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، اور اللہ انکار کرنے والوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صاف تھی۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کو کوئی خاص حکم دیا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ حکم ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں تک پہنچ دیا جائے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ مسلمان اس حکم کو تلاش کرتا جسے پہنچانے کے لئے اس قدر تاکیدی الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ لیکن شاید تلاش کے کام کو باعث زحمت سمجھتے ہوئے، یا پھر تلاش کے نتیجے سے آگاہ ہوتے ہوئے، اور اسے خلافِ مزاج پاتے ہوئے بعض حضرات نے اس صاف بات میں نکتہ آفرینی کی، اور پرانے لوگوں میں ابن کثیر، اور جدید لوگوں میں مولانا مودودی جیسے علماء نے یہ موقف اختیار کیا کہ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جو خاص حکم دیا گیا ہے اسے پہنچا دیجیے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو جتنے احکام اب تک ملے ہیں، جتنی آیتیں آپؐ پر نازل ہوئی ہیں، ان میں سے کوئی روک نہ لیجیے گا، کوئی حکم باقی نہ رہ جائے، کوئی آیت چھوڑ نہ دیجیے گا، تمام آیتیں پہنچا دیجیے گا۔ اگر آپ نے ادھورا پیغام دیا تو کارِ رسالت انجام تک نہیں پہنچے گا۔ اہل علم نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا کہ عربی قواعد کے مطابق یہ مفہوم درست نہیں ہو سکتا اس صورت میں ٭بلغ کل ما انزل الیک٭ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن زبان کی بحث زبان دان کریں، میں تو عقل عمومی کی سطح پر بات کو سمجھنا چاہوں گا۔

حکم تبلیغ خاص حکم کے لئے ہے

یہ تو طے ہے کہ یہ آیت پہلی آیت نہیں ہے۔ اس بات پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے زمانے میں نازل ہوئی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کے تقریباً سارے احکام اس آیت کے نزول سے پہلے آ چکے تھے۔ اس کے علاوہ اس آیت میں داخلی شہادت بھی موجود ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو رسالت نہیں پہنچائی۔ یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بہت ساری رسالت پہنچائی جا چکی ہو، بہت سے پیغامات دیئے جا چکے ہوں۔ اور اب جو بات کہی جا رہی ہے اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اگر یہ بات نہیں پہنچائی گئی تو سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ تو اب چاہے زمانہ نزول کے حوالے سے دیکھیے یا آیت کے لب و لہجہ کو دیکھیے، اس آیت کے نزول سے پہلے توحید پہنچ چکی، رسالت کی خبر دی جا چکی قیامت سے آگاہ کیا جا چکا، نماز روزے کی تلقین کی جا چکی۔ اب اگر اللہ یہ فرما رہا ہے کہ تمام احکام پہنچا دو تو ظاہر ہے کہ جو بہت کچھ پہنچایا جا چکا ہے، آج کا حکم ان باتوں کے لئے تو ہو نہیں سکتا۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ اور تو سب کچھ پہنچایا جا چکا تھا، البتہ کوئی ایک حکم یا دو چار احکامات ایسے تھے کہ یا تو لوگوں کی شرارت کے اندیشے، یا کسی اور وجہ سے، اب تک نہیں پہنچائے گئے تھے۔ اور یہاں انہیں رکے ہوئے احکام کو پہنچانے کے لئے کہا جا رہا ہے۔

مختصراً خواہ آپ کے ترجمے کے مطابق آیت پوری رسالت کے پہنچانے سے تعلق رکھتی ہو یا عام ترجمے کے مطابق کسی ایک حکم کے بارے میں ہو، عملی طور پر نتیجہ ایک ہی نکلے گا کہ اللہ کسی خاص حکم کو پہنچانے کے لئے کہہ رہا ہے۔

کافرین کون ہیں؟

اپنے اس قول کی تائید میں کہ ''اس آیت میں پوری رسالت کو پہنچانے کی بات کی گئی ہے، کسی خاص بات کو نہیں'' یہ دلیل دی گئی کہ آیت کے آخری جزو میں کہا گیا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ﴾۔ اللہ کافروں کے گروہ کو ہدایت نہیں دیتا۔ گویا یہ پیغام کافروں کو دیا جانا تھا، مسلمانوں کو نہیں۔ میں عرض کروں گا کہ اگر یہاں کافرین سے عام کافر مراد لئے جائیں تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ یہاں تو بالکل حتمی طور پر کہا جا رہا ہے کہ اللہ کافروں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ تو کیا یہ سمجھا جائے کہ کافروں میں تبلیغ کرنا بیکار ہے؟ وہ تو کبھی ہدایت پا ہی نہیں سکتے۔ اب اذیتیں جھیل کر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ میں تبلیغ کا کیا جواز ہے، اور جو اس عرصہ میں پورے عرب کے کافر ایمان لا چکے تھے کیا انہوں نے نعوذ باللہ قول خدا کو غلط ثابت نہیں کر دیا تھا؟ جناب اگر توحید پر ایمان بچانا ہے تو یہاں کافر کے اصطلاحی معنی کی بجائے لغوی معنی مراد لینے ہوں گے، یعنی اللہ انکار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور انکار بھی کسی اور بات کا نہیں، بلکہ جس پیغام کو پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے اس سے انکار کرنے والوں کی ہدایت نہیں ہوگی۔ اب کسی کا دل مانے یا نہ مانے، قرآن مجید کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے مفتی جو چاہے کہیں، جو حکم آج دیا جا رہا ہے، اس کے نہ ماننے والے اللہ کے نزدیک کافر ہوں گے۔

اور آیت کے اس جزو تک پہنچنے سے پہلے، آیت میں ایک جملہ اور بھی ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ﴾ اللہ تمہیں لوگوں کی دشمنی سے، لوگوں کی شرارت سے، ایذا رسانی سے محفوظ رکھے گا۔ اب میں سوال کرتا ہوں کہ سنہ 10 ہجری میں، جب مکہ فتح ہوئے طویل عرصہ گزر چکا تھا، کفار حقیقتاً یا ظاہرہ طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھ چکے تھے، کم و

چکا ہو، شہروں، قریوں، گلی کوچوں میں اللہ اکبر کی صدا گونج رہی ہو، قوموں، قبیلوں ، خاندانوں میں اسلام کا چرچا ہو، اللہ کا پیغام عوام میں مقبول ہو چکا ہو، حکمرانوں تک پہنچ چکا ہو۔ اب اس گستاخانہ تصور کو آپ کا ذہن تسلیم کرنے پر آمادہ ہو تو اتنا تو بتا دیجیے کہ رسولؐ نے آخر کون سا حکم روک رکھا تھا، کون سی آیت سنانے سے بچا لی تھی۔ اور اگر آپ کوئی حکم نہ بتا سکیں، لوگوں سے کسی چھپالی جانے والی بات کی نشاندہی نہ کر سکیں تو غور کر لیجیے گا کہ آپؐ کے بتائے ہوئے مفہوم سے اللہ پر کتنا بڑا الزام آتا ہے کہ ساری زندگی تو اپنے رسولؐ سے جان توڑ محنت لیتا رہا اور جب صلہ اور انعام کا مرحلہ آیا، اجر کی منزل آئی تو ایسے جواز تلاش کر رہا ہے کہ ان کا سہارا لے کر کہہ دے کہ تم نے تو کارِ رسالت ہی سر انجام نہیں دیا۔ نعوذ باللہ۔

اگر ذرا سا غور وفکر سے کام لیا جائے تو آیت میں نہ کوئی تنبیہہ ہے، نہ دھمکی، نہ رسولؐ نے کوئی پیغام کبھی چھوڑا ہے، نہ کسی سے خوفزدہ ہے۔ بات بہت سیدھی سی ہے۔ کوئی حکم ہے، کوئی بات ہے، جس کا اعلان، نماز روزے کی طرح روزِ اول سے نہیں کیا جا نا تھا، اسے نشر کرنے کے لئے کسی خاص وقت کا انتظار ہے۔ بات رسولؐ کے پاس پہنچ چکی ہے، پیغام آ چکا ہے، لیکن اس کے اعلان کا کوئی مناسب موقع ہے۔ اب جو کہا گیا ہے کہ اے رسولؐ جو کچھ تم پر نازل کیا جا چکا ہے اسے بھی پہنچاؤ۔ تو ہرگز مطلب نہیں کہ وہ جو تم نے نعوذ باللہ چھوڑ دیا تھا، وہ جو بچا لیا تھا، اسے بھی پہنچاؤ، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خبر بھی سب کو دے دی جائے۔ جسے حکم الٰہی کے انتظار میں اب تک باقاعدہ طور پر لوگوں تک پہنچایا نہیں گیا تھا۔ اور جو یہ کہا گیا کہ اگر ایسا نہ کیا تو کارِ رسالت مکمل نہیں ہوا، تو یہ بھی دھمکی نہیں ہے بلکہ اس بات کی اہمیت کا ذکر ہے کہ اگر یہ بات اس وقت نہ پہنچی تو اے حبیبؐ حالات ایسے ہیں کہ تمہاری ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ اور جو یہ ارشاد ہے

کہ اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، تو یہ اس لئے نہیں کہ نعوذ باللہ رسولؐ کسی سے خوفزدہ ہیں، بلکہ یہ اس پیغام کے پہنچنے کا ردِ عمل بتایا جا رہا ہے کہ جب تم یہ پیغام لوگوں تک پہنچا دو گے تو کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اس کو سن کر تمہارے خلاف بھڑک اٹھیں گے۔ لیکن ہماری قدرت کا کرشمہ دیکھنا اگر اس پیغام کے دشمنوں سے بخ بخ نہ کہلوا دوں تو کہنا اور یہ بھی سن لو کہ یہ پیغام ایسا ہی اہم ہے کہ جو اس سے انکار کرے گا، آج تو اس انکار کو ظاہر نہیں کرے گا، لیکن کل یہ انکار چھپا نہیں رہے گا، تو ساری دنیا سن لے کہ انکار کرنے والا ہماری توحید کا اقرار کرتا رہے، اے حبیب تمہیں رسولؐ مانتا رہے، لیکن ہمارا فیصلہ ہے کہ یہ انکار کرنے والا، ابلیس کی طرح ہے مجھے مان کر بھی کافر رہے گا اور ہم قیامت تک اسے ہدایت سے محروم رکھیں گے۔

اللہ کا حکم جس پر عمل درآمد رکا رہا

اب تک کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی حکم الٰہی تھا کہ نازل ہو چکا تھا لیکن اس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ کے الفاظ سے ایک پہلو اور سمجھ میں آتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اللہ جو کچھ نازل فرمائے وہ لازماً قرآن میں ہو، یہ تو اللہ اور اس کا رسولؐ جانے کہ کون سی نازل ہونے والی بات کو قرآن کی حیثیت سے متعارف کرانا ہے، کون سی بات کو حدیث کی حیثیت سے بیان کرنا ہے، اور کون سی بات کو صرف رسولؐ کی ذات تک محدود رہنا ہے، حضورؐ جو کچھ بھی، اور جس حیثیت سے بھی کہیں گے وہ سب نازل شدہ ہی ہوگا۔ لیکن قرآن کی اصطلاح میں نازل کیئے جانے کا اطلاق عموماً صرف آیاتِ قرآنی پر ہوتا ہے۔ تو یہاں جو خاص طور پر کہا گیا کہ وہ بات جو ہم نے نازل کی ہے، اسے پہنچا دو، تو یہ حکم خاص جو نازل تو ہو چکا ہے لیکن اس پر عملدرآمد بعد میں کیا جائے گا، اسے

قرآن مجید کا جزو ہونا چاہیے۔ اب اللہ کے تمام پیغام میں، قرآن کے تمام احکام میں، کیا کوئی حکم ایسا بھی تھا جس پر عملدرآمد اس وقت نہ ہونا ہو بلکہ آنے والے وقت میں، کسی خاص لمحے پر، کسی مناسب اور موزوں وقت پر ہونا ہو۔ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ قرآن مجید میں جتنے بھی احکام ہیں وہ نازل ہوتے ہی نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔ نماز روزے کی بات ہو، حلال و حرام کا حکم ہو، شراب ترک کرنے کا فرمان ہو، ادھر نازل ہوا ادھر نافذ ہوا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے ہوں، صحابہ کرام صفوں میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہوں، ایسے میں حکم آ جائے کہ تمہارا قبلہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ اب تم بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ مدینہ سے بیت المقدس شمال کی جانب ہے، کعبہ یا مکہ جنوب کی جانب ہے۔ تبدیلی قبلہ کا مطلب یہ ہے تمام نمازی پورے ایک سو اسی درجے کے زاویہ پر رخ پھیر لیں، یعنی جدھر منہ تھا، ادھر پشت ہو جائے۔ اور یہ تو عام نمازی کا عمل تھا کہ جہاں کھڑا ہے وہیں رہے، بس رخ تبدیل کر لے۔ لیکن وہ جو امامت کرا رہا تھا، یعنی خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ان کے لئے صرف رخ پھیرنا کافی نہ ہوگا، جب آپ کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا تو آپ کے پیچھے پہلی صف تھی، اب جو کعبہ کی طرف منہ کر کے امامت کرائیں گے، تو آپ کو اپنی جگہ چھوڑ کر سب سے پچھلی صف کے سامنے جا کر کھڑا ہونا ہوگا۔ اس تبدیلی سمت میں، تبدیلی مقام میں، نماز میں کس قدر بدنظمی ہوئی ہوگی؟ تاریخ نے بتایا ہے کہ سوائے ایک کے کسی کی سمجھ میں ہی نہ آیا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، وہ اکیلا جو عمل رسول کو سمجھ گیا تھا اس کا یہ اعزاز ایسا منفرد تھا کہ تاریخ نے اسے علی علیہ السلام کا فخر قرار دے دیا کہ علی علیہ السلام نے دو قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔ یوں تو اس عہد کے تمام ہی حضرات نے دو قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تھی،

لیکن ایک نماز کے دوران نہیں۔ یہ علی علیہ السلام کا اعزاز اس لئے قرار پایا کہ اور سب اس وقت تک مقصد عمل رسول کو سمجھ ہی نہ پائے جب تک نماز کے بعد انہیں سمجھایا نہ گیا۔ یہ صرف علی علیہ السلام کی مزاج شناسی رسول کا کمال تھا، یا اطاعت رسول کا مظاہرہ یا پھر یہ کہوں کہ قبلہ بیت المقدس ہو یا خانہ کعبہ، علی علیہ السلام کا قبلہ تو ذات رسالت تھی کہ نہ کچھ کہنے کی ضرورت تھی نہ پوچھنے کی۔ ادھر رخ رسول مڑا، ادھر علی علیہ السلام نے اپنا رخ جانب رسول موڑ لیا۔

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

نازل شدہ حکم کیا تھا؟

غرض قرآن میں اللہ کے جتنے بھی حکم آئے، فوراً اسی وقت نافذ ہوگئے، لیکن ہمیں تلاش ہے کسی ایسے حکم کی جس کا نفاذ وقت نزول نہ ہو، بلکہ بعد میں کسی وقت ہو۔ ہمیں تلاش ہے اس ﴿مآ اُنزِلَ الیکَ﴾ کی، جو نازل تو ہو چکا ہے لیکن اس کا پہنچایا جانا باقی ہو۔ یا اس پر عمل درآمد کسی آنے والے وقت میں ہونا ہو۔ تو آیئے، ابتدائے نزولِ وحی کی ایک سورہ ہے، ابھی مکہ میں تبلیغ دین کا کام شروع ہوا ہے، اس وقت ایک سورہ نازل ہوئی، نام ہے سورہ انشراح یا الم نشرح، کل آٹھ آیتوں کی سورہ ہے لیکن معنی اور مطالب کا خزینہ ہے۔ اس وقت اس سورہ مبارکہ کی فقط آخری دو آیتوں پر توجہ دلانی مقصود ہے، ارشاد ہوا:

﴿فاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلَی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

اے حبیبؐ جب تم فارغ ہو جانا تو مقرر کر دینا اور پھر اپنے رب کی طرف پلٹ آنا۔ اب جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس وقت یا تو خدا جانتا تھا یا پھر خدا کا رسولؐ

جانتا تھا کہ فارغ کس کام سے ہونا ہے، پھر کسے نصب کرنا ہے، کسے مقرر کرنا ہے، یہ الفاظ قرآن کو سامنے رکھتے ہوئے، کسے منصب دینا ہے، اور پھر اس کے بعد اپنے رب کی طرف راغب ہونے کا کیا مفہوم ہے۔ ان باتوں کا پتہ اس وقت عام آدمی کو نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن ان دونوں آیتوں سے کوئی شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کوئی کام ہے، یہ کام وقت نزول آیت جاری ہے اور اللہ کہہ رہا ہے کہ پہلے اس کام کو ختم کرلو، پھر جب فراغت ہو جائے، چاہے یہ فراغت بیس بائیس دن میں ہو یا بیس بائیس سال میں ہو، لیکن پہلے فارغ ہونا شرط ہے۔ تب رسول کو ایک اور کام کرنا ہے۔ ﴿فَانْصَبْ﴾ نصب کرنا ہے۔ مقرر کرنا ہے اور اس کے بعد اپنے رب کی طرف راغب ہو جانا ہے یعنی منصب دینے کا کام کرنا ہے لیکن ابھی نہیں، پہلے جو کام کر رہے ہیں وہ ختم ہو جائے۔ پہلے فارغ ہو جائیں۔ فارغ ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ ہم آپ تو نہیں کر سکتے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کام کون سا ہے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذمہ داری پوری کر چکے، لیکن وہ خود کیسے کہہ دیں کہ میں نے کام ختم کر دیا۔ کام مکمل ہونے کی سند تو وہی دے گا جس نے کام سپرد کیا تھا، کام لینے والا فارغ کرے تو کام کرنے والا فارغ ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا ہر حکم پہنچا دیا، حلال و حرام کے تمام مسئلے بتا دیے، قرآن کی تلاوت کر دی، حجۃ الوداع کا آخری خطبہ دے چکے، بظاہر اب کوئی کام باقی نہیں رہا۔ اپنے گھر مدینے کی طرف واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ اتنے میں جبرئیل آئے، اللہ کا ایک پیغام پہنچایا، پیغام کیا تھا بس ایک اشارہ تھا، ﴿یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ اے رسول تمہارے رب نے جو کچھ نازل کیا تھا، اب اسے لوگوں تک پہنچا دو۔

اب یہ اللہ کے کلام کی بلاغت تھی کہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہی کہ تم نے اپنا

کام ختم کر لیا۔ کیونکہ جب یہ کہہ دیا کہ اب وہ کام کرو جو فارغ ہونے کے بعد کرنا تھا تو کام ختم ہونے کی سند خود بخود مل گئی۔ چنانچہ پہلے سے نازل شدہ پیغام کو پہنچانے کا حکم آنا تھا کہ رسولؐ چلتے چلتے جہاں تک پہنچے تھے، وہیں رک گئے۔ تمام مسلمانوں کو بھی روک دیا اور پہلا سوال یہ کیا کہ کیا میں نے تمہیں اللہ کے تمام احکام پہنچا دیئے، پورے مجمع نے تصدیق کی ہاں خدا کے رسولؐ پیغامِ خدا پہنچ گیا۔ جس نے بھیجا تھا اس نے تو اگلا قدم اٹھانے کی اجازت دے کر پہلے ہی تصدیق کر دی تھی، جن کے نام پیغام آیا تھا انہوں نے بھی اقرار کر لیا کہ ان تک پہنچنے والی تمام باتیں پہنچ گئیں۔ گویا ﴿و اذا فرغت﴾ کا مرحلہ طے ہو گیا۔ اب منزل تھی دوسرے قدم کی، کسی کو مقرر کرنا تھا چنانچہ علی علیہ السلام کا بازو پکڑ کر بلند کیا اور ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ﴾

میں جس کا مولا ہوں، یہ علیؑ بھی اس کا مولا ہے۔

یہ فقط علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان نہیں تھا، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے منصب ولایت پر علی علیہ السلام کا تقرر کر رہے تھے۔ چنانچہ آیت کا دوسرا جزو آج مکمل ہوا تو معلوم ہوا کہ ﴿فانصب﴾ کے کیا معنی تھے۔

ربط کلام کی بحث

ان امور کے طے ہو جانے کے بعد آیہ بلغ یا سورہ مائدہ کی ۶۷ ویں آیت یہ بتانے کے لئے نازل ہوئی کہ اب اپنی جگہ ولی امر کے تقرر کے اعلان کا وقت آ گیا ہے۔ اور خم غدیر میں اس فرمان پر عمل درآمد ہو جانے کے بعد آیہ تکمیل دین یہ بتاتی ہوئی آئی کہ ولایت علیؑ کے اعلان نے کافروں کو بالکل مایوس اور شکست خوردہ کر دیا۔ اب کوئی خطرہ

ہوگا تو خوف خدا نہ رکھنے والے مسلمانوں کو ہوگا، اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب یہ دین مکمل ہوگیا ہے، اسے نعمت امامت دے کر اللہ نے اپنی نعمتیں تمام کردیں اور اسلام کو قیامت تک کے لئے پسندیدہ دین قرار دے دیا۔ اب فلاح ونجات ان کے لئے ہے جو آج مکمل ہونے والے اسلام کو قبول کریں گے۔ اور ماضی میں بتائے گئے تمام اسلام کو قبول کرنے والے اگر آج تکمیل کے اس مرحلے کو قبول نہیں کریں گے تو اللہ کے نزدیک ان کا یہ انکار کفر ہوگا اور ایسے لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دے گا۔

موجودہ ترتیب آیات کی پہلی وجہ، حفاظت قرآن

ان آیات کی شانِ نزول جان لینے کے بعد اب ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ اگر آیہ تکمیل دین کو گوشت کی حرام اقسام کے تذکرے سے نہ ملا دیا گیا ہوتا، آیہ بلغ اور آیہ تکمیل دین کو ایک دوسرے سے فاصلے پر نہ رکھا جاتا، اور نیابت رسولؐ کے معاملے کو دوٹوک، صاف صاف انداز میں ایک ہی مقام پر مسلسل بیان کردیا جاتا، تو ملت اسلامیہ میں، بعد میں رونما ہونے والے انقلابات، قرآن اور اسلام کو کتنے شدید خطرے سے دوچار کردیتے۔ اس کا اندازہ ہر صاحب نظر بخوبی کرسکتا ہے کہ اگر آیہ تکمیل دین کی شانِ نزول سے سرسری نظر رکھنے والوں کی توجہ ہٹانے کا کوئی امکان نہ بچتا تو قرآن کو ہی نشانہ بنا لینے کی کوشش نہ ہوتی؟ وہ جو نیابت رسولؐ کے معاملے کو خدا اور رسولؐ کے بجائے خود اپنی خواہش اور رضا کے مطابق حل کرنا چاہتے تھے، وہ کم از کم ان آیات کو قرآن سے نکال نہ دیتے؟ شاید یہاں پھر ایک مرتبہ یہ کہا جائے کہ جب قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا تھا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ وہ قرآن میں رد و بدل کرسکتا۔ تو اس سلسلے میں، میں تفصیلی بحث کرچکا ہوں۔ کہی ہوئی باتوں کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف توجہ دلانے

کے لیے یہ الفاظ دہرا دوں کہ اللہ نے قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ کیا ہے، اس کی تکمیل معجزوں کے ذریعہ نہ ہوئی تھی، نہ ہوئی ہے۔ بلکہ اللہ نے اس عالم اسباب میں ایسے اسباب فراہم کر دیئے کہ قرآن کو کوئی قیامت تک نقصان نہ پہنچا سکے۔ اوران اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ قرآن کے بہت سے موضوعات، جو براہِ راست بعض نام نہاد مسلمانوں کے خود ساختہ مفادات کے خلاف تھے، انہیں مفاد پرستوں کی امکانی شرارت سے محفوظ رکھنے کے لئے اس طرح سے بیان کیا گیا کہ اگر کوئی غلط تاویل کا سہارا لے کر حقیقی منشائے الٰہی سے پہلو بچانا چاہے تو شوق سے ایسا کرے۔ لیکن ان مقامات پر اتنے واضح اشارے رکھ دیئے گئے کہ صاحب نظر کو حقیقت تک پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ قرآن محض تلاوت کے لئے نہیں آیا، یہ کوئی جادو کا منتر نہیں ہے کہ صرف پڑھ کر نتائج حاصل کرلو، یہ سمجھنے اور غور کرنے کی کتاب ہے، اس پر غور کرو، تجسس کرو، فکر کرو، اس کے ظاہر پر نہ رک جانا، اس کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرو، کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ جو غور وفکر کرے گا وہ حقیقت سے دور نہیں رہے گا۔

بعض محدثین کا ناقابل فہم طرزِ عمل

شاید کوئی کہہ دے کہ یہ تو محض ایک فرضی خطرہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی قرآن کو نقصان پہنچاتا۔ تو میں عرض کروں گا کہ یہ آیتیں نیابت رسولؐ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر یہ صرف اس رسول کی نیابت کا معاملہ ہوتا جو مکہ میں کفار کے مظالم برداشت کر رہا تھا، تو یقیناً نائب کے سوال پر کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ لیکن، اتفاق سے، ضرورت نبوت کے تحت نہیں، بلکہ حالات کے تقاضے سے، اب رسولؐ پتھر کھا کر تبلیغ حق کرنے والا رسولؐ نہیں ہے بلکہ ایک سلطنت کا حکمران بھی ہے۔ ایک مملکت کا فرمانروا بھی ہے اور اب یہ

بتانے کے لئے تاریخ سے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں کہ نبی یا رسول کے جانشین کا مسئلہ متنازعہ نہیں ہوتا، لیکن صاحبانِ تخت و تاج کی وراثت کے لئے انسان، انسانیت کی پست ترین سطح پر اتر جاتا ہے۔ حصول حکومت کے لئے قرآن کی دو آیتیں کیا، پورے قرآن سے بھی انکار کرنا ہوتا تو بہت سے انسانوں کے لئے ایسا کرنا دشوار کام نہیں تھا۔

آیئے اب میں ٹھوس مثال دوں۔ قرآن میں، اس کے مخصوص اندازِ بیان کے تحت، ولایت علیؑ کا واقعہ جزئیات کے ساتھ نہیں کہ کسی کو انکار ولایت کے لئے قرآن حکیم سے انکار کی ضرورت پیش آئے۔ لیکن حدیث میں، تاریخ میں یہ واقعہ پوری تفصیل سے موجود ہے۔ وہاں لوگوں کا رویہ دیکھ لیجیے اور پھر فیصلہ کر لیجیے کہ اگر یہ سب قرآن میں بھی موجود ہوتا تو قرآن کے ساتھ لوگوں کا رویہ کیا ہوتا۔

واقعہ غدیر، حدیث ﴿مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ﴾، ان احادیث میں سے ہے جنہیں علم حدیث کی اصطلاح میں متواتر کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی حدیث جسے اتنے راویوں نے بیان کیا ہے کہ اتنے افرد کا کسی جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو۔ دو، چار، دس، بیس نہیں، پورے ایک سو دس صحابہ نے الگ الگ اس ارشاد رسولؐ کو بیان کیا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پوری ملت اسلامیہ کے سارے ذخیرہ حدیث میں کوئی دوسری حدیث نہیں جسے اتنے راویوں نے بیان کیا ہو۔ پھر ان ایک سو دس اصحاب سے سن کر 84 تابعین ہیں جنہوں نے اس حدیث کو اگلی نسلوں کی طرف منتقل کیا ہے اور ان تابعین سے سن کر گزشتہ تیرہ صدیوں میں کم از کم تین سو ساٹھ (۳۶۰) علمائے حدیث نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا۔ (تفصیلات اور حوالے کے لئے علامہ حسین الامینی کی دس جلدوں پر مشتمل کتاب الغدیر ملاحظہ فرمالیں)۔ یہ حدیث اتنی کثرت، اتنے تواتر اور اس قدر یقینی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے کہ حدیث کے اصل مقصود سے اختلاف کرنے والوں نے بھی

ساری بحث اس بات پر کی ہے کہ مولا کہہ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ یا جانشین نہیں بنایا، بلکہ مؤمنین کا دوست قرار دیا ہے۔ یا مولا کے تو چالیس معنی ہیں، یہاں ضروری تو نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو مسلمانوں کا حاکم قرار دے رہے ہیں۔ یعنی اس پر تو اختلاف ہوا کہ مولا کے معنی کیا ہیں، اس پر اختلاف نہیں ہوا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کو تمام مسلمانوں کا مولا قرار دیا ہے۔

یہ تو تھی حدیث غدیر کی تاریخی اور محدثانہ حیثیت، اس قدر متواتر حدیث کو نہ تو رد کیا جا سکتا تھا، نہ اس کے ہونے سے انکار ہو سکتا تھا، نہ اسے ضعیف ہو کر جان چھڑائی جا سکتی تھی۔ تو پھر کیا کیا گیا؟ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے اپنے سارے ذخیرہ احادیث میں سے چھ کتابوں کو سب سے زیادہ ذمہ دارانہ کتاب قرار دیا۔ یہ چھ صحیح ترین کتابیں صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔ ان صحیح کتابوں میں دو کتابوں کو باقی چار پر فوقیت حاصل ہے۔ (اب اس وقت میں یہ سمجھنے کی درخواست نہیں کروں گا کہ آپ نے صحیح اور غلط میں ڈگری یا درجے کا فرق کیسے دریافت کر لیا۔ اس لئے کہ ایک بات یا تو صحیح ہے یا غلط، کم صحیح اور زیادہ صحیح کچھ بے معنی ترکیب لگتی ہے)۔ خیر۔ یہ صحیحین، یعنی دو صحیح ترین کتابیں، ایک محمد بن اسماعیل بخاری کی صحیح بخاری اور دوسری مسلم بن الحجاج نیشاپوری کی صحیح مسلم ہے۔ اب عجیب عالم حیرت ہے کہ 110 صحابہ کی گواہی، 84 تابعین کی روایت، دنیا ئے حدیث کی سب سے زیادہ مستند، معتبر اور متواتر حدیث نہ صحیح بخاری میں ہے نہ صحیح مسلم میں اگر کوئی خبر احاد ہوتی، کوئی غیر معروف حدیث ہوتی اور نظر انداز ہو جاتی تو ان حضرات پر الزام نہ آتا، لیکن ایسی حدیث جسے صحابہ کے معتبر ترین افراد نے روایت کیا ہو، اور وہ بھی اس کثرت سے، اور وہ حدیث امام بخاری اور امام مسلم کی نظر میں نہ آئے تو اسے کیا کہیے گا۔ آسمان پر سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو، اور اسے کوئی دیکھنے سے

انکار کردے تو اسے فرد نابینا کہا جائے گا۔ آسمان حدیث کا آفتاب ہے حدیث ”مَنْ کُنْتُ مـــولاہُ“ ۔ اب اگر بخاری اور مسلم اس کے وجود کے احساس ہی سے محروم رہیں تو یہ حدیث کا قصور نہیں بے خبری ظاہر کرنے والے کی خطا ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ دونوں بزرگ اس قول رسولؐ سے واقف ہی نہ ہو سکے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث ان کے سامنے تو بار بار آئی ہوگی، لیکن انہوں نے اپنی مسانید میں درج کرنا مناسب نہ سمجھا۔

اور یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ امام بخاری نے بقول خود صحیح بخاری کی چھ ہزار حدیثوں کو چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے، اور امام مسلم نے ساڑھے سات لاکھ حدیثوں میں سے اپنی کتاب منتخب کی ہے۔ دنیا سمجھتی ہے کہ اس انتخاب کی بنیاد حق پسندی ہے، سچائی ہے، دین کے معاملے میں غیر معمولی احتیاط ہے، لیکن جب حدیث غدیر متواتر ہونے کے باوجود منتخب احادیث میں نہیں بلکہ چھوڑی ہوئی احادیث میں ہے، تو معلوم ہوا کہ جن احادیث کو ترک کیا گیا انہیں اس لئے نہیں چھوڑا گیا کہ وہ ضعیف تھیں، کمزور تھیں، بلکہ اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ وہ ان فضائل علیؑ کی مظہر تھیں جن کا تذکرہ اس عہد میں بہت سے خطرات کو دعوت دینا اور بہت سے انعامات سے محروم ہونا تھا۔

تو جو مسلمان اپنی معاشی مجبوریوں سے یا مذہبی تعصبات کے تحت ولایت علیؑ کی متواتر حدیث کو نظر انداز کر سکتا ہو، اگر اسے ایسی ہی وجوہات کی بنیاد پر قرآن سے انکار کرنا ہوتا تو اس کے لئے ایسا کر گزرنا کون سی دشوار بات تھی۔ اس لئے اللہ نے اس تذکرے کو قرآن میں اس طرح رکھا کہ موجود بھی رہے، اپنا مفہوم واضح بھی کرتا رہے، پھر بھی مخالف کی تمام تر کوششیں تاویل کو بدلنے تک محدود رہے، براہ راست قرآن محفوظ رہے۔

دوسری توجیہہ۔ ربط موجود ہے

میں نے عرض کیا کہ آیہ تکمیل دین اور آیہ بلغ کو اگر ایک دوسرے سے منسلک رکھا جاتا تو بعض بااثر لوگ قرآن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ کہا جائے کہ یہ تو موجودہ ترتیب کے لئے محض ایک امکان ہے۔ ایک اور امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ترتیب اللہ کی طرف سے نہ ہو بلکہ ہم جس اندیشے کی بات کر رہے ہیں، وہ حقیقت بن گیا ہو، یعنی نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والے اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے ہوں اور آیات کو ایک دوسرے سے منقطع کر کے ان کو غیر متعلق باتوں سے وابستہ کر کے انہوں نے خلاف حقیقت تاویل کی گنجائش فراہم کر دی ہو۔

تو میں عرض کروں گا کہ یہ دوسرا امکان، اس وقت ممکن تھا اگر اللہ نے پہلے ہی یہ وضاحت نہ کر دی ہوتی کہ میں دو مختلف باتوں کو ایک جگہ جمع کرنے جا رہا ہوں۔ اور اب جو کچھ بھی بیان ہوگا، اور جس طرح بیان ہوگا، وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوگا یہ وضاحت کہاں آئی؟ آیئے دیکھتے ہیں، آیہ تکمیل دین سورۂ مائدہ کی تیسری آیت کا جزو ہے۔ لیکن یہ تیسری آیت اچانک شروع نہیں ہوئی، بلکہ سلسلۂ کلام پہلے سے قائم ہے۔ سورۂ مائدہ شروع ہوئی تو پہلی آیت میں ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ
الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ
اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ﴾

اے ایمان والو۔ اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار پورے کرو، چوپائے تمہارے لئے حلال کر دیئے گئے ہیں، سوائے ان کے جو تم سے بیان کیئے جائیں گے، اور احرام کی

حالت میں شکار کو حلال نہ سمجھو، اور خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے   اب ذرا توجہ درکار ہے۔ اس پہلی آیت میں تین حکم دیئے گئے۔ اول اپنے قول و قرار کو پورا کرو، دوم یہ کہ تمہارے لئے چوپائے حلال کیے گئے ہیں اور تیسری بات یہ کہ احرام کی حالت میں شکار نہ کرنا۔ اس کے علاوہ یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ بات یہاں ختم نہیں ہوگئی۔ چوپایوں کا گوشت حلال تو ہے لیکن کچھ اقسام حرام ہیں، جن کا تذکرہ ہم آگے چل کر، اگلی سطور میں کریں گے۔ اور اس کے بعد کہا گیا کہ اللہ کے کسی حکم پر چون و چرا کی گنجائش نہیں، وہ جس کام میں مصلحت پاتا ہے اس کا حکم دیتا ہے اور جس سے روکنا مناسب سمجھتا ہے اس سے روک دیتا ہے۔

اب اسی مقام پر رک کر یہ دیکھ لیجیے کہ ان تین احکام میں کیا ربط ہے، وعدوں کا پورا کرنا، معاہدے کی پابندی کرنا ایک بالکل الگ بحث ہے۔ جانوروں کے حلال و حرام کا مسئلہ ایک بالکل الگ موضوع ہے اور احرام کی حالت میں کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے یہ پہلی دونوں باتوں سے الگ بات ہے۔ گویا تینوں تین جداگانہ باتیں ہیں جنہیں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجیے ایک سیاسی لیڈر، ایک رہنما، ایک خطیب، ایک مصنف، ایک استاد اپنے سامعین سے کئی باتیں کرنا چاہتا ہے، اتفاق سے وہ تمام باتیں مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہوں، لیکن مقرر چاہتا ہے کہ ہر بات کہی جائے ان میں سے کوئی موضوع باقی نہ رہے۔ تو اب دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک بات پر گفتگو شروع کی جائے، پھر جیسے ہی وہ ختم ہو، دوسری شروع کر دی جائے۔ اور پھر اسی طرح بغیر کسی تمہید کے، بغیر کسی اہتمام کے تیسرا موضوع چھیڑ دیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو بات بے ربط ہوگی، غیر عاقلانہ ہوگی، شاید بے ربطی بہت بڑھے، لوگ بالکل الجھ جائیں، وہ سمجھ

ہی نہ سکیں کہ کہا کیا جا رہا ہے۔ اب دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ابتدائے کلام میں بتا دیا جائے کہ میں آج ایک سے زیادہ موضوعات پر باتیں کروں گا اور جن موضوعات پر باتیں ہوں گی ان کی فہرست یوں ہے۔ پہلے موضوعات کی نشاندہی کر کے جب مقرر تفصیل شروع کرے گا تو جیسے جیسے بات بڑھتی جائے گی۔ سننے والے کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ مقرر ایک بات ختم کرے گا تو سننے والا ذہنی طور پر دوسری بات سننے کے لئے آمادہ ہو چکا ہوگا۔ اور اسی طرح تیسری کے لئے آمادہ ہوگا اور وہی گفتگو جو بے ربط کہلاتی، اب انتہائی مربوط کہلائے گی اور جو تقریر لوگوں کو الجھا رہی تھی اب معنی خیز بھی ہوگی اور مؤثر بھی ہوگی۔

اب سورۂ مائدہ کی پہلی آیت کو دیکھیے۔ اس میں تین احکام کا تذکرہ ہے۔ لیکن احکام کی تفصیل نہیں بلکہ صرف عنوانات ہیں۔ ایفائے عہد کرو، گوشت کے حلال و حرام کے قواعد کی پابندی کرو اور احکام احرام کی پابندی بجالاؤ۔ اور ساتھ ہی اشارہ دے دیا گیا کہ یہ صرف عنوان ہیں۔ چوپائے گوشت کے لئے حلال قرار دیتے ہوئے کہہ دیا گیا کہ چوپائے حلال ہیں لیکن کچھ حرام بھی ہیں جن کی تفصیل ابھی تمہیں بتائی جائے گی، گویا نتائج نکالنے میں جلدی نہ کرنا، محض اس آیت پر رک نہ جانا، یہ صرف عنوان ہیں، تفصیل ابھی بتائی جائے گی۔ چنانچہ عنوانات کے فوراً بعد تفصیل شروع ہوئی۔

میں یہاں شاعری کی اصطلاح کا سہارا لوں گا۔ شاعری میں ایک صنعت ہے لف ونشر، لف کے معنی ہیں باندھنا، سمیٹنا، بند کرنا (اسی سے لفظ لفافہ بنا ہے) اور نشر کا مطلب ہے کھولنا، بکھیرنا، پھیلانا۔ کبھی کبھی شاعر ایک مصرعہ میں دو تین موضوعات بیان کرتا ہے جو اس کے مافی الضمیر کی طرف صرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر دوسرے مصرعہ میں ان موضوعات کی وضاحت کرتا ہے۔ ان کی تشریح کرتا ہے۔ گویا پہلے مصرعہ میں اس نے خیال کو ملفوف کیا، اشارے میں سمیٹ دیا، دوسرے مصرعہ میں اسے کھول دیا،

ہو چکا ہے۔ چونکہ گفتگو مؤمنین سے ہے۔ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو'' اس لئے معاہدے کے ایک مسلمان ہیں۔ جنہوں نے عہد کیا ہے وہ مؤمنین ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے کون سا پیمان باندھا ہے، کیا عہد کیا ہے۔ اس لئے اب اس معاہدے کی تفصیلات دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ بتا دیا جائے کہ اس معاہدے کا دوسرا فریق، اللہ، اس معاہدے پر عمل درآمد کرنے والوں کو کیا دے گا۔ تو سن لو، وہ جو تم نے عہد کیا ہے۔ اس سے تم اس قدر قوی ہو گئے ہو، اتنے طاقتور ہو گئے ہو کہ کافر مایوس ہو گئے ہیں، تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اب سوائے ذات خدا کے کسی اور سے خوفزدہ ہونا تمہارے شایانِ شان نہیں۔ اور آج یہ معاہدہ کرتے ہی تمہارا نامکمل دین مکمل ہو گیا ہے۔ تم پر اللہ کی نعمتیں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ اور اب تمہارا یہ دین مکمل ہونے کے بعد، آج ملنے والی نعمت کے ساتھ، قیامت تک کیلئے اللہ کا پسندیدہ دین ہے... لیکن یاد رکھنا یہ سب نتائج ان کے لئے ہیں جو اپنا وعدہ پورا کریں، آج ہمارے رسولؐ کے سامنے عہد کر کے، قسم کھا کے، کل جو انکار کریں گے، نہ انہیں خوف سے نجات ملے گی، نہ ان کا دین مکمل ہوگا، نہ وہ انعمت علیہم ہوں گے، نہ ان کے دین مذہب کو اللہ کی طرف سے قبولیت حاصل ہوگی۔

ترتیب الٹنے کا سبب

لیجیے! بات بے ربط نہیں ہے۔ وہی تین عنوانات جو پہلی آیت میں بتائے گئے تھے، ان ہی کی تشریح بعد کی دو آیتوں میں کر دی گئی۔ بس فرق یہ تھا کہ پہلی آیت میں جو عنوانات کی ترتیب تھی، تفصیل بتاتے ہوئے الٹ گئی۔ گویا یہاں صنعت ولف ونشر غیر مرتب ہے۔ اب یہ ترتیب الٹی کیوں ہوگئی؟ تو یہ دنیا کا مسلمہ طریقہ ہے کہ جب فہرست بنائی جاتی ہے تو اہم ترین کا تذکرہ سب سے پہلے کیا جاتا ہے، جب تفصیل بیان ہو تو اہم

ترین بات سب سے بعد میں کی جاتی ہے پاکستان میں جگہ جگہ ایسی مجالس ہوتی ہیں جن میں ایک سے زیادہ مقرر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی سیمینار ہوتے ہیں، جلسے ہوتے ہیں، جن میں کئی حضرات تقریر کرتے ہیں۔ اب جس وقت اشتہار چھپتے ہیں، دعوت نامے لکھے جاتے ہیں تو جو سب سے اہم مقرر ہوتا ہے۔ وہ جو مرتبے اور مقام میں سب سے بڑا ہوتا ہے، اس کا نام سب سے پہلے جلی حروف سے لکھا جاتا ہے اور پھر اہمیت کے اعتبار سے ترتیب آگے بڑھتی ہے۔ اس کے آگے کم اہم، اس سے اور آگے نسبتاً اور کم اہم لیکن جب اعلان کے مطابق مجلس ہوتی ہے، جلسہ ہوتا ہے، سیمینار ہوتا ہے تو جو سب سے اہم مقرر ہوتا ہے وہ سب سے آخر میں خطاب کرتا ہے، مجمع اس کو سننے کے لئے بیٹھ رہتا ہے۔ بعض اوقات گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پہلے مبتدی شروع کرتے ہیں، پھر بڑے خطیبوں کی باری آتی ہے، پھر جا کر اس کی باری آتی ہے جس کا ذکر فہرست میں سب سے پہلے ہوا تھا۔

اللہ کا طریق کار بھی یہی ہے۔ یوم الست تمام انبیاء کو جمع کیا۔ فہرست طویل تھی اس لئے سب کا تذکرہ اجمالاً کر دیا کہ ہم نے تمام انبیاء سے عہد لیا۔ اور وہ نبیؐ جو سب سے افضل تھا، سب سے اشرف تھا، اس کا ذکر نمایاں کر دیا کہ اے حبیبؐ ہم نے تمہاری نبوت پر، تمہاری نصرت پر تمام انبیاء سے عہد لیا۔ سب سے اول، سب سے نمایاں ذکر اشرف الانبیاءؐ کا ... لیکن جب بھیجنے کا وقت آیا تو سب کو پہلے بھیج دیا، اور جس کا ذکر سب سے پہلے تھا اسے سب سے آخر میں بھیجا۔ (بحوالہ سورہ آل عمران ۳، آیت ۸۱)

سورہ مائدہ میں کئی باتوں کا تذکرہ تھا۔ جب فہرست بتائی تو جو بات سب سے اہم تھی، اسے سب سے پہلے رکھا جب تفصیل و تعارف کا وقت آیا تو جو ذکر سب سے اہم تھا اسے سب سے آخر میں بیان کیا۔

اب حکم تو تینوں اللہ کے تھے۔ ان میں اہمیت کا فیصلہ کیسے ہوا، اللہ کا حکم، اللہ کا حکم ہے، بڑا یا چھوٹا حکم کیا معنی؟ تو یقیناً حکم الٰہی ہونے کے حوالے سے تینوں حکم اللہ کے تھے۔ لیکن عمل کی دنیا میں حج اور احرام کے احکام صرف ان کے لئے ہوں گے جو حج کرنے جائیں گے، احرام باندھیں گے۔ حج کی شرط اول تھی استطاعت کی، تو صاحب استطاعت کتنے؟ پھر ایک مرتبہ حج بجا لانے کے بعد حج واجب نہ رہا، غرض صاحب استطاعت کو زندگی میں ایک مرتبہ حج کے لئے جانا ہے، وہ بھی سال کی مخصوص تاریخوں میں، اور ان حاجیوں سے شکار کے قوانین کی کتنوں کو ضرورت ہوگی، چنانچہ حالت احرام کے احکام کا سامنا مقابلتاً سب سے کم لوگوں کو ہوگا۔ اس کے مقابلے میں گوشت مسلمانوں کی مرغوب غذا ہے۔ چنانچہ کم وبیش تمام مسلمانوں کو حلال وحرام کے احکام کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود یہ احکام صرف اس وقت بروئے کار آئیں گے جب کوئی مسلمان کھانا کھا رہا ہو اور اس کے کھانے میں گوشت بھی موجود ہو، ان باتوں میں سے ایک بھی نہ ہو، نہ وہ کھانا کھا رہا ہو، یا کھانے میں گوشت نہ ہو، تو حلال وحرام کے ان احکام کو پیش نظر رکھنا ضروری نہیں۔ اب ان دونوں احکام کے مقابلے میں عہد کی پابندی کرنا ہر مسلمان کا فریضہ، ہر وقت کا فریضہ، کسی وقت بھی اس پر عمل درآمد ملتوی نہیں۔ دنیا کے ہر مسلمان کو، خواہ وہ گوشت کھائے یا نہ کھائے، صاحب استطاعت ہو یا نہ ہو، اپنے عہد کو لازماً پورا کرنا ہے۔ چنانچہ یہ حکم سب کے لئے، ہر وقت اہم ہے اس لئے عنوانوں کی فہرست بنی تو عہد کو پورا کرنا سب سے پہلے بیان ہوا اور احکام احرام سب سے آخر میں۔ اور جب تفصیل وتشریح کی جانے لگی تو احکامِ حج سب سے پہلے بیان کیے گئے اور رسولؐ اور مؤمنین میں ہونے والے معاہدے کا ذکر سب سے بعد میں آیا۔

ویسے بھی پہلے تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ حج کے احکام ہوں یا گوشت

کے حلال وحرام کے قوانین، یہ سب فروع کی باتیں ہیں، اور ولایت علیؑ کا اقرار اصول کی بات ہے، عقیدے اور ایمان کی بات ہے۔ اصول کو فروع پر ترجیح حاصل ہے۔ چنانچہ عنوان میں اصول پہلے اور فروع بعد میں، اور شرح میں فروع پہلے اور اصول بعد میں۔

اب تک کی گفتگو میں یہ امور طے ہو گئے کہ آیہ بلغ یا سورہ مائدہ کی 67 ویں آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بتانے کے لئے نازل ہوئی کہ اب اپنی جگہ ولی امر مقرر کرنے کا وقت آ گیا ہے، اور خم غدیر میں اس فرمان پر عمل ہو جانے کے بعد آیہ تکمیل دین یہ بتاتی ہوئی آئی کہ ولایت علیؑ کے اعلان نے قیامت تک کافروں کو مایوس وشکست خوردہ کر دیا۔ اب کوئی خطرہ ہے تو خوفِ خدا نہ رکھنے والے مسلمانوں کو ہوگا، اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اب یہ دین مکمل ہے، اور اسے نعمت امامت دے کر اللہ نے اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور اسلام کو قیامت تک کے لئے پسندیدہ دین قرار دے دیا۔ اب فلاح ونجات ہے تو ان کے لئے جو آج مکمل ہونے والے اسلام کو قبول کریں گے۔ اور ماضی کی تمام تعلیمات اسلام کو قبول کر لینے والے اگر آج تکمیل دین کے اس مرحلے کو قبول نہیں کریں گے تو اللہ کے نزدیک ان کا یہ انکار کفر ہوگا اور ایسے لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دے گا۔

تیسری توجیہہ، تکمیل دین کی اہمیت کو نمایاں کرنا

ان آیات کا شان نزول جان لینے کے بعد اب ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ اگر آیہ تکمیل دین کو بظاہر گوشت کی حرام اقسام کے تذکرے کے ساتھ نہ ملا دیا گیا ہوتا، آیہ بلغ اور آیہ تکمیل دین کو ایک دوسرے سے فاصلے پر نہ رکھا جاتا، اور نیابت رسولؐ کے معاملے کو دوٹوک، صاف صاف انداز سے ایک ہی مقام پر مسلسل بیان کر دیا جاتا، تو ملت اسلامیہ میں بعد میں رونما ہونے والے سیاسی مدوجزر، قرآن اور اسلام کو کتنے شدید

خطرے سے دوچار کر دیتے، اس کا اندازہ ہر صاحب نظر بخوبی کر سکتا ہے۔

اب اصولاً بات کو ختم ہونا چاہیے۔ سورہ مائدہ کی ترتیب کی وضاحت ہوگئی۔ آیہ تکمیل جہاں ہے وہاں ہونا اللہ کی طرف سے ہے، وہاں ہونا تقاضۂ مصلحت بھی ہے۔ لیکن ایک سوال اور ہو سکتا ہے کہ مان لیجیے کہ حفاظت کی غرض سے ان اجزائے آیت کو موجودہ مقام پر کسی اور تذکرے کے ساتھ رکھا گیا۔ لیکن اس قدر اہم بیان کو معمولی فقہی مسائل کے ساتھ رکھ دینے سے تکمیل دین اور اتمام نعمت جیسے اہم واقعہ کا مقام گھٹ گیا۔ اگر اس ذکر کو کسی اور تذکرے سے ہی ملانا تھا تو ایمان اور عقائد کے کسی اہم ذکر کے ساتھ رکھا جاتا، توحید کے بیان سے، رسالت کے تذکرے سے، قیامت کی گفتگو سے منسلک کیا جاتا۔ اس قدر اہم حکم کو روزمرہ کے بھی نہیں، کبھی کبھی پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے مسائل کے ساتھ کیوں رکھا گیا تو اس کا منہ بند کرنے والا جواب تو اللہ نے سورہ کی پہلی آیت کے آخری جملے ہی میں دے دیا، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾

''اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔''

بس اس کی مصلحت نے جس طرح چاہا، بیان کیا۔ بات ختم۔ لیکن اگر فعل الٰہی کی مصلحت پر غور کیا جائے تو عین منشائے قرآن کے مطابق ہوگا۔ تو جو مصلحت میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اہم بات کی طرف سامع کی توجہ کو مبذول کرانے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ روزِ مرہ کی عام گفتگو کے دوران اچانک کوئی چونکا دینے والا لفظ کہا جائے، اور پھر جو بات کہی جائے گی، سننے والا فوراً ہمہ تن گوش ہو جائے گا۔ بات کی بڑائی اور اہمیت، اپنے سیاق وسباق کے مقابلتاً غیر اہم ہونے کی وجہ سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ اب میں کسی گفتگو کی مثال دوں تو شاید کلام طویل ہو جائے۔ اس لئے ایک دی ہوئی

مثال دہرادوں۔ میں نے کلام الٰہی کا باطنی ربط واضح کرنے کے لئے تسبیح کی مثال دی تھی کہ یوں تو تسبیح کا ہر دانہ دوسرے سے الگ ہے، لیکن اندر ہی اندر، نگاہوں سے اوجھل ایک دھاگہ ہے، ایک رشتہ ہے، جو تمام دانوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہے۔ اس وقت میں اس مثال کو ہی تھوڑا سے آگے بڑھاؤں گا۔ تسبیح کے ان دانوں میں، کچھ یکساں قسم کے دانوں سے گزر کر ایک دانہ ایسا آجاتا ہے جو اپنی جسامت میں، اپنی شکل وصورت میں، اپنے رنگ ڈھنگ میں، دوسرے تمام دانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ عام اصطلاح میں اسے امام کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے محراب بھی کہتے ہیں۔ اب یہ مختلف دانہ امام کہلائے یا محراب کہلائے، اپنی ظاہری حیثیت میں تسبیح کے دانوں میں ایک طرح کی بے ربطی پیدا کر رہا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقتاً بے ربط ہے، نہیں یہ دانہ جان بوجھ کر مختلف بنایا گیا ہے کہ یہاں پہنچ کر تسبیح پڑھنے والا رکے، ٹھہرے، غور کرے کہ اب اسے کیا پڑھنا ہے سورۂ مائدہ میں، احرام اور حج کے مسائل میں، گوشت کے متعلق فقہی نکات کے بیان میں اچانک متوجہ کرتا ہوا، چونکاتا ہوا ایک لفظ ''الیوم'' آجاتا ہے۔ آج کے دن، اس دن۔ شوق تلاوت میں قاری آیات سے گزرتا جارہا تھا۔ جیسے ہی الیوم کا لفظ آیا، اس کا تجسس بیدار ہوا، کیا ہوا آج کے دن؟ قرآن اس دن کے متعلق کیا خبر سنانا چاہتا ہے؟ اور جب قاری کی توجہ پوری طرح گرفت میں آ گئی تو انکشافات شروع ہوگئے۔ آج کے دن کافر مایوس ہوگئے، اب ان کی پرواہ نہ کرنا، صرف اللہ سے ڈرنا، آج کے دن تمہارا دین تمہارے لئے مکمل ہوگیا۔ ہم نے تم پر تمام نعمتیں تمام کردیں، تمہارے اس مکمل اور نعمتوں سے مالا مال دین کو ہم نے قیامت تک کے لئے منتخب کرلیا۔

بدلے ہوئے انداز نے، تبدیل شدہ موضوع نے، چونکا دینے والے لب ولہجہ نے بتایا کہ اب جو بات شروع کی جارہی ہے، ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہ بات تقاضہ کر

۷۸۶

۱۱۰-۹۲

یا صاحب الزماں ادرکنی

DVD Version

لبیک یا حسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری۔

www.ziaraat.com

SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

NOT FOR COMMERCIAL USE